دولت کے پجاری

اقبال کاظمی

4

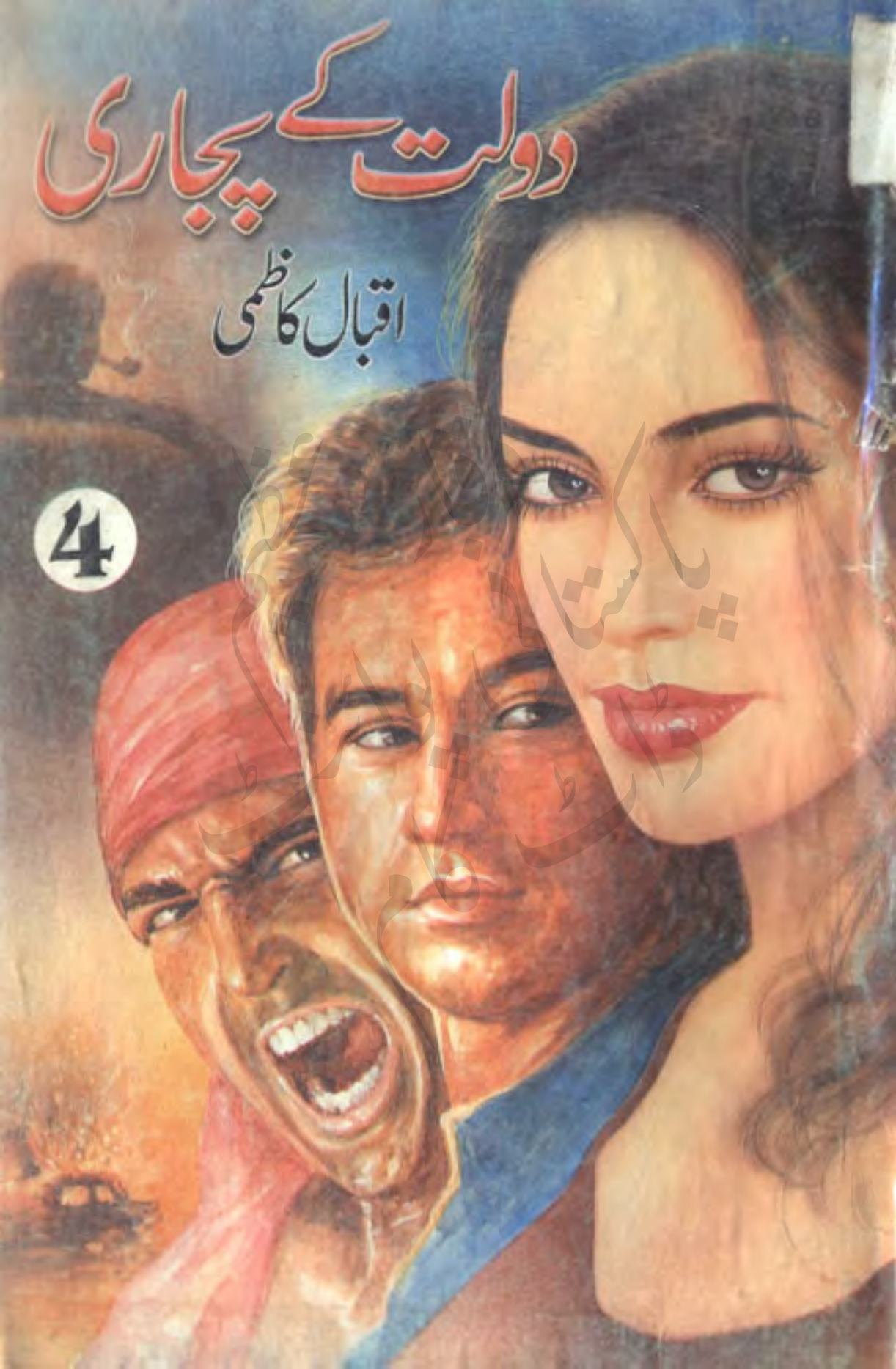

قلعہ گوجر سنگھ میں گوگے پہلوان کا اکھاڑہ بڑا مشہور تھا۔ اس علاقے سے اگرچہ آج تک کوئی قابل ذکر پہلوان نہیں نکلا تھا لیکن اس کا نام بڑی شہرت رکھتا تھا۔ علاقے کے نوجوان اور پہلوانی کے شوقین سورج ڈھلتے ہی اس طرف کا رخ کرنا شروع کر دیتے۔ رات نو دس بجے تک یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔ ہفتے میں ایک دن یہاں باقاعدہ کشتیاں ہوا کرتی تھیں۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے محلے کے معززین کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ اور کشتیاں جیتنے والے نوجوانوں کو چھوٹے موٹے انعامات بھی دیئے جاتے تھے تاکہ پہلوانی کی طرف ان کا رجحان برقرار رہے۔

محلے کے لوگ گوگا پہلوان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ اس نے محلے کے نوجوانوں کو آوارگی سے بچا کر ایک ایسے فن کی طرف لگا رکھا تھا جس کی معاشرے میں بھی عزت تھی۔ گوگا پہلوان کی ان صحت مندانہ سرگرمیوں کی سب ہی تعریف کرتے تھے۔

لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ گوگا پہلوان کا اکھاڑہ اجڑنے لگا۔ بہت سے لوگوں نے یہاں آنا بند کر دیا تھا۔ اور یہ افواہیں پھیلنے لگی تھیں کہ گوگا پہلوان کے اکھاڑے میں نشہ فروخت ہوتا ہے۔ اس اکھاڑے میں آنے والے بہت سے نوجوان نشے کے عادی ہو رہے تھے۔ محلے کے جو معززین گوگا کا احترام کرتے تھے وہ اب اسے ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ گوگا پہلوان ہی نے ہیروئن کا دھندہ شروع کر دیا ہے اور وہ نوجوانوں کی رگوں میں ہیروئن کا زہر گھول رہا ہے۔

علاقے کے پولیس آفیسر جو کبھی گوگا پہلوان کے اکھاڑے میں ہونے والی کشتی کی تقریبات میں مہمان خصوصی ہوا کرتے تھے۔ وہ اب گوگا کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ محلے کے نوجوانوں میں کوئی چھوٹا موٹا لڑائی جھگڑا ہوتا تو گوگا پہلوان سفارشی بن کر تھانے پہنچ جاتا۔ تھانیدار بھی اسے دیکھ کر کرسی سے اٹھ جایا کرتا تھا۔ اس کی بات ہمیشہ مان لی جاتی تھی اور

نوجوانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن اب وہی پولیس والے اس انداز میں اکھاڑے کے چکر لگانے لگے تھے جیسے جرائم پیشہ لوگوں کی نگرانی کی جاتی ہے۔

چھ مہینے کے اندر اندر گوگا پہلوان کا اکھاڑہ اس لحاظ سے ویران ہو گیا کہ کشتی سیکھنے کے شوقین اور زور کرنے والے اب اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس یہاں مشکوک قسم کے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ پولیس والے بھی وقتاً فوقتاً چکر لگانے لگے۔ ہر دس پندرہ روز بعد کوئی نہ کوئی پولیس والا گوگا پہلوان کو تھانے لے جاتا۔ جہاں اسے گھنٹوں برآمدے میں بٹھائے رکھا جاتا۔ اور جب تھانے دار کے سامنے پیش کیا جاتا تو اسے مختلف قسم کی دھمکیاں سننے کو ہی ملتیں۔

گوگا پہلوان کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھرکم کسرتی جسم، موٹی گردن اور سر گنجا، وہ روزانہ باقاعدگی سے سر پر استرا پھروایا کرتا تھا۔ اس کا اکھاڑہ بہت وسیع و عریض رقبے پر مشتمل تھا۔ یہ دراصل ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ جس کے آخر میں تین چار کمرے ایک طرف اور تین چار کمرے دوسری طرف تھے۔ احاطے کے میدان کا بہت بڑا حصہ لان پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ کچھ حصہ پختہ تھا۔ یہ احاطہ کسی زمانے میں کمیونٹی سینٹر ہوا کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہندو چلے گئے تو یہ احاطہ بہت عرصہ تک ویران پڑا رہا۔ اور پھر نجانے کس طرح گوگا کے باپ نے اس احاطے پر قبضہ کر کے یہاں اکھاڑہ بنا لیا۔ گوگا نے بھی پہلوانی اپنے باپ ہی سے سیکھی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اکھاڑہ چلاتا رہا۔ لیکن تقریباً چھ مہینے پہلے اس کی ملاقات ماجھا گجر سے ہو گئی تھی اور ماجھا گجر نے ہی اسے اس تباہ کن راستے پر لگایا تھا۔

گوگا کی آمدنی کا واحد ذریعہ وہ اکھاڑہ ہی تھا۔ وہ کشتی سیکھنے کے لئے یہاں آنے والوں سے پچاس روپے مہینہ فیس لیتا تھا جو بعد میں بڑھا کر سو روپے کر دی گئی تھی۔ پینتیس چالیس شاگردوں سے ملنے والی ساڑھے تین چار ہزار روپے کی رقم اس کے مہینے بھر کے اخراجات کے لئے کم پڑنے لگی تھی۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے اکھاڑے کی فیس سو کے بجائے ڈیڑھ سو کر دی لیکن پانچ چھ لڑکوں نے اکھاڑے میں آنا چھوڑ دیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی دبے لفظوں میں فیس کی زیادتی پر احتجاج کیا۔ گوگا نے فیس دوبارہ سو روپے کر دی کیونکہ اندیشہ تھا کہ فیس زیادہ ہونے کی وجہ سے دوسرے لڑکے بھی اکھاڑہ نہ چھوڑ دیں اور وہ اس آمدنی سے بھی محروم نہ ہو جائے۔

اس دوران اس کی ملاقات ماجھا گجر سے ہو گئی۔ اس نے آمدنی کا ایک ایسا ذریعہ بتایا کہ گوگا پہلوانی بھول کر دولت کے چکر میں پڑ گیا۔ ہیروئن میں واقعی بڑی کمائی تھی۔ گوگا کی ہوس بڑھتی

گئی۔ دولت کے لالچ میں وہ اس دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

گوگا پہلوان کا اکھاڑہ منشیات کا بہترین اڈہ ثابت ہوا۔ گنجان آبادی والا علاقہ تھا۔ اس کے ساتھ میکلوڈ روڈ لگتا تھا۔ متوسط اور گنجان آبادی والے علاقے میں دراصل منشیات فروشی کے لئے آئیڈیل علاقے ثابت ہوتے ہیں۔

گوگا پہلوان پر دولت کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس سے زیادہ مضبوط گرفت ماجھا گجر کی تھی۔ ماجھا گجر کا نسبت روڈ والا اڈہ تباہ ہو گیا تو وہ کسی اور اڈے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن شارق نے اسے کہیں بھی نہیں ٹکنے دیا تھا۔

بالآخر ماجھا گجر کی نظریں گوگا پہلوان پر جم گئیں۔ اس کے خیال میں یہ اڈہ اس کے لئے بہترین مرکز ثابت ہو سکتا تھا۔ آس پاس بھی گنجان آبادی والے علاقے تھے۔ یہاں بیٹھ کر وہ لکشمی چوک اور ریلوے اسٹیشن اور برانڈرتھ روڈ وغیرہ تک کے علاقے کنٹرول کر سکتا تھا۔ اس نے بڑی سوچ بچار اور حالات کا گہری نظروں سے جائزہ لینے کے بعد گوگا پہلوان سے بات کی۔ گوگا پہلوان کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ فوراً ہی تیار ہو گیا۔ ماجھا گجر نے اپنا اڈہ منتقل کرنے سے پہلے یہاں کچھ کام بھی کروایا۔ ایک دو کمروں میں ایسے خفیہ ٹھکانے بنوائے جہاں مال چھپایا جا سکتا تھا۔ دو کمروں میں مصنوعی سیلنگ بھی لگوائی گئی اور دیواروں کے سامنے لکڑی کے تختوں کے پینل بظاہر آرائش اور خوبصورتی کے لئے بنائے گئے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان میں ہیروئن کے پیکٹ چھپانے کی ایسی خفیہ جگہیں بنائی گئی تھیں جنہیں آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان خفیہ ٹھکانوں کا علم ماجھا گجر کے علاوہ صرف گوگا پہلوان کو تھا۔ اس کے کسی اور آدمی کو پتہ نہیں تھا کہ مال کہاں چھپایا جاتا ہے۔ ماجھا گجر نے یہاں کاروبار شروع کرنے سے پہلے علاقے کی پولیس سے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ گوگا پہلوان نے جب یہاں ہیروئن بیچنے کا دھندہ شروع کیا تھا تو اس کے خلاف تھانے میں شکایتیں پہنچنے لگی تھیں۔ اس وقت پولیس والے گوگا پہلوان کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ لیکن ماجھا گجر کے آ جانے سے اسے بھی روز روز کی اس پکڑ دھکڑ سے نجات مل گئی تھی۔ علاقے کے لوگ شکایتیں اب بھی کرتے تھے لیکن پولیس اب ان شکایتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ ماجھا گجر تھانیدار کو اپنے اور اپنے کاروبار کے تحفظ کے لئے معقول رقم دے رہا تھا۔ جب لوگ زیادہ شور مچانے لگتے تو پولیس والے ہیروئن کے عادی کسی شخص کو یا کسی اور کو، جس کا اس دھندے سے معمولی سا بھی تعلق ہوتا، پکڑ کر بند کر دیتے۔

ماجھے گجر کا دھندہ یہاں خوب چل رہا تھا۔ آس پاس کے علاقوں کے ڈیلر وہیں سے مال لیتے تھے۔ صبح سے لے کر شام تک گوگا پہلوان اور ماجھے کے دو آدمی کاروبار چلاتے تھے۔ دن کے

وقت چھوٹے موٹے گاہک ہی آتے تھے البتہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد بڑی پارٹیوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی تھی۔ غروب آفتاب سے لے کر رات تقریباً بارہ بجے تک ماجھا گجر خود یہاں بیٹھتا تھا۔ ماجھے کے دو تین آدمی بھی اب مستقل طور پر یہیں رہ رہے تھے۔

اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ماجھے گجر نے تھوڑا سا مال گوگا پہلوان اور اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا اور وہ خود آج کی ساری آمدنی کپڑے کے ایک میلے سے تھیلے میں سمیٹ کر یہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کا ایک آدمی فیقا گھبرایا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔ فیقا کا اصل نام رفیق تھا۔ وہ میو ہسپتال کے چوک پر پان سگریٹ کے کھوکھے میں ہیروئن فروخت کرتا تھا۔

"غضب ہو گیا استاد!" وہ ماجھے کے سامنے پہنچتے ہی بولا۔

"کیا ہوا! راوی میں ہڑ آ گیا ہے کیا؟" ماجھے نے اسے گھورا۔

"ہڑ نہیں آ گیا استاد! شوکے کو شارق کے بندے اٹھا کر لے گئے ہیں۔" فیقے نے جواب دیا۔

"کیا بکتے ہو؟" ماجھا گجر چیخا۔ "شارق تو سنا ہے کراچی گیا ہوا ہے۔ اس کے بندے شوکے کو کیوں اٹھا کر لے گئے۔"

"شارق واپس آ گیا ہے استاد۔" فیقے نے کہا۔

"تم نے خود دیکھا ہے اسے؟" ماجھے نے پوچھا۔

"نہیں استاد۔" فیقے نے جواب دیا۔ "میں تو اپنے کھوکھے پر بیٹھا ہوا تھا کہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ شوکے کو شارق کے بندے ایک سفید کار میں لے گئے ہیں۔ وہ آدمی میرا گاہک ہے اور شوکے کو بھی جانتا ہے۔ وہ اتفاق سے اس وقت مولوی حمید کے ہوٹل میں چائے پی رہا تھا۔ ایک آدمی بہانے سے اسے کار تک لے گیا تھا اور پھر وہ زبردستی اسے کار میں بٹھا کر لے گئے۔"

"کار میں شارق بھی تھا؟" ماجھے گجر نے پوچھا۔

"اس نے شارق کو نہیں دیکھا تھا لیکن جو آدمی شوکے کو کار تک لے گیا تھا اس کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق وہ نولکھا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔" فیقہ نے کہا۔

"اوہ!" ماجھا گجر چونک گیا۔ "اوئے بھجے.... کوڈو.... میرے ساتھ چلو... فیقے تم بھی گاڑی میں بیٹھو۔"

وہ چاروں احاطے سے باہر آ گئے۔ ماجھے گجر نے گوگا پہلوان کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کا ایک آدمی بھی اکھاڑے میں رہ گیا تھا۔ اس کی گاڑی احاطے کے باہر کھڑی تھی۔ ماجھے نے کار کی ڈکی کھول کر نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا لاپرواہی سے اندر پھینک کر ڈکی بند کر دی اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ فیقا اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کوڈو اور بھجا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان سب کے پاس پستول موجود تھے۔ جو انہوں نے اپنی اپنی قمیض کے نیچے چھپا رکھے تھے۔

ماجھا گجر گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے گلیوں میں سے نکالتا ہوا سڑک پر لے آیا۔ اور پھر گوالمنڈی چوک تک پہنچنے میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ چوک کی رونق اجڑ چکی تھی۔ مولوی حمید کی چائے کی دکان اور پان سگریٹ کا کھوکھا کھلا ہوا تھا لیکن گاہک صرف دو تین ہی تھے۔

ماجھے گجر نے گاڑی مولوی حمید کے ہوٹل کے سامنے سڑک کے دوسری طرف روک لی۔ مولوی حمید جا چکا تھا۔ دونوں ملازم لڑکے تھے۔ ایک لڑکا باہر سے میز کرسیاں اٹھا رہا تھا اور اندر جو لڑکا کھڑا تھا وہ بھی برتن وغیرہ سمیٹ کر صفائی کر رہا تھا۔ یہ مولوی حمید کا پرانا اور قابل اعتماد ملازم تھا۔

"وہ لڑکا جو دکان کے اندر کھڑا ہے نا اسے یہاں لے کر آؤ۔" ماجھے گجر نے فیقے سے کہا اور خود بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

فیقا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور سڑک پار کر کے مولوی حمید کی دکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"اوئے اشرف! چل تجھے استاد بلا رہا ہے۔"

اشرف نے آواز سن کر فیقے کی طرف دیکھا۔ وہ فیقے کو جانتا تھا۔ اس نے سڑک کے دوسری طرف کار کے قریب کھڑے ہوئے ماجھے گجر کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے۔

"مولوی حمید تو گھر چلا گیا ہے۔ فیقا استاد۔" اشرف نے کہا۔

"میں مولوی حمید سے نہیں تم سے بات کر رہا ہوں۔ استاد تمہیں بلا رہا ہے۔ جلدی سے چل، ایسا نہ ہو اسے غصہ آ جائے۔" فیقا نے کہا۔

اشرف نے کام چھوڑ دیا اور قمیض کے دامن سے ہاتھ پونچھتا ہوا دکان سے باہر آ گیا۔ وہ سڑک پار کر کے کار کے قریب پہنچا تو کار کی پچھلی سیٹ پر دو اور آدمیوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے۔

"جی استاد جی؟" اس نے ماجھا گجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مولوی کہاں ہے؟" ماجھے گجر نے پوچھا۔

"وہ تو گھر چلا گیا ہے جی' آدھا گھنٹہ پہلے۔" اشرف نے جواب دیا۔

"شارق آیا تھا یہاں؟" ماجھے گجر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"جی نہیں' شارق باؤ تو کراچی گیا ہوا ہے۔" اشرف نے کہا۔

"نولکھا آیا تھا؟" ماجھا گجر نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ جی۔ میں نے اسے بھی نہیں دیکھا۔" اشرف نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ادھر دیکھ اوئے۔ میری طرف۔" ماجھا گجر نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر ایک جھٹکے سے چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ "تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اگر تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو ایک ہی جھٹکے میں گردن کا منکا توڑ دوں گا۔"

"میں تو نوکر آدمی ہوں استاد جی' آپ بڑوں کے جھگڑوں سے میرا کیا واسطہ۔ میں آپ لوگوں کے جھگڑوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اشرف نے کہا۔

"میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو۔ نولکھا یہاں کس وقت آیا تھا اور اس کے ساتھ اور کون تھا؟ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ یہاں سے میرے ایک بندے کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ سچ سچ بتا دو کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں ورنہ....."

"میں کچھ نہیں جانتا استاد جی۔" اشرف بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

"فیقے؟" ماجھے گجر نے فیقے کی طرف دیکھا۔

ماجھا گجر کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ فیقا دو قدم اٹھا کر اشرف کے قریب آ گیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے اشرف پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ اشرف کے پیٹ' پہلوؤں اور پسلیوں پر گھونسے پڑ رہے تھے۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر کسی نے آگے بڑھ کر اسے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اشرف چیختا ہوا نیچے گر گیا تھا۔ فیقا اس پر ٹھوکریں برساتا رہا۔

مولوی حمید کا دوسرا ملازم لڑکا یہ دیکھ کر چیختا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اشرف سڑک پر لوٹ رہا تھا اور فیقا اس پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ اشرف کے ہونٹوں' ناک اور کانوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم کے دوسرے حصوں پر بھی گہری چوٹیں لگی تھیں اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ اور پھر تڑپتے ہوئے وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

"چلو' چھوڑو اسے' گاڑی میں بیٹھو۔" ماجھا گجر' فیقے کو کہتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اور پھر فیقے کے بیٹھتے ہی ماجھے گجر نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ گاڑی جیسے ہی وہاں سے دور گئی آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سڑک پر پڑے ہوئے اشرف کی طرف دوڑے۔

ماجھا گجر اپنے آدمیوں کے ساتھ صبح چار بجے تک شہر کے مختلف علاقوں میں شارق کے آدمیوں کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ اسے نہ تو کوئی آدمی ملا تھا اور نہ ہی یہ پتہ چل سکا تھا کہ نولکھا شوکے کو کہاں لے کر گیا تھا۔

ماجھا گجر نے اپنے آدمیوں کو گوگا پہلوان کے اکھاڑے کے سامنے اتار دیا اور خود اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ کئی دن سے نہر والی کوٹھی نہیں گیا تھا۔ پچھلے چند روز سے مستقل طور پر گوگا پہلوان کے اکھاڑے پر رہ رہا تھا۔ آج کے لئے اس نے گاؤں جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا لیکن ساری رات ضائع ہو گئی تھی۔

وہ سہ پہر چار بجے تک گاؤں میں رہا۔ دن کا بیشتر حصہ سوتے ہوئے گزرا تھا۔ شہر واپس جانے سے پہلے اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا اپنی بیوی کے حوالے کر دیا تھا۔

"اس رقم کو سنبھال کر رکھنا۔ مجھے کل پرسوں اس کی ضرورت پڑے گی تو لے لوں گا تم سے۔"

وہ تقریباً چھ بجے کے لگ بھگ قلعہ گوجر سنگھ پہنچا تو ایک اور خبر اس کی منتظر تھی۔

"فیقے کو گوالمنڈی تھانے کی پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے استاد۔" کوڈو نے بتایا۔

"پولیس نے کسی نہ کسی کو تو پکڑنا ہی تھا۔" ماجھا گجر نے کہا۔ "اس لڑکے کا کیا ہوا؟ مر گیا یا بچ گیا؟"

"بچ گیا ہے استاد۔" اس مرتبہ پھجے نے جواب دیا۔ "ہمارے وہاں سے نکلنے کے بعد کچھ لوگوں نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ اشرف کو پولیس نے ہسپتال پہنچا دیا مولوی حمید بھی پہنچ گیا تھا۔ اس نے تمہارے اور فیقے کے خلاف پولیس میں باقاعدہ رپورٹ لکھوا دی ہے۔ تین اور آدمیوں نے بھی بیان لکھوائے ہیں۔ ان تینوں آدمیوں نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ پہلے تم نے اشرف کو گلے سے پکڑا تھا پھر فیقے نے اسے مارا پیٹا۔ اشرف ہسپتال میں ہے۔ اس کی حالت تشویش ناک ہے۔ اگر وہ مر گیا تو سیدھا سیدھا قتل کا کیس بن جائے گا۔ گوالمنڈی تھانے کا ایک اے ایس آئی آج دوپہر کو بھی یہاں آیا تھا۔ اس نے تمہیں تھانے آنے کے لئے کہا تھا۔"

"شارق کے کسی آدمی کو تو آس پاس نہیں دیکھا؟" ماجھا گجر نے پوچھا۔

"نہیں' کوئی مشتبہ آدمی نظر تو نہیں آیا۔" پھجے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' تم لوگ یہیں رہو۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔

ذرا ہوشیار ہو کر رہنا۔" ماجھا گجر نے کہا۔

"تھوڑا سا مال دے جاؤ استاد!" پھجے نے کہا۔

"نہیں۔" ماجھے گجر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "آج ذرا احتیاط کرو... کوڈو... تم میرے ساتھ آؤ۔"

ماجھا گجر کوڈو کو لے کر دوبارہ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ گوگا پہلوان کے اکھاڑے سے نکل کر سیدھا سلطان سرائے پہنچا تھا۔ جہاں گلو کا اڈہ تھا۔

"مزنگ والے حوالدار سے ملے تھے؟ راجو کے بارے میں اس نے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ شارق واپس آ گیا ہے۔" ماجھے نے گلو سے پوچھا۔

"اس کی اطلاع مجھے آج صبح ہی مل گئی تھی استاد۔" گلو نے جواب دیا۔ "دو دن سے جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اس کا علم ہے۔ نولکھا' شوکے کو اٹھا کر لے گیا تھا جس کا اب تک کچھ پتہ نہیں چل سکا پھر رات ہی کو تم نے مولوی حمید کے نوکر کی پٹائی کروا دی جس کے نتیجہ میں پولیس نے آج فیقے کو گرفتار کر لیا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی استاد۔ بعض اوقات تو تم بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہو۔"

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟" ماجھے گجر نے اسے گھورا۔

"مولوی حمید کے نوکر کی پٹائی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" گلو نے کہا۔ "وہ اس کی چائے کی دکان کا معمولی سا نوکر ہے۔ بیوہ ماں کا بیٹا ہے۔ وہی اپنی ماں اور تین بہن بھائیوں کا کفیل ہے۔ تم نے اسے بھی اسپتال میں ڈال دیا۔"

"تم اس لڑکے کو نہیں جانتے۔ وہ بھی اس گینگ کا ممبر ہے۔" ماجھے گجر نے کہا۔

"اس کا مولوی حمید کے دوسرے کسی کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ صرف چائے کی دکان کا ملازم ہے۔ میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مگر تم تو جوش انتقام میں اندھے ہو رہے ہو۔ شارق تمہارے ہاتھ نہیں آ رہا اور تم اس چکر میں کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو جن میں ناصر علی جیسے بے گناہ بھی شامل ہیں۔ شہر کے تمام اڈوں پر آج نولکھا کا یہ پیغام پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنے بہنوئی ناصر کے قاتلوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارے گا۔ اور میں نولکھا کو بھی جانتا ہوں۔ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اور پھر تم ہو کہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے چلے جا رہے ہو۔ تم شارق سے خوفزدہ ہو اور اسی خوف نے تمہیں بدحواس کر رکھا ہے۔ تم ہوش سے نہیں جوش سے کام لے رہے ہو۔"

"گلو!" ماجھا گجر نے اسے گھورا۔ "یہ آج تمہاری زبان سے کون بول رہا ہے؟"

"گلو ہی بول رہا ہے ماجھے استاد۔" گلو نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "اب بھی وقت ہے۔ عقل سے کام لو... شارق جیسے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ راجو کے بارے میں جانتے ہو تم؟"

"وہی پوچھنے آیا ہوں۔" ماجھے گجر نے کہا۔ "پولیس اس سے شارق کے بارے میں کچھ پوچھنے میں کامیاب ہوئی یا نہیں! اسے اس لئے پولیس کے حوالے کیا گیا تھا کہ پولیس اپنے ہتھکنڈے استعمال کر کے اس سے شارق کا پتہ معلوم کرے۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ شارق کل ہی راجو کو پولیس سے چھڑا کر لے گیا تھا۔" گلو نے کہا۔

"کیا بکتے ہو؟" ماجھا گجر چیخا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ شارق جیسے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔" گلو نے کہا۔ "شارق کل مزنگ تھانے پہنچ گیا تھا۔ پتہ نہیں کہ اس نے تھانیدار پر کیا جادو کیا کہ جب وہ تھانے سے باہر نکلا تو راجو بھی اس کے ساتھ تھا اور یہ بھی سن لو کہ گاما بھی اس کے ساتھ تھا۔ اب یہ بات ذہن سے نکال دو کہ مزنگ کا تھانیدار گامے کے خلاف کوئی کارروائی کرے گا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" ماجھا گجر دونوں ہاتھ ملنے لگا۔ "ہر کام الٹا ہو رہا ہے۔ اس شارق نے تو میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"پھر وہی جوش!" گلو نے کہا۔ "ویسے میری بات مانو تو شارق سے انتقام کا خیال ذہن سے نکال دو اور خاموشی سے اپنا دھندہ کرتے رہو۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" ماجھے گجر نے اسے گھورا۔ "آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شارق نے تم سے....."

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" گلو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "عرصہ سے میں نے شارق کو نہیں دیکھا۔ یہ سب کچھ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم شارق کا کبھی کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ شارق تم سے زیادہ ذہین ہے۔ وہ دماغ سے کام لیتا ہے۔ تمہاری طرح جوش میں آ کر اپنے ہوش نہیں کھو بیٹھتا۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" ماجھا گجر کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔

"کچھ عرصہ خاموشی سے بیٹھے رہو۔ شارق جو کچھ بھی کرتا ہے کرنے دو۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اسے چھیڑا نہ جائے تو وہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے

گا۔ اور پھر جب موقع ملے تو وار کر دو۔ مگر وار ایسا کاری ہونا چاہئے کہ وہ بچ نہ سکے۔"

"یہ تو بعد کی بات ہے۔" ماجھے گجر نے کہا۔ "اس وقت جو اہم مسئلہ ہے وہ یہ کہ نولکھا بھنوئی ناصر علی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ اس نے زیر زمین دنیا میں یہ خبر پھیلا دیا ہے کہ جو لوگ اس کے بھنوئی کے قتل میں شریک تھے وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا اور ظاہر ہے شارق بھی اس کے ساتھ ہے۔ کل رات وہ شوکے کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے جس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔"

"صورت حال واقعی بہت گمبھیر ہو گئی ہے استاد۔" گلو نے کہا۔ "ویسے میرا مشورہ مانو تو چند روز کے لئے کہیں باہر چلے جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ چند روز میں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس کے بعد تم شارق سے راضی نامہ کرنے کی کوشش کرو..... علاقے بانٹ کر کام کر لو۔"

"میں شارق سے راضی نامہ کر لوں؟" ماجھا گجر نے گھورا۔

"ہاں ماجھے استاد۔" گلو نے کہا۔ "سیانوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کیا جا سکتا۔"

"مگرمچھ!" ماجھے گجر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں..... شارق مگرمچھ بن چکا ہے۔" گلو نے کہا۔ "ایک ایسا مگرمچھ جس سے دشمنی مول لے کر زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ شارق کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کراچی کیوں گیا تھا؟"

"میں نے تو یہی سنا تھا کہ وہ ثمینہ کے ساتھ عیاشی کرنے گیا تھا۔" ماجھا گجر نے جواب دیا۔

"تم بھی نرے گجر ہی ہو۔" گلو نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "عیاشی وہ یہاں بھی کر سکتا تھا۔ کراچی جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔"

"اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" ماجھے گجر نے اسے گھورا۔

"اگر دماغ سے کام لیتے تو شارق کے بارے میں ہر بات تمہارے علم میں ہوتی۔" گلو نے کہا۔ "تمہارے آدمی بھی بس ایسے ہی ہیں جو کوئی ڈھنگ کا مشورہ دینے کے بجائے تمہیں شارق کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر اکساتے رہتے ہیں۔ وہ صرف کھانے پینے کے لئے تمہارے گرد جمع ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ لڑائی بھڑائی سے نہیں ڈرتے لیکن دماغ ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ تمہیں مشکلوں میں پھنسانے والے وہی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک دو بھی تمہیں صحیح مشورہ دینے والے ہوتے تو آج تم اور شارق آرام سے اپنے اپنے اڈوں پر بیٹھے کاروبار کر رہے ہوتے۔ تم دونوں کے جھگڑوں سے سب سے زیادہ فائدہ پولیس ہی کو پہنچ رہا ہے۔ ادھر سے

پولیس کو کھلا رہے ہو ادھر سے وہ کھلا رہا ہے۔ پولیس کو ایک دوسرے کے خلاف اکسا کر تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔"

"بات تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو گلو بادشاہ۔" ماجھے گجر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ سارے زمانے کی عقل تمہاری ہی کھوپڑی میں جمع ہو گئی ہے۔ اب تم ہی مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

"وہی جو میں نے پہلے کہا تھا۔" گلو نے کہا۔ "چند روز کے لئے باہر چلے جاؤ یا خاموشی سے بیٹھے رہو۔"

"اور اگر شارق نے کچھ کیا تو.....؟" ماجھا گجر بولا۔

"تو پھر دیکھا جائے گا۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ شارق کراچی کیوں گیا تھا۔" گجر نے پوچھا۔

"تمہیں بتاؤں گا تو تم اچھل پڑو گے۔" گلو نے کہا۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "وہ حاجی عبداللہ کا مال لے کر گیا تھا۔ صرف کراچی نہیں۔ اس سے بھی آگے۔"

"حاجی عبداللہ کا مال۔" ماجھا گجر واقعی اچھل پڑا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟ حاجی عبداللہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ عقل سے بھی کچھ کام لو۔" گلو نے جواب دیا۔ "حاجی عبداللہ وہ شخص ہے جو ملک بھر میں منشیات کا دھندہ کرنے والوں کے بارے میں جانتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون کتنا دھندہ کرتا ہے اور اس کے ذرائع کیا ہیں۔ اسے ایک قابل اعتماد آدمی کی ضرورت تھی۔ اس نے شارق کا انتخاب کر لیا اور شارق اس کے اعتماد پر بالکل پورا اترا ہے۔ آج صبح ہی حاجی کے ایک آدمی نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا۔ اسی لئے تو میں بار بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اب شارق سے الجھنے کی کوشش مت کرو۔ اس کی پشت پر حاجی عبداللہ جیسا آدمی ہے۔"

"یہ تو تم نے بڑی عجیب بات بتائی۔" ماجھا گجر بولا۔

"ابھی اور بہت سی باتیں سنو گے۔" گلو نے کہا۔ "اب گوالمنڈی تھانے جا کر فیقا کو پولیس سے چھڑاؤ اور چند روز کے لئے آرام سے بیٹھے رہو۔"

ماجھا گجر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔ جب وہ گلو کے اڈے سے رخصت ہوا تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ کوڈو اس کے ساتھ تھا۔ وہاں سے وہ سیدھا گوالمنڈی تھانے پہنچا۔ ایک گھنٹہ اسے تھانیدار کے انتظار میں بیٹھنا پڑا تھا۔ تھانیدار بڑی مشکل سے فیقے کو چھوڑنے پر آمادہ ہوا تھا لیکن اس نے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ اگر ہسپتال میں

اشرف کا انتقال ہو گیا تو وہ نہ صرف فیقے کو بلکہ اسے بھی قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گا تھانیدار کی خدمت میں نذرانہ پیش کرنے کے علاوہ ماجھے گجر نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ کم سے کم دس ہزار روپے کل شام سے پہلے پہلے اشرف کی ماں کو بھجوا دے گا۔

فیقے کی اچھی خاصی دھنائی کی گئی تھی۔ ماجھا گجر نے فیقے کو اس کے گھر پر چھوڑا اور جب وہ گوگا پہلوان کے اکھاڑے پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔

"اوئے بھجے!" اس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر بھجے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھوک لگ رہی ہے یار..... لکشمی چوک سے چرغے لے کر آؤ۔ ذرا جلدی آ جانا.... ایسا نہ ہو آدھی رات کر دو۔"

"بس یوں گیا اور یوں آیا استاد جی۔" بھجے نے کہا اور باہر چلا گیا۔

ماجھا اور گوگا پہلوان وغیرہ کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان کے اکا دکا گاہک آ رہے تھے جنہیں واپس لوٹایا جا رہا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب بھجا چرغے وغیرہ لے آیا۔ ان سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بھی وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ تقریباً ایک بجے کے لگ بھگ ماجھا گجر سونے کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔

ماجھا گجر بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دفعتاً اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے کندھے سے پکڑے جھنجھوڑ رہا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

"استاد! اٹھو جلدی کرو۔ دشمنوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔" بھجے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

ماجھا گجر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نیند کافور ہو گئی تھی لیکن دماغ کی سنسناہٹ بڑھ گئی تھی۔ اس نے پستول اٹھانے کے لئے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ دھڑ سے دراوزہ کھلا اور جو شخص دروازے میں نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر گجر کے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ شارق تھا۔ جس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ ماجھا گجر کے سینے کی طرف تھا۔

○

نولکھا صبح نو بجے سے پہلے ہی اقبال ٹاؤن والی کوٹھی پہنچ گیا تھا۔ وہ سب لوگ ابھی تک سو رہے تھے۔ راجو اور گاما تو ہال کمرے میں قالین پر آڑھے ترچھے پڑے تھے۔ ثمینہ اور شارق اوپر والے کمروں میں تھے۔ لیکن بہرحال کچھ دیر بعد وہ چاروں اٹھ گئے۔

"کچھ کھانے پینے کا بندوبست بھی ہے یا نہیں؟ میں نے تو ابھی چائے بھی نہیں پی۔" نولکھا نے کچن کا کام کرنی والی ملازمہ شاداں کو بلا کر کہا۔

"یہ لوگ تیار ہو جائیں جی۔ میں ابھی ناشتہ بناتی ہوں۔" شاداں نے جواب دیا۔

"یہ لوگ تیار ہوتے رہیں گے پہلے مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔ آنتیں سلگ رہی ہیں۔" نولکھا بولا۔

"ابھی لاتی ہوں جی۔" شاداں کچن کی طرف چلی گئی۔

راجو اور گاما ابھی تک قالین پر پڑے اینٹھ رہے تھے۔ نولکھا نے انہیں زبردستی اٹھا دیا۔

"جاؤ یار.... منہ ہاتھ دو کر تیار ہو جاؤ۔ اس طرح دن چڑھے تک سونا اچھا نہیں ہوتا۔"

تقریباً دس منٹ بعد شاداں' نولکھا کے لئے چائے لے کر آ گئی۔ ثمینہ اور شارق اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ نولکھا ہال کمرے ہی میں ایک صوفے پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ سب لوگ ڈائننگ روم میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

"تمہارے مہمان کا کیا حال ہے؟" شارق نے نولکھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسے انڈر گراؤنڈ کر دیا ہے۔" نولکھا نے ڈبل روٹی کا مکھن لگا ایک سلائس اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"واہ نولکھے واہ!" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "اب تو تم بہت انگریزی بولنے لگے ہو۔"

"تم دونوں کے ساتھ رہنے کا یہ فائدہ تو ہوا کہ بولنے کا کچھ سلیقہ آ گیا ہے۔" نولکھا نے کہتے ہوئے باری باری ثمینہ اور شارق کی طرف دیکھا۔ "اور بھی بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھ رہا ہوں۔"

"یار نولکھے؟" گامے نے کہا۔ "ہمیں بھی کسی اسکول میں داخل کرا دو۔"

"تم جیسے بڈھے طوطے اب کیا پڑھیں گے۔" نولکھے نے کہا۔ "تم مجھ سے پہلے شارق باؤ کے پاس موجود ہو۔ اگر چاہتے تو بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ لیکن تم تو ہو ہی جاہل.... کورے ان پڑھ۔"

"مجھے ان پڑھ اور جاہل مت کہو نولکھے۔" گامے نے اسے گھورا۔ "پوری چھ جماعتیں پڑھا ہوا ہوں۔ حساب کتاب کر لیتا ہوں اور دستخط بھی کر سکتا ہوں۔"

"اچھا ایسا کرو۔" نولکھا نے گامے اور راجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ناشتہ کر کے تم دونوں مزنگ چلے جاؤ.... دو تین مزدوروں کو وہاں سے پکڑ لینا۔ آج احاطے کی صفائی کروا ڈالو... وہاں چاروں طرف راکھ اور جلا ہوا ملبہ بکھرا ہو گا۔ صفائی کروا لو تو ایک دو دن بعد اپنے پرانے اڈے پر بیٹھنا شروع کر دیں۔ کیوں شارق باؤ۔ کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔" شارق نے کہا۔ "ہم مزنگ والے اڈے پر کام شروع کریں گے تو ماجھا گجر بھی سامنے آئے گا۔"

"اس کا پتہ میں نے چلا لیا ہے شارق باؤ۔" نولکھا نے کہا۔ "ایک دو دن صبر کرو۔ پھر دیکھنا میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

دوران ناشتہ وہ ماجھا گجر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر جب گاما اور راجو جانے کے لئے تیار ہوئے تو شارق نے ایک کاغذ پر اس کوٹھی کا ٹیلی فون نمبر لکھ کر گاما کے حوالے کر دیا۔

"یہ نمبر اپنے پاس رکھ لو... کوئی بہت ہی خاص بات ہو تو فون کر دینا۔ آج ڈیرے کی صفائی کرواؤ تو کل تھوڑا سا سامان بھی وہاں پہنچا دیں گے۔ تم دونوں اب مستقل طور پر وہیں رہو گے۔"

"ٹھیک ہے شارق باؤ۔" گامے نے کاغذ کا وہ پرزہ لے کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

"ان دونوں کے جانے کے بعد یہ تینوں اوپر والے کمرے میں آ گئے اور اس مرتبہ ان کی گفتگو کا موضوع حاجی عبداللہ تھا۔

"مزہ نہیں آیا شارق باؤ۔" نولکھا کہہ رہا تھا۔ "حاجی سے معاملہ طے کر لو۔ اتنے خطرناک کام کا معاوضہ تو اس نے کچھ بھی نہیں دیا۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے۔"

"وہ کیا؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"حاجی نے یہ کوٹھی اور گاڑی تمہیں دی ہے نا۔" نولکھا بولا۔ "لیکن تم اس وقت تک ان کے مالک نہیں کہلا سکتے جب تک یہ تمہارے نام نہ ہو جائیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آج ہی حاجی سے ملو اور کہو کہ یہ گاڑی اور کوٹھی تمہارے نام لگا دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ حاجی کی نیت واقعی صاف ہے۔"

"نولکھا ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "حاجی عبداللہ نے تو واقعی ٹرخانے والی بات کی ہے۔ رحمٰن نے کہا تھا کہ چند ماہ میں تم اس کوٹھی کے مالک بن سکتے ہو۔ چند مہینے کیوں؟ تم آج ہی حاجی سے بات کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں آج ہی حاجی سے ملاقات کی کوشش کرتا ہوں۔"

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ گامے اور راجو کو گئے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شاداں کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

"کیا بات ہے شاداں؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گامے کا ٹیلی فون آیا ہے جی شارق باؤ کے لئے۔" شاداں نے کہا۔

"اوہ!" شارق ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ "یقیناً کوئی خاص بات ہو گی جو اس نے جاتے ہی فون کیا ہے۔ تم لوگ بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

شارق نیچے آ گیا۔ ٹیلی فون ہال کمرے میں کونے میں صوفے کے قریب ایک سائیڈ ٹیبل پر تھا۔ اس کا ریسیور الگ رکھا ہوا تھا۔ شارق نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہاں گامے! کیا بات ہے' خیریت؟" اس نے پوچھا۔

"خیریت ہی نہیں ہے شارق باؤ۔" ریسیور پر گامے کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا؟" شارق نے پوچھا۔

"یہاں آتے ہی مجھے ایک آدمی سے پتہ چلا ہے کہ رات ساڑھے بارہ بجے ماجھا گجر اور اس کے آدمیوں نے مولوی حمید کے ملازم لڑکے اشرف کو مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ وہ میو ہسپتال میں ہے۔"

"اوہ! اشرف سے ان کا ٹاکرا کہاں ہو گیا؟" شارق بولا۔

"اشرف ہوٹل بند کر رہا تھا۔ مولوی حمید اس وقت گھر جا چکا تھا۔ ماجھا گجر اور اس کے آدمی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اشرف کو مار مار کر ادھ موا کر دیا اور سڑک پر پھینک کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی اور اشرف کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ سنا ہے اسے فیقا نے مارا ہے۔"

"فیقا وہی تو نہیں جس کا میو ہسپتال کے سامنے پان کا کھوکھا ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"ہاں وہی فیقا۔" گامے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔ میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔" شارق نے کہتے ہوئے ٹیلی فون بند کر دیا اور اوپر آ گیا۔

"کیا ہوا شارق باؤ۔ خیر تو ہے؟ اس نے جاتے ہی ٹیلی فون کیوں کھڑکھڑا دیا؟" نولکھا نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"ماجھا گجر نے مولوی حمید کے ہوٹل کے ملازم لڑکے اشرف کو مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے۔" شارق نے کہا۔

"اوہ! یہ کب کی بات ہے؟" نولکھا چونک گیا۔

"رات ساڑھے بارہ بجے۔" شارق نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "میں مولوی حمید کی طرف جا رہا ہوں' وہاں سے اشرف کو دیکھنے میو ہسپتال جاؤں گا۔"

"چلو' میں بھی چلتا ہوں۔" نولکھا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے اور جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ

سرخ ہو رہا تھا۔ "ماجھا گجر تو واقعی بے غیرت نکلا۔ اس معصوم لڑکے نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ میری ایک بات مان لو شارق باؤ.... اب وقت آ گیا ہے کہ ماجھا گجر کا حساب کتاب برابر کر دیا جائے۔ یہ کچھ زیادہ ہی پھیلتا جا رہا ہے۔"

"کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" شارق نے کہا پھر ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ہو سکتا ہے میں شام تک واپس نہ آؤں۔ تم گھر پر ہی رہو گی۔"

"ظاہر ہے' مجھے اور کہاں جانا ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"چلو نوکھے۔" شارق دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

کچھ ہی دیر بعد سفید ٹویوٹا تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ شارق کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے آج گھر جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اب یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ وہ آج پھر گھر نہیں جا سکے گا۔

گوالمنڈی کے چوک پر اس نے مولوی حمید کے ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی۔ اس وقت دکان میں یا اس کے سامنے فٹ پاتھ پر بنچوں پر زیادہ گاہک نہیں تھے۔ دن کے وقت زیادہ تر باہر دکانوں پر چائے جاتی تھی۔ البتہ شام کو ہوٹل کے سامنے رونق ہوتی تھی۔

مولوی حمید دکان پر ہی تھا اور وہ کپوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ سامنے گاڑی رکنے کی آواز سن کر اس نے اس طرف دیکھا۔ گردن ہلا کر شارق کو اشارہ کیا۔ کپوں میں چائے انڈیل کر اس نے لڑکے کو کاؤنٹر پر کھڑا کیا اور دکان سے نکل کر کار کے قریب آ گیا۔

"کیا قصہ ہے مولوی! اشرف کیسا ہے اب؟" شارق نے پوچھا۔

"اشرف کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ظالموں نے اسے بہت بری طرح پیٹا ہے۔ ایک کان کا پردہ پھٹ گیا ہے۔ ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور اندرونی چوٹیں بہت آئی ہیں بچ تو گیا ہے لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے ٹھیک ہونے میں کئی دن لگیں گے۔" مولوی حمید نے کہا۔

"ماجھے کے ساتھ اور کون کون تھا؟" شارق نے پوچھا۔

"مجھے رات ڈیڑھ بجے باؤ عبدالکریم نے گھر آ کر بتایا تھا۔ وہ ساتھ والی گلی میں رہتا ہے۔" مولوی حمید نے کہا۔ "اس نے بتایا تھا کہ وہ شور اور چیخوں کی آواز سن کر گھر سے باہر آیا تھا۔ اس وقت ماجھا گجر کار کے پاس کھڑا تھا اور فیقا لاتوں اور گھونسوں سے اشرف کو مار رہا تھا۔ کار میں پچھلی سیٹ پر دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن باؤ کریم انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم دیکھ لیں گے۔" نوکھا نے کہا۔ "ان سورماؤں کا تو میں وہ حشر کروں گا کہ لوگ عرصہ تک یاد کرتے رہیں گے۔"

"مولوی! گاڑی میں بیٹھو۔" شارق نے اشارہ کیا۔

"میں لڑکے کو ذرا کام سمجھا دوں۔ ابھی آتا ہوں۔" مولوی حمید کہتے ہوئے دوبارہ دکان میں چلا گیا اور لڑکے کو سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ چند منٹ بعد وہ واپس آ کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "کہاں چلنا ہے؟"

"ہسپتال۔" شارق نے مختصر سا جواب دیا۔

"مجھے فیقے کے کھوکھے کے سامنے اتار دینا شارق باؤ۔ اسے بھی ہسپتال میں اشرف کے سامنے والے بستر پر لٹاؤں گا۔" نوکھا نے کہا۔

گاڑی مختلف گلیوں سے نکل کر میو ہسپتال کی طرف آ گئی۔ فیقے کا کھوکھا بند تھا۔ شارق گاڑی کو ہسپتال کے گیٹ میں لیتا چلا گیا۔ اور پھر ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔ وہ تینوں نیچے اتر آئے۔ مولوی حمید آگے آگے تھا اور وہ دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔

مولوی حمید ایک راہداری میں فرش پر بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کے پاس رک گیا۔ رو رو کر اس عورت کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔

"یہ اشرف کی ماں ہے شارق باؤ۔" مولوی حمید نے کہا۔ "رات سے یہاں بیٹھی ہے رو رو کر برا حال کر لیا ہے اس نے اپنا۔"

اشرف کی ماں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مولوی حمید کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"حوصلہ کریں ماں جی۔ اشرف ٹھیک ہو جائے گا۔" شارق نے اسے تسلی دی۔

ہمدردی کے دو لفظ سن کر بڑی بی کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ تینوں اسے تسلی دیتے رہے۔ پھر وارڈ کی طرف بڑھ گئے۔ انہیں وارڈ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن شارق وارڈ کے انچارج ڈاکٹر سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ دیر تک ڈاکٹر سے اشرف کے بارے میں بات کرتا رہا اور پھر شارق نے کوشش کر کے پرائیویٹ روم کا بندوبست کر لیا اور اشرف کو وارڈ سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اشرف کی ماں بھی کمرے میں آ گئی۔ وہ بیٹے کی حالت دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی۔

"تسلی رکھیں ماں جی! یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" شارق نے ایک بار پھر اشرف کی ماں کو تسلی دی۔

اس دوران انکشاف ہوا کہ اشرف کی ماں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ نوکھا باہر جا کر ہوٹل سے کھانا اور چائے لے آیا۔ شارق نے قریب بیٹھ کر اشرف کی ماں کو کھانا کھلایا۔ چائے پلائی اور ایک بار پھر تسلی دینے لگا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ وہاں سے وہ سیدھے گوالمنڈی تھانے پہنچے۔ خوش قسمتی سے اس وقت تھانیدار موجود تھا۔ وہ مولوی حمید کو بھی جانتا تھا اور شارق بھی اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

"میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ وہ لوگ پکڑے گئے یا نہیں؟" شارق نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تلاش جاری ہے۔ دو تین جگہوں پر چھاپے مارے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کا پتہ نہیں چلا۔ بچ کر جائیں گے کہاں۔" تھانیدار نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولا۔ "ویسے مجھے اطلاع ملی ہے کہ فیقا قلعہ گوجر سنگھ میں کسی جگہ روپوش ہے۔ میرے آدمی تلاش کر رہے ہیں جیسے ہی پتہ چلا اسے پکڑ لیا جائے گا۔"

"قلعہ گوجر سنگھ۔" نولکھا کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ "پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ذرا گوگا پہلوان کے اکھاڑے پر چھاپہ مار کر تو دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ فیقا تمہیں وہاں مل جائے گا۔ اگر وہ قلعہ گجر سنگھ کے علاقے میں روپوش ہے تو گوگا کے اکھاڑے کے علاوہ کہیں اور نہیں ہو سکتا۔"

"دیکھ لیتے ہیں۔" تھانیدار نے سر ہلایا۔

وہ لوگ کچھ دیر اور تھانے میں بیٹھے رہے۔ پھر شارق نے مولوی حمید کو اس کے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا مولوی۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اشرف کے علاج کے سلسلے میں خرچ کی پرواہ مت کرنا اور اس کے گھر والوں کو بھی خرچ کی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔"

"مجھے خود اس بات کا احساس ہے شارق باؤ۔" مولوی حمید نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ نہ تو اشرف کے علاج میں کوئی کسر چھوڑی جائے گی۔ اور نہ ہی اس کے گھر والوں کو خرچ کی تکلیف ہو گی۔"

"میں شام کو چکر لگاؤں گا۔" شارق نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ دونوں دوپہر تک مختلف جگہوں کے چکر لگاتے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے ایک ہوٹل ہی میں کھایا تھا۔ دراصل شارق مختلف اڈوں پر گھوم پھر کر کاروبار کی صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ ماجھا گجر کے قدم ہر جگہ سے اکھڑ رہے تھے۔ اس کے اپنے ایجنٹ اس سے ناراض تھے۔ اس کی وجہ اس کا اپنا نامناسب رویہ تھا۔ اس کی گرم دماغی کی وجہ سے اس کا

اپنا ہی نقصان ہو رہا تھا۔

تین بجے کے قریب وہ کوٹھی واپس پہنچ گئے۔ ثمینہ اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ شارق نے اس کے کمرے کا رخ ہی نہیں کیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

پانچ بجے اسے ثمینہ نے جگایا تھا۔ شارق نے بستر پر لیٹنے سے پہلے جوتے تک نہیں اتارے تھے۔ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک بستر پر لیٹا رہا پھر اٹھ کر جوتے اتارے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

چھ بجے وہ تینوں ہال کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"چائے پینے کے بعد ہم ذرا ہسپتال جائیں گے۔ تم بھی چلنا چاہو تو..." شارق کہتے ہوئے ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں چلوں گی۔" ثمینہ نے کہا۔ "صبح سے گھر میں بیٹھی بور ہو رہی ہوں۔ تھوڑی سی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ ویسے میں گھر جانا چاہتی تھی۔ رضیہ اور اماں سے ملنے کے لئے۔"

"آج کے لئے پروگرام تو میرا بھی تھا۔" شارق نے کہا۔ "لیکن یہ الجھن آن پڑی ہے۔ کل صبح چلیں گے۔"

چائے پینے کے بعد ثمینہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ لباس تبدیل کر کے باہر آ گئی۔ اس نے آدھی آستین والی سفید ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور جینز پہنی تھی۔ شارق نے پہلی مرتبہ پینٹ شرٹ اس کا حلیہ تبدیل کرنے کے لئے پہنائی تھی لیکن ثمینہ کو یہ لباس پسند آیا تھا اور وہ اکثر پینٹ پہننے لگی تھی۔

"تم تو ماڈرن ہوتی جا رہی ہو!" شارق نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"اب تو یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

سات بجے کے لگ بھگ وہ لوگ میو ہسپتال پہنچے تھے۔ اتفاق سے اس وقت مولوی حمید بھی موجود تھا اور اشرف کی بہنیں اور کچھ اور رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے۔ اشرف اس وقت ہوش میں تھا لیکن اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا اور وہ بار بار کراہ رہا تھا۔

یہ لوگ زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ ہسپتال سے نکل کر وہ سیدھے مزنگ پہنچے۔ گاما اور راجو کام کر رہے تھے۔ انہوں نے چار آدمی اور بھی ساتھ لگا رکھے تھے۔ احاطے کی مکمل صفائی کے لئے کم از کم ایک ہفتے کی ضرورت تھی۔ ہر طرف جلے ہوئے تانگے، لکڑیاں اور دیگر سامان بکھرا ہوا تھا۔ ثمینہ اور شارق پورے احاطے میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگے۔ تمام کمروں کے دروازے اور

کھڑکیاں وغیرہ جل چکی تھیں۔ لیکن نہایت حیرت کی بات یہ تھی کہ مزار والے حصے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

وہ لوگ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہے۔ گاما اور راجو کے بھی ہاتھ پیر کالے ہو رہے تھے۔ منہ پر بھی کالک لگی ہوئی تھی۔

"تم لوگ یہاں رہ تو نہیں سکتے۔" شارق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے کہ تم لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔ صبح آ کر پانچ چھ آدمیوں کو کام پر لگا دینا۔ میرا خیال ہے چار پانچ دن لگیں گے۔ یہ کمرے بھی ٹھیک کروانے ہوں گے۔ صبح کسی کارپینٹر کو بلوا کر اسے دروازے اور کھڑکیاں بنانے کو کہہ دینا۔"

"ٹھیک ہے شارق باؤ۔" گامے نے کہا۔ "تم لوگ تھوڑا سا انتظار کر لو۔ ہم اپنے یہ حلیے تو درست کر لیں۔"

گاما نے مزدوروں کو پیسے دے کر رخصت کر دیا اور انہیں صبح پھر آنے کے لئے بھی کہہ دیا۔ وہ دونوں پانی والے حوض پر چلے گئے۔ اور منہ ہاتھ دھونے لگے۔

وہ لوگ احاطے سے نکل کر کار میں بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ دائیں طرف سے گلی کے موڑ پر کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی اور تیز رفتاری سے ان کی طرف آنے لگی۔ موٹر سائیکل پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ شارق اس وقت اپنی کار کی ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ موٹر سائیکل چند گز دور تھی۔ پیچھے سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے ہاتھ باہر کو نکالا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ شارق کو گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت جب اس نے ٹرائیگر دبایا موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ کسی پتھر پر پڑا۔ فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اچھلی۔ گولی شارق کے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔

وہ سب اچھل پڑے تھے۔ موٹر سائیکل بھی اس کے ڈرائیور سے بے قابو ہو گئی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل کو سنبھالنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ موٹر سائیکل کا ہینڈل مڑ گیا۔ ڈرائیور قلابازی کھا کر دور جا گرا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی بری طرح چیخا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ موٹر سائیکل کے نیچے دب گئی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔

اس گلی میں زیادہ تر ورکشاپ تھے۔ بیشتر ورکشاپ ابھی کھلے ہوئے تھے۔ فائر کی آواز سن کر سب ہی لوگ چونک گئے تھے۔ اور جب دونوں موٹر سائیکل سوار گرے تو دو لڑکے انہیں اٹھانے کے لئے ان کی طرف لپکے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ گولی انہی میں سے ایک نے چلائی تھی۔ وہ غالباً یہی سمجھے تھے کہ ان میں سے کسی کو گولی لگی تھی۔

شارق اور نولکھا وغیرہ ایک لمحہ کو سناٹے میں آ گئے۔ لیکن نولکھا اور گاما نے فوراً ہی اپنے حواس بھی سنبھال لئے تھے۔ وہ دونوں موٹر سائیکل کی طرف دوڑے۔ ڈرائیور نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن نولکھا نے چھلانگ لگا دی اور اسے ساتھ لئے ہوئے سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ گاما نے دوسرے آدمی کو چھاپ لیا۔ اس کی ٹانگ موٹر سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ گاما نے اس آدمی پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

گلی میں کچھ لوگ ان کی طرف دوڑے۔ وہ صورت حال کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ اکثر لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ موٹر سائیکل والوں پر گولی چلائی گئی تھی اور گولی چلانے والے وہ لوگ تھے جو اب ان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ لیکن پھر گاما اور نولکھا کو پہچانتے ہی لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

گاما نے موٹر سائیکل کو اٹھا کر دوسری طرف پلٹ دیا۔ اس شخص کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ گاما نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر اس کی دھنائی شروع کر دی۔ نولکھا بھی اپنے شکار کے بخیے ادھیڑ رہا تھا۔

ثمینہ خوفزدہ سی ایک طرف کھڑی تھی۔ شارق آگے بڑھ گیا۔ اس نے سڑک پر پڑا ہوا پستول نالی کی طرف سے اٹھا لیا۔ اور پھر نولکھا اور گاما ان دونوں آدمیوں کو پیٹتے ہوئے احاطے میں لے آئے۔

"اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" شارق نے اس شخص کو گھورتے ہوئے کہا۔ جس نے گولی چلائی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم بچ گئے۔" وہ شخص بولا۔ "لیکن کب تک بچتے رہو گے۔"

"تم نے گولی کس کے کہنے پر چلائی تھی؟" شارق نے پوچھا۔

"ماجھا گجر کے علاوہ اور کون ایسی ہمت کر سکتا ہے کہ تمہیں قتل کرنے کا حکم دے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "ہم بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھے۔ آج گامے اور راجو کو یہاں دیکھا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ تم بھی یہاں ضرور آؤ گے۔ ہم دوپہر سے یہاں تمہارے انتظار میں تھے۔ لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی۔ بچ گئے۔"

اس دوران تین چار پولیس والے وہاں پہنچ گئے۔ شاید کسی نے تھانے میں فائرنگ کی اطلاع کر دی تھی۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج ایک نوجوان اے ایس آئی تھا جو شارق کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"مشتاق صاحب۔" شارق نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے کسی ایک نے مجھے قتل کرنے کے لئے گولی چلائی تھی۔ لیکن قسمت اچھی تھی بچ گیا۔ یہ ہے وہ پستول۔ انہیں تم

لے جاؤ اور جو چارج لگانا چاہو لگا سکتے ہو لیکن میرا نام نہیں آنا چاہئے۔ اور کم از کم آج کی رات ان کے پکڑے جانے کی اطلاع تھانے سے باہر نہیں جانی چاہئے۔"

"یہ کون ہیں؟" اے ایس آئی مشتاق نے پوچھا۔

"ماجھا گجر کے آدمی ہیں۔" شارق نے کہا۔ "لیکن ٹھہرو' اس طرح کچھ الجھن پیدا ہو جائے گی۔ راجو کو ساتھ لے جاؤ اور اس کی طرف سے رپورٹ درج کر لو۔"

"سمجھ گیا شارق صاحب۔" اے ایس آئی مشتاق نے کہا اور اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔

پولیس والے ان دونوں کو تھپڑ اور گھونسے مارتے ہوئے تھانے کی طرف لے گئے۔ راجو بھی ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ شارق نے راجو کو سمجھا دیا تھا کہ تھانے سے فارغ ہو کر وہ کوٹھی آ جائے۔

شارق' ثمینہ' نولکھا اور گاما کے ساتھ اپنی کوٹھی واپس آ گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ راجو بھی پہنچ گیا۔

"تھانیدار نے ان دونوں کو بند کر دیا ہے اور ان کے خلاف پکا پرچہ بھی کاٹ دیا ہے۔" راجو نے بتایا۔

"کیا چارج لگایا ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"قاتلانہ حملہ..... اقدام قتل..... ارادہ قتل اور پتہ نہیں کیا کچھ لکھا ہے اس رپورٹ میں۔" راجو نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" شارق نے کہتے ہوئے نولکھا کی طرف دیکھا۔ "اب کیا پروگرام ہے نولکھے؟"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اب ماجھے گجر کا حساب کتاب کر دینا چاہئے۔ ڈھیل دینے کا ہی یہ نتیجہ نکلا ہے۔" نولکھا نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "اب تو ہمیں یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔"

"ضروری تو نہیں کہ وہ آج رات کو بھی وہیں ہو۔" شارق نے کہا۔

"پتہ کر لیں گے۔" نولکھا نے کہا۔ "پھر گامے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے ویر گامے! یہ کام تو نے ہی کرنا ہے۔ جا کر پتہ کر گاما' گوگا پہلوان کے اڈے پر ہے کہ نہیں۔ خود آگے مت جانا۔ ورنہ وہ تمہیں کچا ہی کھا جائے گا۔ کسی اور کو بھیج کے پتہ کرنا اور پھر ٹیلی فون کر دینا۔ ہم پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔" گاما فوراً اٹھ گیا۔

"کہیں سے ٹیلی فون مت کرنا گامے! خود واپس آ جانا۔ ہمیں کچھ تیاری بھی کرنی ہو گی۔"

شارق نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی۔ میں چلتا ہوں۔"

"چلو میں تمہیں اچھرے موڑ تک چھوڑ دوں۔ وہاں سے ٹیکسی لے لینا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو نولکھا اور حویلی کے دروازے کی چابیاں لے لینا۔" شارق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ تینوں گاڑی پر بیٹھ کر اچھرہ موڑ کی طرف روانہ ہو گئے۔ گاما کو انہوں نے اچھرہ موڑ سے ایک ٹیکسی میں بٹھا دیا اور شارق نے گاڑی کا رخ ملتان روڈ کی طرف موڑ دیا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد وہ حویلی پہنچ گئے۔ نولکھا نے حویلی کا وہ اندرونی کمرہ کھول لیا جہاں اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے چار پستول نکال کر چیک کئے۔ ان میں میگزین فٹ کئے۔ ایک ایک فاضل میگزین لے لیا اور کمرے سے باہر آ کر دروازے کو تالا لگا دیا۔

شارق حویلی کے گیٹ کے باہر ہی گاڑی میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ نولکھا نے حویلی کا ذیلی دروازہ بند کر دیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد شارق کار کو حرکت میں لے آیا۔ نولکھا نے وہ چاروں پستول سیٹ کے نیچے چھپا دیئے تھے۔ اس مرتبہ انہیں واپس کوٹھی میں پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب گاما واپس آ گیا۔

"ہاں بھئی کیا خبر ہے؟" نولکھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ گوگا پہلوان کے ڈیرے پر ہی ہے۔ لیکن ایک اور خبر بھی ہے۔" گاما نے کہا۔

"آج دوپہر کے بعد پولیس نے فیقے کو گوگا پہلوان کے اکھاڑے سے پکڑ لیا تھا۔ اس وقت ماجھا گجر وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن ساڑھے نو بجے کے قریب وہ فیقے کو تھانے سے چھڑا کر لے گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" نولکھا بولا۔ "اس مرتبہ ہم فیقے کا ایسا بندوبست کریں گے کہ ماجھا گجر کا باپ بھی اسے نہیں چھڑا سکے گا۔ بہرحال' یہ بتاؤ کہ گوگا کے اکھاڑے میں کتنے آدمی ہیں؟"

"ماجھا گجر' اس کے تین آدمی اور گوگا پہلوان' اس طرح کل پانچ آدمی بنتے ہیں۔" گامے نے جواب دیا۔

"کیا خیال ہے' شارق باؤ؟" نولکھا نے شارق کی طرف دیکھا۔

"چلو' میں تیار ہوں۔" شارق نے جواب دیا۔

"جانے سے پہلے ایک ایک کپ چائے پی لیں' میں اپنے ہاتھ سے بنا کر لاتا ہوں۔" نولکھا کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔

چائے پینے کے بعد وہ تقریباً ڈھائی بجے کوٹھی سے نکلے۔ ثمینہ اس وقت اپنے کمرے میں رہی تھی۔ شارق نے اسے جگا کر کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

جب وہ میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ شارق نے کار میکلوڈ روڈ سے پھوٹنے والی ایک گلی کے موڑ پر روک دی۔ ان تینوں کے اتر جانے کے بعد شارق نے کار کے تمام شیشے لاک کئے اور نیچے اتر کر دروازہ لاک کر دیا۔ ان سب کی جیبوں میں پستول موجود تھے اور ہر ایک کے پاس ایک ایک فاضل میگزین بھی تھا۔ وہ چاروں باتیں کرتے ہوئے اسی طرح چل رہے تھے جیسے کسی دعوت سے واپس آ رہے ہوں۔

ان گلیوں میں پولیس کے ٹکراؤ کا اندیشہ نہیں تھا۔ پولیس والے بڑی سڑکوں پر ہی گشت کرتے تھے۔ البتہ گلیوں میں پرائیویٹ چوکیدار "جاگدے رہنا" کی آوازیں لگاتے ہوئے گھومتے رہتے تھے۔ یہ چوکیدار بھی خانہ پری کے لئے تھے۔ بعض علاقوں کے چوکیدار تو اس قدر بوڑھے ہو چکے تھے کہ ان سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ لاٹھی وہ چوروں وغیرہ سے مقابلے کے لئے نہیں اپنے سہارے کے لئے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ دوسری گلی میں ان کا سامنا بھی ایک ایسے ہی چوکیدار سے ہو گیا جو منہ سے "جاگدے رہنا" کی مریل سی آواز نکالتا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا آ رہا تھا۔ ان چاروں کو آتے دیکھ کر اس کی آواز کچھ اور بھی کمزور ہو گئی۔

"بابا جی کہاں جانا ہے۔ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہو۔ ہم چھوڑ آئیں تمہیں؟" نولکھا نے بوڑھے چوکیدار کے قریب رک کر کہا۔

"اوئے پتر! جانا کہاں ہے۔ میں تو اس علاقے کا چوکیدار ہوں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔" نولکھا کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بابا چوکیدار ہے۔ یہ تو اپنی راکھی نہیں کر سکتا۔ دوسروں کی راکھی کیا کرے گا۔"

شارق نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ کچھ اور آگے جا کر ایک اور گلی میں مڑ گئے۔ گوگا پہلوان کا اکھاڑہ اسی گلی میں تھا۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہی وہ محتاط ہو گئے تھے۔ چند گز آگے دائیں طرف اکھاڑہ تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔ جس کے سامنے کی دیوار خاصی اونچی تھی۔ احاطے میں آمد و رفت کے لئے ایک ہی پھاٹک تھا۔ قدیم زمانے کا بنا ہوا لکڑی کا یہ پھاٹک بہت بھاری اور بہت مضبوط تھا۔ پہلے کبھی یہ پھاٹک رات کو بند بھی کر دیا جاتا ہو گا لیکن اب تو مستقل طور پر کھلا رہتا تھا کیونکہ اس کے سامنے زمین پر اتنی مٹی جمع ہو چکی تھی کہ اسے کھولنا ممکن نہیں رہا تھا۔

شارق نے پھاٹک کے قریب پہنچ کر ان تینوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں چلتا ہوا

آگے بڑھ گیا۔

احاطے میں اندھیرا تھا۔ تاہم بالکل آخر میں، جہاں کمرے بنے ہوئے تھے، برآمدے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس بلب کی روشنی بھی برآمدے تک ہی محدود تھی۔ شارق کچھ دیر پھاٹک کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے پستول بھی نکال لیا تھا۔

پھاٹک سے چند گز آگے دائیں طرف ایک شیڈ سا بنا ہوا تھا۔ جس کے نیچے کا کچھ حصہ لکڑی کی پارٹیشن لگا کر الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کشتی اور ورزش کے لئے آنے والے کپڑے تبدیل کیا کرتے تھے۔ وہ چاروں شیڈ کے نیچے آ کر رک گئے، اور گہری نظروں سے کمروں کی طرف دیکھنے لگے۔

بائیں طرف والے کمروں کے برآمدے میں چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا، شارق نے گامے کو اشارہ کیا۔ وہ پستول سنبھالے دبے قدموں برآمدے کی طرف چلنے لگا۔ شارق کا اشارہ پا کر راجو اور نولکھا بھی مختلف سمتوں میں بڑھنے لگے تھے۔ شارق کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر وہ بھی شیڈ سے نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف چلنے لگا۔

دفعتاً" ایک ہلکی سی چیخ سن کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا کمروں والی عمارت کی پچھلی طرف غائب ہو گیا تھا۔ وہ شارق کے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

شارق دیوار کے ساتھ ساتھ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ جلد ہی اس چھوٹی سی عمارت کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس طرف ایک دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور کمرے میں بہت ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ شارق دبے قدموں چلتا ہوا اس دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور کان لگا کر اندر سے کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔

"استاد! اٹھو جلدی کرو، دشمنوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

شارق نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر ایک زور دار ٹھوکر سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ دائیں طرف پلنگ تھا جس پر ماجھا گجر بیٹھا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے گہری نیند سے زبردستی جگایا گیا ہے۔ پلنگ کے قریب ہی ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ وہ بھجا تھا۔

دراوزہ دھڑ سے کھلنے کی آواز سن کر ماجھے گجر نے اس طرف دیکھا پھر بڑی تیزی سے تکیے کی

طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ تکیئے کے نیچے رکھا ہوا پستول نکالنا چاہتا تھا لیکن اسی لمحہ ایک غراہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی اور اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہونے والے شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سینے میں اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ شارق تھا!

ماجھا گجر کو بہت عرصہ سے شارق کی تلاش تھی۔ اس کے لئے اس نے شارق کی پارٹی کے کئی آدمیوں کو بھی اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی شارق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے اپنے بعض آدمیوں سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ شارق جہاں بھی نظر آئے اسے گولی مار دی جائے۔

اور اب.... شارق اس کے سامنے کھڑا تھا۔ شارق کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ اس کی طرف تھا۔ شارق کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر ماجھے گجر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ پلنگ کے قریب کھڑے ہوئے پھجے نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر شارق غافل نہیں تھا۔ وہ پستول کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولی مار دوں گا۔"

پجھا بے حس و حرکت ہو گیا اور اس نے کہے بغیر دونوں ہاتھ بھی سر سے اوپر اٹھا دیئے تھے۔ شارق نے آگے بڑھ کر اس کے جسم کو تھپتھپایا اور اس کی قمیض کے نیچے چھپا ہوا پستول نکال کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔

"ڈر کیوں گئے ماجھے؟" شارق ماجھے گجر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں تو میری تلاش تھی نا۔ اسی چکر میں تم کئی بے گناہوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکے ہو اور کل ہی تم نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکے کو مار مار کر ادھ موا کیا ہے' اب میں خود چل کر تمہارے پاس آ گیا ہوں تو تم ڈر کیوں رہے ہو؟ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟"

"دیکھو شارق باؤ!" ماجھے گجر نے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔ ورنہ تمہاری لاش ہی یہاں سے واپس جائے گی۔ میرے آدمی تمہارے ٹوٹے کر دیں گے۔"

"تمہارا ایک آدمی تو یہ کھڑا ہے اور باقی بھی اس وقت میرے آدمیوں کے رحم و کرم پر ہیں۔" شارق نے جواب دیا۔ "اور میرے ساتھ نولکھا بھی ہے۔ نولکھا کو تم جانتے ہو نا؟ تم نے اس کے بہنوئی ناصر علی کو قتل کر کے لاش نہر میں پھینک دی تھی۔ اس وقت نولکھا کو اس کا پتہ نہیں چلا تھا۔ اور پھر وہ میرے ساتھ کراچی چلا گیا تھا۔ اب اسے پتہ چلا ہے۔ وہ تمہارا حساب

کتاب برابر کرنے کے لئے بے چین ہو رہا ہے۔"

"شارق باؤ۔" ماجھا گجر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں آپس کے اختلافات بھلا کر پھر سے دوست بن جائیں۔"

"بالکل ہو سکتا ہے۔" شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ لیکن میں آدمی ہوں اصول کا۔ دوستی کی تجدید سے پہلے پچھلا حساب کتاب برابر ہو جائے تو اچھا ہے نا۔ تاکہ کسی کو کوئی شکایت نہ رہے۔"

"تم جتنی رقم چاہو لے لو شارق باؤ۔ میں تمہارا سارا نقصان پورا کرنے کو تیار ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔" ماجھا گجر نے کہا۔

"سمجھ دار آدمی ہو۔" شارق مسکرایا۔ "لیکن میں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا قائل ہوں۔"

"نہیں پھجے! رک جاؤ!" ماجھا گجر پھجے کی طرف دیکھ کر چیخا۔

شارق تیزی سے گھوما.... وہ بڑی آسانی سے ماجھا گجر کی چال میں آ گیا تھا۔ ماجھے نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شارق پلٹتا ماجھا گجر بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے اچھلا اور کسی پرندے کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا شارق کے اوپر آ گرا۔

شارق لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ اس کی انگلی سے ٹرائیگر دب گیا تھا۔ گولی سامنے والی دیوار میں لگی۔ ماجھا گجر بھی شارق کے اوپر گرا تھا۔ اس نے شارق کی ناک پر زور دار ٹکر ماری۔ شارق کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ناک سے خون بہہ نکلا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

پجھا دیوار کے قریب ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ماجھے کی مدد کرتا اور شارق کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا اس نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔

ماجھا گجر شارق کے سینے پر سوار تھا۔ اس نے شارق کا گریبان پکڑ کر اس کی ناک پر ایک اور ٹکر ماری۔ شارق زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ ماجھے نے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر جما دیئے۔

"تم اپنے آپ کو بہت دلیر اور چالاک سمجھتے ہو۔" ماجھا اس کا نرخرہ دباتے ہوئے غرایا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

شارق کی سانس رک گئی' اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر گلے پر گرفت ڈھیلی نہ ہوئی تو وہ ختم ہو جائے گا۔ اس نے ماجھے کی کلائیوں پر ہاتھ جما کر گرفت

چھڑانے کی کوشش کی مگر ماجھے کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس طرح گلا چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ ا
نے ہتھیلی سے ماجھے کی ناک پر زور سے وار کیا۔ اور پھر وہ رکے بغیر ماجھے کی ناک پر ہتھیلی سے
وار کرتا رہا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اس کے گلے پر ماجھے کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

شارق نے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر دونوں پیر ماجھے کی ٹانگوں میں پھنسائے اور اسے پوری
قوت سے اوپر اٹھا دیا۔ ماجھا اس کے سر کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پیچھے گرا۔ شارق بڑی پھرتی
سے اٹھ گیا اور پھر اس نے ماجھے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ماجھے کے جسم پر ٹھوکریں برسا
رہا۔ ماجھا کمرے میں لوٹ رہا تھا۔ اور پھر دفعتاً" فرش پر پڑا ہوا شارق کا پستول اس کے ہاتھ میں
آگیا۔

"اب اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔" گجر اس پر پستول تان کر
بھیڑیئے کی طرح غرایا۔

شارق رک گیا۔ ماجھا گجر بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے کہا تھا کہ تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گے۔" ماجھا گجر غرایا۔ "اب تمہیں
میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچائے گا۔ تم ختم ہو جاؤ گے اور لاہور کی پوری مارکیٹ پر میرا قبضہ ہو
جائے گا۔ اب کوئی مائی کا لال میرا راستہ نہیں روک سکے گا۔ نہیں شارق باؤ۔ اپنی جگہ سے حرکت
مت کرنا۔"

ماجھا گجر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ پستول کا رخ شارق کے سینے کی طرف تھا اور شارق اپنی
جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ماجھا گجر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر
شیطانی مسکراہٹ تھی۔ وہ دروازے کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے پستول والا ہاتھ آگے کو نکال
لیا۔

دفعتاً" ماجھے کے پیچھے تاریک برآمدے میں ایک ہیولے کو دیکھ کر شارق چونک گیا۔ تاریکی
کے باوجود ڈیل ڈول سے شارق نے اسے پہچان لیا۔ وہ نولکھا تھا۔ شارق نے اپنے چہرے سے کسی
قسم کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

ماجھا گجر کے ہونٹوں پر بڑی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس نے پستول والا ہاتھ ذرا اوپر اٹھایا اور
ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

ماجھا گجر کے پیچھے کھڑے ہوئے نولکھا نے پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر مارا
تھا۔ ماجھے کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا نولکھا نے
اس کے کولہوں پر زور دار لات رسید کر دی۔ ماجھے کے منہ سے ایک اور چیخ نکلی۔ پستول اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ خود بھی لڑکھڑاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

شارق نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر اپنا پستول اٹھایا لیا۔ اور ماجھے کے سر اور پسلیوں پر
ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ماجھا گجر ہر ٹھوکر پر بلبلا اٹھتا۔

"چپ کر جا اوئے ماں دیا کھسماں۔" نولکھا اسے ایک زور دار ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

"میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔" ماجھا گجر چیخا۔

"پہلے اپنی جان تو بچا۔" نولکھا نے اسے ایک اور ٹھوکر ماری۔

اس دوران گاما دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"بجیا بھاگ گیا ہے شارق باؤ۔ اب یہاں سے چلنے کا پروگرام بناؤ۔ وہ پولیس کو لے کر نہ آ
جائے۔" اس نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اطمینان رکھو۔ وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کر سکتا۔" شارق نے کہا اور چند
لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "گوگا پہلوان اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو رسیوں سے باندھ کر
ایک کمرے میں ڈال دو۔ اور اس کے ہاتھ پیر بھی باندھو۔ اسے تو ہم ساتھ لے کر جائیں گے۔"

شارق، ماجھا گجر کو پستول کی زد میں لئے کھڑا رہا۔ گاما اور نولکھا باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد
نولکھا لمبی سی رسی لے آیا اور ماجھے گجر کے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ کچھ دیر بعد گاما بھی آگیا۔

"انہیں باندھ کر ڈال دیا ہے استاد۔" اس نے کہا۔

"گڈ!" شارق مسکرایا۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا چاقو اٹھایا اور اس کی نوک سے ایک
دیورا پر لکڑی کا پینل اکھاڑنے لگا۔

ماجھا گجر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ شارق نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی کارروائی میں
مصروف رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ پینل کے دو تختے اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں سے
ایک تختے کے پیچھے وہ خفیہ خانہ تھا جس میں ہیروئن کے چند پیکٹ چھپائے گئے تھے۔ کئی اور تختوں
کے نیچے بھی اس قسم کے خفیہ خانے موجود تھے۔

"تھوڑی دیر بعد پولیس یہاں آکر یہ تمام دیواریں اور چھت ادھیڑ ڈالے گی۔ تمہارا سارا مال
پولیس کے قبضے میں چلا جائے گا اور تمہارا لاہور کی مارکیٹ پر قبضہ کرنے کا خواب بکھر کر رہ جائے
گا۔" شارق نے گجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر گاما اور نولکھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسے
اٹھا کر لے چلو۔"

"میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں شارق باؤ! یہ سب کچھ لے لو۔ مجھے چھوڑ دو۔ صلح کر
لو۔۔۔" ماجھا گجر نے کہا۔

"تم سے صلح ضرور کریں گے لیکن پہلے پچھلا حساب کتاب۔" شارق مسکرایا۔

نولکھا اور گاما نے ماجھے گجر کو اٹھا لیا اور ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے باہر لے گئے۔ اکھاڑے کے احاطے سے باہر نکلتے ہوئے شارق کی نظر سامنے والے ایک مکان کی اوپر والی منزل کی ایک کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر پھر بڑی آہستگی سے بند ہو گئی۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔

گلیوں میں چلتے ہوئے پھر وہی بوڑھا چوکیدار مل گیا جو "جاگدے رہنا" کی آواز لگاتا ہوا آ رہا تھا۔

"عقل سے کام لو بابا۔" نولکھا نے بوڑھے سے کہا۔ "اگر سارے لوگ جاگتے رہیں تو تمہاری کیا ضرورت ہے۔"

"یہ کون ہے۔ اسے اس طرح باندھ کر کیوں اٹھایا ہوا ہے۔" بوڑھے نے ماجھے گجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بابا یہ ہیروئن بیچتا ہے۔ اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔" نولکھا نے جواب دیا۔

"اسے گندے نالے میں جا کر پھینک دو.... مت ماری گئی ہے ان لوگوں کی۔ جان بوجھ کر زہر پی رہے ہیں۔ اپنے دشمن آپ ہو رہے ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا جی۔ اسے ہسپتال نہیں لے جاتے۔ گندے نالے ہی میں پھینک دیں گے۔" نولکھا نے کہا۔

وہ آگے بڑھ گئے اور بوڑھا "جاگدے رہنا" کی آواز لگاتا ہوا مخالف سمت میں چل پڑا۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر شارق نے سڑک پر ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کار کی ڈکی کھول دی۔ نولکھا اور گاما نے رسیوں سے بندھے ہوئے ماجھے گجر کو ڈکی میں ٹھونس دیا اور ڈھکنا بند کر دیا۔ شارق نے پہلے ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کا لاک کھولا پھر اندر بیٹھ کر دوسرے دروازے کھول دیئے۔ گاما اور راجو پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ نولکھا اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شارق گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔

"میرا خیال ہے ٹھوکر نیاز بیگ والی حویلی چلیں۔ وہیں اس سے کوئی بات کریں گے۔" نولکھا نے کہا۔

"وہیں چل رہے ہیں۔" شارق نے جواب دیا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی نظر آ جاتی۔ کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی چوبرجی والی سڑک پر آ گئی۔ چوبرجی چوک سے ذرا پہلے شارق کو چونک

جانا پڑا۔ ایک پولیس والا سڑک کے وسط میں کھڑا گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ پہلے تو شارق کے ذہن میں خیال آیا کہ سائیڈ دے کر گاڑی کو تیز رفتاری سے نکال لے جائے۔ لیکن پولیس والے کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔ وہ فائرنگ کر سکتا تھا۔ اس نے کار کی رفتار کم کر لی اور قریب پہنچ کر اسے روک لیا۔ اسی لمحہ ایک اور پولیس والا بھی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ شارق نے ادھر ادھر دیکھا۔ صرف وہی دو پولیس والے تھے۔

"آپ لوگ کون ہیں اور اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟" ایک پولیس والے نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ دوسرے پولیس والا رائفل لئے کار کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کسی شہری کے کسی بھی وقت اور کہیں بھی آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔" شارق نے کہا۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔" پولیس والے نے اسے گھورا۔ "انجن بند کر کے نیچے اتر آیئے آپ لوگ۔ ہم گاڑی چیک کریں گے۔"

"کیوں سنتری بادشاہ! قصہ کیا ہے؟" شارق بولا۔

"ریواز گارڈن میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ وہ بہت کچھ لوٹ کے لے گئے ہیں۔ آپ لوگ نیچے اتر آیئے۔" سنتری کے لہجے میں ذرا سختی تھی۔

"ہم تمہیں چور یا ڈاکو نظر آتے ہیں سنتری بادشاہ۔" شارق بولا۔

"آپ لوگ نیچے اتر آئیں۔" سنتری نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

شارق نے کن انکھیوں سے نولکھا کی طرف دیکھا اور پھر انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ نولکھا اور گاما وغیرہ بھی نیچے آ گئے۔ انہوں نے کار کے دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ وہی پولیس والا جو شارق سے باتیں کر رہا تھا' آگے جھک کر کار کی تلاشی لینے لگا۔ نولکھا دوسرے پولیس والے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پولیس والے نے رائفل اوپر کر لی۔

دوسرا پولیس والا کار میں جھکا سیٹوں کے سامنے فٹ میٹ پر ادھر ادھر جھانک رہا تھا کہ پچھلی سیٹ کے پیچھے سے دھب دھب کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا آواز سیٹ کے پیچھے ڈکی کی طرف سے آ رہی تھی۔ پولیس والا ایک دم سیدھا ہو گیا۔

"ڈکی میں کیا ہے؟" اس نے شارق کو گھورا۔ "کھولو اسے!"

"قربانی کا بکرا ہے سنتری بادشاہ۔" نولکھا نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کہا۔ "ڈکی کھولی تو بھاگ جائے گا۔ تم اسے رہنے دو اور اپنا کام کرو۔"

"میں کہتا ہوں ڈکی کھولو۔" پولیس والے نے رائفل تان لی۔

شارق نے کندھے اچکا دیئے۔ لیکن ڈکی تو بہرحال' اسے کھولنا ہی پڑی تھی۔ ڈکی جیسے ہی کھلی ایک آدمی کو بندھے پڑے دیکھ کر پولیس والا اچھل پڑا۔

"یہ... یہ کون ہے۔ باہر نکالو اسے۔" پولیس والا دھاڑا۔

ماجھا گجر ڈکی میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ بول تو نہیں سکتا تھا لیکن گاڑی رکنے کے بعد باتوں کی آواز سن کر اس نے ڈکی میں مچلنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈکی کھلتے ہی اس نے پولیس والے کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ شارق کا اشارہ پا کر گامے اور راجو نے اسے ڈکی سے نکال کر سڑک پر پٹخ دیا۔

"کون ہے یہ اور تم لوگ کون ہو؟" پولیس والے نے لہجے کو بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"قربانی کا بکرا ہے یار۔ پہلے بھی تمہیں بتایا تھا۔" نولکھا نے کہا۔

"عمردین۔" پولیس والے نے اپنے ساتھی کو آواز لگائی۔ "یہ لوگ کوئی وارداتیے لگتے ہیں۔ ہوشیار رہنا۔"

"یہ ہمارا دوست ہے۔ ہیروئن کا نشہ کر رکھا ہے اس لئے ہم نے اسے باندھ کر ڈال رکھا ہے۔" شارق نے کہا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو بائیں والی سڑک پر بہت دور ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس دکھائی دیئے۔ وہ گاڑی اسی طرف آ رہی تھی۔

صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ گاڑی پولیس کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ لوگ پھنس سکتے تھے۔ اس نے نولکھا کی طرف دیکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا اور وہ قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سنتری بادشاہ۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تم تو بلاوجہ ہم پر شک کر رہے ہو۔ ہم تو شریف لوگ ہیں اور....."

اس نے اچانک ہی سنتری بادشاہ کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پنڈلی پر بھی ٹھوکر رسید کر دی تھی۔ دوسری طرف نولکھا بھی ایسی ہی کارروائی کر چکا تھا۔ محتاط ہونے کے باوجود دونوں پولیس والے مار کھا گئے۔ ان کی رائفلیں اب شارق اور نولکھا کے قبضے میں تھیں۔

وہ گاڑی قریب پہنچ رہی تھی۔ پھر دفعتاً" فضا سائرن کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ شارق کا شبہ درست نکلا تھا۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی۔ پولیس والوں نے غالباً اسے دور ہی سے سفید کار اور ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ سائرن بجانے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ وہ چوک پر ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے

کانسٹیبلوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینا چاہتے تھے۔

"گامے' راجو.... جلدی کرو۔ گاڑی میں بیٹھو۔" شارق چیخا۔

نولکھا نے دونوں کانسٹیبلوں کو رائفل کی زد پر لے لیا۔ شارق نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس نے کانسٹیبل کی چھینی ہوئی رائفل پیچھے گامے کے حوالے کر دی تھی۔

نولکھا بھی کار کی طرف دوڑا۔ وہ پوری طرح بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ شارق نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ نولکھا گرتے گرتے بچا تھا۔ شارق نے گاڑی سمن آباد موڑ کی طرف دوڑا دی تھی۔

"اوئے نولکھے۔" راجو بولا۔ "تمہارا قربانی کا بکرا تو وہیں رہ گیا۔"

"رہنے دو کم بخت کو۔ پولیس والوں کے کام آئے گا۔" نولکھے نے جواب دیا۔

نولکھا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑی ایک لمحہ کو چوک پر ان پولیس والوں کے قریب رکی تھی اور پھر تیز رفتاری سے ان کے پیچھے آنے لگی۔ شارق نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

دونوں گاڑیوں میں فاصلہ کافی تھا۔ کوئی بھی گاڑی فائرنگ کی رینج میں نہیں تھی لیکن پولیس کی گاڑی سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گامے نے بھی رائفل کھڑکی سے نکال کر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

سمن آباد موڑ سے شارق نے گاڑی بائیں طرف موڑ دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد پولیس کی گاڑی بھی اس طرف مڑی تھی۔ فائرنگ کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

گامے کی رائفل کا میگزین خالی ہو گیا۔ اس نے رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دی اور نولکھا سے دوسری رائفل لے لی اور دوبارہ فائرنگ کرنے لگا۔ ان کی فائرنگ کا مقصد پولیس والوں کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ وہ تو انہیں اپنے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

شارق نے گاڑی ایک گلی میں موڑ لی اور پھر گلیوں ہی گلیوں میں ہوتا ہوا وہ بہت دور نکل گیا۔ پولیس کی گاڑی کا اب کوئی پتہ نہیں تھا۔ گامے نے دوسری رائفل بھی سڑک پر پھینک دی اور سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد مختلف گلیوں اور سڑکوں پھر گھومنے کے بعد شارق فیروز پور روڈ پر نکل آیا اور اچھرہ موڑ سے اس نے گاڑی علامہ اقبال ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دی۔

کار جب کوٹھی کے سامنے رکی تو صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ شارق نے ہارن بجایا تو کچھ ہی دیر بعد خادم نے دروازہ کھول دیا۔

وہ لوگ ہال کمرے ہی میں ٹھہر گئے۔ شارق بھی اوپر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہیں صوفے پر لیٹ گیا کچھ دیر تک وہ اس نئی صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے رہے اور پھر اونگھتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

○

ثمینہ کے لئے کوئی کام نہیں تھا۔ وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ بوریت حد سے بڑھ گئی تھی۔ وہ چند روز کراچی میں رہی تھی تو آزادی سے گھوم پھر تو سکتی تھی لیکن یہاں تو بالکل ہی قید ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن بالآخر اس نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

وہ لوگ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوئے تو دس بج رہے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد ثمینہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر کے لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس مرتبہ اس نے ڈھنگ کا لباس پہنا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ اس پر خوب جچ رہا تھا۔ تیار ہونے کے بعد اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور وہ چیزیں نکال کر پلاسٹک کے ایک تھیلے میں رکھنے لگی جو اس نے کراچی سے رضیہ کے لئے خریدی تھیں۔ تین چار سوٹ پیس اور کچھ ایسی ہی چیزیں تھیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے زیور کا وہ سیٹ اور سوٹ پیس بھی تھیلے میں رکھ لئے جو مسقط سے روانہ ہوتے وقت ملا بشیر پنجگوری نے اسے تحفے کے طور پر بھجوائے تھے۔ وہ سوٹ کیس بند کر کے تھیلے میں رکھی ہوئی چیزوں کو چیک کر رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز ابھری۔ ظاہر ہے یہ شارق کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

وہ شارق ہی تھا۔ ثمینہ کو کہیں جانے کے لئے تیار دیکھ کر چونک گیا۔

"کہیں جا رہی ہو کیا؟" شارق نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" ثمینہ نے جواب دیا۔ "بیزاری کی حد تک بوریت ہو رہی ہے۔ میں رضیہ کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"رضیہ کے ہاں۔" شارق چونک گیا۔ پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "رضیہ تمہیں بہت یاد آ رہی ہے۔ اکثر تم اس کا ذکر کرتی رہتی ہو۔ حالانکہ کراچی جانے سے پہلے اس سے تمہاری صرف ایک ہی مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔"

"پتہ نہیں کیا بات ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "رضیہ اور ماں جی سے وہ پہلی ہی ملاقات میرے دل میں کچھ عجیب سا احساس جگا گئی ہے۔ میں ایک لمحہ کو بھی انہیں فراموش نہیں کر سکی۔ ان سے ملاقات میں عجیب سی چاہت اور اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میرے اپنے مجھ سے دور ہو چکے ہیں۔ میں رضیہ اور ماں جی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ دو چار دن ان کے

پاس رہوں گی۔"

شارق چند لمحے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھی چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ چند منٹ رک جاؤ۔ میں تیار ہو لوں۔"

شارق ثمینہ کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ثمینہ نے ایک بار پھر سوٹ کیس کھول لیا اور اپنے چند جوڑے نکال کر دوسرے تھیلے میں رکھنے لگی تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آ گئی۔ اس کے چند ہی منٹ بعد شارق بھی آ گیا۔

"گامے! تم چلو ہمارے ساتھ۔" شارق نے گامے کو اشارہ کیا اور پھر نوکھا سے باتیں کرنے لگا۔

چند منٹ بعد ان کی گاڑی کوٹھی سے باہر نکل رہی تھی۔ ثمینہ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور گاما پچھلی سیٹ پر تھا۔ کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی میکلوڈ روڈ پر آ گئی۔ اور بالآخر شارق نے کار لاہور ہوٹل کے سامنے روک لی۔

"تم یہاں اتر جاؤ گامے۔" شارق نے گاما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم کرنا ہے کہ رات کو ہمارے یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا تھا۔ اور ماجھا گجر کہاں ہے۔ میں شام کو گھر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن تم ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی دھر لئے جاؤ۔"

"اطمینان رکھو شارق باؤ۔" گامے نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اب میں کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔"

گامے کے اترنے کے بعد شارق نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ اگر چاہتا تو اچھرے سے دوسری طرف سے ہوتا ہوا گلبرگ نہر کی طرف نکل سکتا تھا مگر گامے کی وجہ سے اسے اتنا طویل چکر کاٹنا پڑا۔ اب وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب سے ہو کر گڑھی شاہو کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا اور پھر گڑھی شاہو کے پل پر سے ہوتا ہوا جی ٹی روڈ پر آ گیا۔ اس کے بعد گھر پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

کال بیل ثمینہ نے بجائی تھی۔ شارق اس وقت کار ہی میں بیٹھا شیشے وغیرہ چڑھا رہا تھا۔ کال بیل کے جواب میں دروازہ شاہد نے کھولا تھا۔ اس نے پہلے عجیب سی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھا جو اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاہد غالباً ثمینہ کو پہچان نہیں سکا تھا لیکن پھر شارق کو کار سے اترتے دیکھ کر وہ ایک دم دروازے سے ہٹ گیا اور ایک کمرے کی طرف رخ کر کے چیخا۔

"ماں جی! شارق بھائی آئے ہیں اور وہ بی بی بھی....." وہ ثمینہ کا نام بھی بھول گیا تھا۔

شارق کے باہر والے دروازے سے اندر داخل ہونے سے پہلے مریم اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ثمینہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

"ماں جی! کیسی ہیں آپ۔"

"جیتی رہو بیٹی۔" مریم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئی کہا۔ "ٹھیک ہوں' کمزوری بہت ہو گئی ہے۔ چلا نہیں جاتا..... شارق کہاں ہے؟"

"وہ آ رہا ہے۔" ثمینہ نے پیچھے مڑ کر کہا پھر شارق کو دیکھ کر بولی۔ "لیجئے..... وہ آ گیا۔"

شارق تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ اس نے مریم کو سلام کیا اور وہ دونوں اسے سہارا دے کر ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

"آپ کیسی ہیں ماں جی؟" شارق نے پوچھا۔ اس نے مریم کو صوفے پر بٹھا دیا اور خود اس کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گیا تھا۔

"کمزوری بہت ہو گئی ہے بیٹا۔" مریم نے جواب دیا۔ "تمہاری فکر نہ ہوتی تو میں اب تک ہٹی کٹی ہو چکی ہوتی۔"

"اب آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے ماں جی۔" ثمینہ نے کہا۔ "رضیہ کہاں ہے؟"

"نگہت کے ساتھ بازار گئی ہے۔ بس آتی ہی ہو گی۔" مریم نے جواب دیا۔

"آج وہ یونیورسٹی نہیں گئی؟" شارق نے پوچھا۔

"ارے بیٹے ان کے وہ ہو رہے ہیں۔ کیا کہتے ہیں..... مجھے تو نام بھی نہیں آتا....." مریم کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"سمسٹر!" ثمینہ نے کہا۔

"ہاں وہی۔" مریم بولی۔ "کہہ رہی تھی دو دن کی چھٹی ہے۔"

"گیپ ہو گا۔" ثمینہ نے کہا اور پھر وہ موضوع بدل کر باتیں کرنے لگے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد رضیہ آ گئی۔ وہ پڑوسن کے ساتھ سودا وغیرہ لینے باغبانپورہ بازار گئی تھی۔ اسے دروازے پر ہی شاہد نے ثمینہ اور شارق کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اور شاید اسی لئے وہ دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ پہلے وہ شارق سے لپٹی پھر ثمینہ سے لپٹ گئی۔ پہلی مرتبہ جب ثمینہ یہاں آئی تھی تو شارق نے اس کا تعارف بزنس پارٹنر کی حیثیت سے کروایا تھا۔ لیکن وہ دونوں اس قدر بے تکلف ہو گئی تھیں کہ ان میں کوئی امتیاز نہیں رہا تھا اور اس وقت بھی وہ اس طرح ملی تھیں جیسے بچھڑی ہوئی پرانی سہیلیاں ملی ہوں۔

"اکیلے اکیلے کراچی گھوم آئیں۔ ہمیں پوچھا تک نہیں تھا۔" رضیہ نے ثمینہ سے شکایتی لہجے میں کہا۔

"ہم ایک بزنس ٹور پر گئے تھے۔ تمہیں ساتھ لے جاتے تو سیر کیا خاک ہوتی۔" ثمینہ نے کہا۔ "تم اپنے امتحان سے فارغ ہو لو تو تمہیں سیر کرانے کے لئے صرف کراچی ہی نہیں دوسری جگہوں پر بھی لے چلوں گی۔"

"وعدہ!" رضیہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"وعدہ۔" ثمینہ نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئی بولی۔ "دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔"

"کیا ہے؟" رضیہ نے تھیلا لے کر اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تھیلا کھول کر دیکھ لو..... اس میں ماں جی کے لئے بھی کچھ ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

رضیہ نے جلدی سے شاپنگ بیگ کھولا اور ایک ایک چیز نکالتی چلی گئی۔ ہر مرتبہ اس کے منہ سے اوہ..... واہ..... نکل جاتا۔ اور جب اس نے زیور والا ڈبہ کھولا تو اس کے منہ سے ایک لمبی او..... کی آواز نکل گئی تھی۔ زیور کا یہ سیٹ دیکھ کر شارق بھی چونک گیا تھا۔ اس نے وہ کپڑے بھی پہچان لئے تھے جو ملا بشیر پنج گوری نے ثمینہ کو دیئے تھے۔ اور ثمینہ یہ سب کچھ رضیہ کے لئے لے آئی تھی۔ ہیروں والا زیور کا وہ سیٹ دو لاکھ روپے سے کم مالیت کا نہیں تھا۔

"کتنا خوبصورت ہے یہ سیٹ۔" رضیہ نیکلس نکال کر اپنے گلے پر لگاتے ہوئے بولی۔ "قیمتی بھی بہت ہے۔"

"دو لاکھ روپے سے کم کا نہیں ہے۔" شارق نے کہا۔ "ہیرے جڑے ہوئے ہیں ہیرے۔"

"دو لاکھ روپے۔" رضیہ کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگے۔ نیکلس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ڈبے میں گر گیا۔

مریم بھی دو لاکھ روپے کا سن کر چونک گئی تھی۔

"ارے بیٹی! اتنی قیمتی چیز لانے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ لا دیا ہوتا۔"

"ایک ہی تو بہن ہے میری ماں جی۔ اسے بھی چھوٹے موٹے تحفے پر ٹرخا دیتی۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کتنی اچھی ہیں ثمینہ باجی۔" رضیہ اس سے لپٹ گئی۔

ثمینہ نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ رضیہ کو سینے سے لپٹا کر اسے عجیب سا سکون ملا تھا۔ شارق گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اسے شاید پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا تھا کہ

اس نے ثمینہ کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اپنی محبت کے نام پر اس نے ثمینہ کو اس کے ماں باپ، بہن بھائیوں سے دور کر دیا تھا۔ رضیہ اور مریم کی صورت میں اسے شاید اپنی ماں اور بہن کی شکلیں نظر آئی تھیں اور وہ ان پر اپنا پیار نچھاور کر رہی تھی۔

شاہد ان کے لئے چائے بنا کر لے آیا تھا۔ ثمینہ نے بیگ میں سے نکالے ہوئے دو سوٹوں کا کپڑا اٹھا کر مریم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ماں جی! یہ دو سوٹ آپ کے لئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ کے لئے کیا لوں۔ بس یہی دو سوٹوں کا کپڑا اٹھا لائی۔"

"میری ایک بات ذہن میں رکھو بیٹا۔" مریم نے کہا۔ "خلوص اور محبت سے جو تحفہ کسی کو دیا جائے وہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ کسی تحفہ کی مالیت کو نہیں دیکھا جاتا۔ دراصل اس کے پیچھے اس جذبے اور خلوص کو دیکھا جاتا ہے جس کے تحت تحفہ کسی کو دیا جاتا ہے۔ اور پھر تم تو اتنا کچھ لے آئی ہو کہ سمجھ میں...."

"ماں جی۔" ثمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں آپ کی بیٹی نہیں؟"

"کیوں نہیں بیٹا۔ میرے لئے جیسی رضیہ ہے ویسی ہی تم ہو۔" مریم نے جواب دیا۔

"فضا کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے پہلے ہمیں چائے پی لینی چاہئے۔ شاید اس طرح یہ بوجھل پن ختم ہو جائے۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور میز پر رکھا ہوا کپ اٹھا لیا۔ اس کے بعد واقعی موضوع بدل گیا تھا۔ رضیہ، ثمینہ سے کراچی کی بارے میں پوچھ رہی تھی۔

چائے ختم ہوئی تو مریم اٹھ گئی۔

"میں دیکھوں ذرا.... شاہد کیا کر رہا ہے۔"

"نہیں ماں جی۔ آپ باورچی خانے میں نہیں جائیں گی۔" ثمینہ نے کہا۔ "آپ آرام کیجئے۔ کچن کا معاملہ ہم خود دیکھ لیں گے۔"

اور پھر اس نے مریم کو کچن میں نہیں جانے دیا۔ رضیہ نے اپنی تمام چیزیں سنبھال کر اپنے کمرے میں رکھ دیں اور وہ دونوں کچن میں آ گئیں اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔ جبکہ شارق مریم کے ساتھ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

رات دس بجے کے قریب شارق واپس چلا گیا۔ ثمینہ یہیں رہ گئی۔ وہ آئی ہی یہاں رہنے کی نیت سے تھی۔ رات کو وہ مریم کے کمرے میں بیٹھی دیر تک باتیں کرتی رہی پھر رضیہ اور وہ شارق والے کمرے میں آ گئیں اور پلنگ پر لیٹی باتیں کرتی رہیں۔

ثمینہ کو یہاں رہتے ہوئے چھ سات روز گزر گئے تھے۔ اس دوران شارق صرف ایک مرتبہ آیا تھا۔ اس گھر میں ثمینہ کا دل لگ گیا تھا۔ مریم کی خدمت کے ساتھ ساتھ اس نے گھر کے کام کاج بھی سنبھال لئے تھے۔ شاہد کے ہونے کے باوجود کچن اس نے سنبھال لیا تھا۔ یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد رضیہ بھی اس کے ساتھ کام میں شامل ہو جاتی اور پھر رات کے کھانے کے بعد ثمینہ اسے پڑھائی میں بھی مدد دیتی۔

ان چند دنوں کے دوران ثمینہ کئی مرتبہ رضیہ کے ساتھ باغبانپورہ بازار بھی گئی تھی۔ بازار جاتے ہوئے وہ برقعہ پہن لیا کرتی تھی۔ تاکہ وہ کسی جاننے والے کی نظروں میں نہ آ جائے۔

مریم، ثمینہ سے بہت خوش تھی۔ وہ جس طرح مریم کی خدمت کر رہی تھی اس سے مریم کو احساس ہونے لگتا تھا جیسے ثمینہ اسی کی بیٹی ہو۔

ثمینہ نے بھی یہاں رہتے ہوئے ایک بات خاص طور سے محسوس کی تھی۔ شارق نے بتایا تھا کہ مریم اور رضیہ سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ جب شارق کے والدین زندہ تھے تو مریم ان کے گھر میں کام کیا کرتی تھی اور جب شارق ایک ناکردہ جرم کی سزا بھگت کر جیل سے باہر آیا تھا تو مریم ہی نے اسے سہارا دیا تھا۔ لیکن یہاں کی صورت حال دیکھ کر ثمینہ بعض اوقات الجھن میں پڑ جاتی۔ وہ سوچنے لگتی کہ شاید شارق نے ان کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا تھا۔ شارق کے حوالے سے مریم کا طرز عمل ایسا تھا جیسے وہ اس کا سگا بیٹا ہو اور رضیہ بھی شارق کو سگے بھائیوں ہی کی طرح چاہتی تھی۔ ان دونوں کو ہر وقت شارق ہی کی فکر رہتی تھی۔

اس روز شام کے وقت ثمینہ، رضیہ کے ساتھ باغبانپورہ بازار گئی تھی۔ بازار میں گھومتے ہوئے اس نے برقعے کا نقاب اٹھا رکھا تھا۔ ایک دکان سے سودا خریدتے ہوئے ثمینہ نے محسوس کیا کہ ایک آدمی اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو وہ آدمی وہاں سے غائب ہو گیا۔ ثمینہ کے خیال میں وہ کوئی اوباش قسم کا آدمی تھا جو انہیں اکیلے دیکھ کر ان کے پیچھے لگا ہو گا۔ ثمینہ کے گھور کر دیکھنے پر وہ آدمی وہاں سے چلا گیا تو ثمینہ نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

اور پھر اسی رات گیارہ بجے کے لگ بھگ کال بیل بجی تو ثمینہ اس وقت کسی کام سے باہر نکلی تھی۔ اس نے سوچا کے شارق کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے کہ شاہد اپنے کمرے سے نکلتا ثمینہ دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے دراوزہ کھول دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

ماجھا گجر دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ وہی آدمی تھا جسے ثمینہ نے بازار میں

دیکھا تھا۔

ثمینہ نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر ماجھا گجر نے جلدی سے آگے بڑھ کر پیر دروازے میں پھ دیا۔

ماجھا گجر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ثمینہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

○

ماجھے گجر کو اپنے سامنے دیکھ کر ثمینہ کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا' اس کا دماغ گھوم گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ سکتی ماجھے گجر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ اس کی طرف اٹھ گیا۔

"اگر تمہارے منہ سے معمولی سی آواز بھی نکلی تو تمہارا یہ خوبصورت چہرہ اس طرح بگاڑ دوں گا کہ تمہارا عاشق شارق بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔" ماجھے گجر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ "ہم نے بڑی مشکل سے تمہیں تلاش کیا ہے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلی چلو۔"

ثمینہ کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ براہ راست ماجھا گجر سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ماجھا گجر کو وہ اچھی طرح جانتی تھی وہ نہایت کمینہ اور گھٹیا کردار کا مالک تھا۔ اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا مریم اپنے کمرے میں تھی اور رضیہ اپنے کمرے میں شاید بھی سارے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو چکا تھا۔ آنگن میں سناٹا تھا۔

ثمینہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے مزاحمت کی تو ماجھا گجر یا تو اسے گولی مار دے گا یا وہ دونوں اسے زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

"ثمینہ بی بی۔" ماجھے گجر کے حلق سے ایک بار پھر غراہٹ نکلی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلدی نکلو یہاں سے۔"

ثمینہ نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اسے ماجھے گجر کے حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی تھی وہ خاموشی سے دروازے سے باہر نکل آئی دروازہ اس نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہی ماجھے گجر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ثمینہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

"اب تو ہاتھ چھڑا لو... تھوڑی دیر بعد سارا پچھلا حساب کتاب لوں گا۔" ماجھے گجر نے کہا۔

ثمینہ کانپ کر رہ گئی اسے وہ وقت یاد آگیا جب وہ ماجھے گجر کی نہر والی کوٹھی سے اس کے

ایک بندے کو قتل کر کے فرار ہوئی تھی' ان دنوں بھی ماجھا گجر اسے بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہا تھا لیکن شارق نے ہمیشہ ماجھے کو بڑا نقصان پہنچایا تھا اور اب وہ اس کے قابو میں آ گئی تھی وہ یقیناً گن گن کر اس سے بدلے لے گا اور شارق کو اس کا پتہ بھی نہیں چل سکے گا اور رضیہ وغیرہ کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ رضیہ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کیسے اور کہاں غائب ہو گئی تھی۔

گلی کے موڑ پر ماجھے گجر کی کار کھڑی تھی کار کے قریب پہنچ کر ماجھے گجر نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صدیقے! تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ رہا ہوں۔"

صدیق اگلا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا ماجھے گجر نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا پہلے ثمینہ کو اندر دھکیلا اور پھر خود بھی اندر بیٹھ گیا صدیقے نے انجن اسٹارٹ کر دیا ثمینہ سیٹ پر سرک کر دوسرے دروازے کے ساتھ لگ گئی تھی صدیقا جیسے ہی کار کو حرکت میں لایا بائیں موڑ سے ایک کار اس طرف گھومی۔

"اب یا کبھی نہیں؟"

ثمینہ کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھرا اس کے ساتھ ہی اس نے آہستگی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر زور دار جھٹکا دیا اور اپنے جسم کے بوجھ سے دروازے کو دھکیلتی ہوئی باہر جا گری۔

ماجھا گجر بری طرح بدحواس ہو گیا اسے توقع نہیں تھی کہ ثمینہ اس قسم کی کوئی حرکت بھی کر سکتی ہے وہ بڑی تیزی سے کھلے ہوئے دروازے کی طرف لپکا اس دوران کار پانچ چھ گز آگے جا چکی تھی اور سڑک پر اس طرف مڑنے والی کار قریب آ گئی تھی اس کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سب کچھ صاف نظر رہا تھا۔

دفعتاً" وہ کار ایک جھٹکے سے رک گئی اس کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی بڑی پھرتی سے نیچے اتر آیا.... وہ شارق تھا اس نے ثمینہ کو دیکھ لیا تھا اور ماجھا گجر کی کار بھی پہچان لی تھی اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

شارق نے جیب سے پستول نکال کر ماجھے گجر کی کار پر فائر کر دیا گولی پچھلے فینڈر پر لگی۔

"صدیقے!" ماجھا گجر چیخا۔ "کار بھگاؤ۔"

صدیقے نے ایک دم ایکسل ریٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا گولی کی آواز سے وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا اس بدحواسی میں اسٹیئرنگ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا کار ایک مکان کی طرف بڑھی

اس سے پہلے کہ کار مکان کی دیوار سے ٹکراتی صدیقے نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اس دوران ماجھے گجر نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر گولی چلا دی تھی لیکن کار لہرا جانے کی وجہ سے اس کی گولی نجانے کس طرف چلی گئی تھی۔

ثمینہ سڑک پر پڑی تھی اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اٹھ کر اپنے مکان والی گلی کی طرف دوڑ لگا دی شارق ماجھے کی کار کے پیچھے دوڑا اس نے ایک اور فائر کر دیا تھا اس مرتبہ گولی کار کی عقبی ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی اور اس سے پہلے کہ شارق دوبارہ ٹرائیگر دباتا ماجھے گجر کی کار دوسری گلی میں مڑ گئی ماجھے گجر نے شارق کو اپنے تعاقب سے باز رکھنے کے لئے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلا دیں۔

شارق رک گیا ماجھے گجر کی کار گلی میں غائب ہو گئی تھی وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر مڑ کر اپنے مکان والی گلی کی طرف دوڑا اور گلی میں مڑتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا ثمینہ پہلے مکان کی دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی تھی اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی کہنی سہلا رہی تھی کار سے چھلانگ لگانے سے اسے کچھ چوٹیں آئی تھیں مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت کار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔

"ثمینہ!" شارق اس کے قریب رک گیا "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں....ہاں....میں ٹھیک ہوں۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"تم گھر چلو.... میں گاڑی کو راستے سے ہٹا لوں۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ دیوار کا سہارا لے کر اپنے گھر کی طرف چلنے لگی اور شارق کار کی طرف دوڑا۔

اس وقت بعض گھروں کے دروازے کھلنے لگے تھے اور کچھ لوگ صورت حال معلوم کرنے کے لئے گھروں سے باہر آ رہے تھے شاہد بھی اپنے مکان سے باہر آ گیا تھا اور دروازے کے اندر رضیہ بھی کھڑی تھی۔

"ثمینہ باجی.... آپ.... آپ...."

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" ثمینہ نے شاہد کی بات کاٹ دی۔

اس لمحہ رضیہ تیزی سے مکان سے باہر آ گئی اس نے آگے بڑھ کر ثمینہ کو پکڑ لیا۔

"کیا ہوا ثمینہ باجی!" کہاں گئی تھیں تم؟"

"کچھ نہیں....اندر چلو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

اس دوران شارق بھی گاڑی گلی میں لے آیا' ثمینہ اور رضیہ اندر جا چکی تھیں شارق جیسے ہی گاڑی سے اترا گلی کے دو تین آدمی اس کے قریب آ گئے۔

"کیا ہوا.... کیا معاملہ تھا فائرنگ کون کر رہے تھے؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ڈاکو تھے.... اتفاق سے میں بروقت اس طرف پہنچ گیا مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گولی چلا دی جواب میں مجھے بھی گولی چلانا پڑی۔ وہ بھاگ گئے۔" شارق کہتے ہوئے اپنے مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"پولیس کو اطلاع دیں' یہ ڈاکو بڑے خطرناک ہوتے ہیں دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔" ایک آدمی نے کہا۔

"میں پولیس کو اطلاع دے کر مزید پریشانیوں میں نہیں الجھنا چاہتا۔" شارق یہ کہتے ہوئے اندر آ گیا۔

ثمینہ' رضیہ اور مریم صحن میں کھڑی تھیں شارق نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اور ان تینوں کو کمرے میں لے آیا۔ مریم اور رضیہ کو ایک کمرے میں چھوڑ کر وہ ثمینہ کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ وہ خبیث یہاں تک کیسے پہنچا؟" شارق نے پوچھا۔

"رضیہ کے ساتھ سودا لینے بازار گئی تھی۔" ثمینہ نے کہا۔ "ایک دکان پر سودا لیتے ہوئے میں نے برقعے کا نقاب چہرے سے ہٹا دیا تھا۔ ایک آدمی نے اس وقت بہت غور سے میری طرف دیکھا تھا میں سمجھی کوئی شہدا لفنگا ہے میں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا لیکن اس نے شاید ہمارا پیچھا کر کے گھر دیکھ لیا تھا۔" ثمینہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "کچھ دیر پہلے دروازے کی بیل بجی میں اس وقت کسی کام سے صحن میں نکلی تھی میں سمجھی کہ تم ہو گے میں نے دروازہ کھولا تو ماجھا گجر اور وہی آدمی دروازے میں کھڑا تھا جس نے آج دن میں مجھے بازار میں دیکھا تھا اس کا نام صدیق ہے وہ مجھے پستول کی زد پر اپنی کار میں لے آئے.... کار کی پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ ماجھا گجر تھا کار ابھی حرکت میں آئی ہی تھی کہ اسی لمحہ تمہاری کار گلی میں مڑی اور اسی وقت میں نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اگر تم نہ آتے تب بھی میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ راستے ہی میں اسے چکمہ دے کر بھاگنے کی کوشش کروں گی۔"

"یہ بہت برا ہوا۔" شارق اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ "گھر کا پتہ چلا لینا ہمارے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات ہے۔ اسے یہ پتہ چل گیا ہے کہ تم بھی یہاں ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم پولیس کو مطلوب ہو۔ وہ اگرچہ خود دوبارہ یہاں آنے کی ہمت نہیں کرے گا لیکن وہ پولیس کو تمہاری یہاں موجودگی کی اطلاع دے سکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد ہمیں نقصان پہنچانا ہے اور اس کے لئے وہ کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتا ہے ہمیں فوراً یہ مکان چھوڑ دینا چاہئے

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر!"

"تو کیا اماں اور رضیہ کو یہیں چھوڑ دیا جائے گا؟" ثمینہ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں وہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔" شارق نے کہا "تم رضیہ سے کہو کہ اپنی انتہائی ضروری چیزیں سمیٹ لے میں ماں جی سے بات کرتا ہوں وہ مشکل سے آمادہ ہوں گی لیکن انہیں یہاں چھوڑا نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے تم رضیہ کو یہاں بھیج دو۔" ثمینہ نے کہا۔

شارق کمرے سے نکل گیا چند سیکنڈ بعد رضیہ اندر آ گئی۔

"کیا بات ہے ثمینہ باجی۔" رضیہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "شارق بھائی بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔"

"بات ہی پریشانی کی ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "تم اپنے زیور نقدی کپڑے' کتابیں اور ضروری چیزیں سمیٹ لو ہم یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" رضیہ نے اسے گھورا۔

"مطلب وہی ہے جو میں نے کہا ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلدی کرو۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" رضیہ بولی۔

"ایک اور جگہ ہے جو اس سے زیادہ محفوظ ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "چند روز بعد حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ہم دوبارہ یہیں آ جائیں گے۔"

رضیہ چند لمحے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر الماری کے اوپر رکھا ہوا خالی سوٹ کیس اتار لیا اور الماری میں سے کپڑے دیگر قیمتی چیزیں وغیرہ سمیٹ کر اس میں بھرنے لگی۔ چند منٹ بعد شارق بھی آ گیا' اس نے بھی مریم کے کپڑے اور ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں ڈال دی تھیں۔

"چلو..... جلدی کرو۔" وہ رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

ثمینہ نے اپنے کپڑے بھی رضیہ کے سوٹ کیس میں ڈال دیئے تھی۔

شارق نے شاہد کو بلا کر ہدایت کی کہ گھر کے تمام دروازے بند کر دے اور چابیاں اپنے پاس ہی رکھے۔

"تمہاری گاڑی ٹھیک ہے؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے رضیہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"تو پھر باہر نکلو.... جلدی کرو۔" شارق نے کہا۔

وہ کمرے سے باہر آ گئے مریم برآمدے میں کھڑی تھی وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی شارق انہیں لے کر باہر نکل گیا اور شاہد کمرے بند کرنے لگا۔

شارق اور مریم سفید کار میں بیٹھے تھے ثمینہ اور شاہد' رضیہ کی کار میں آ گئے دونوں کاریں اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آ گئیں۔ شارق کی کار آگے تھی اور رضیہ والی کار اس کے پیچھے۔

شملہ پہاڑی کے قریب پہنچ کر شارق نے کار روک لی۔ رضیہ نے بھی اس کے پیچھے ہی کار روک لی شارق اپنی کار سے اتر کر ان کی کار کے قریب آ گیا۔

"شاہد! تم سہیل کے پاس چلے جاؤ اس سے کہنا میں ایک دو دن میں اس سے رابطہ کروں گا۔" شارق نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "لو یہ پیسے رکھ لو۔ یہاں سے رکشے پر بیٹھ جانا۔"

شاہد پیسے لے کر کار میں سے اتر گیا۔

"رضیہ! تم اپنی گاڑی کو میرے پیچھے ہی رکھنا ویسے ثمینہ تمہیں راستہ بتاتی رہے گی۔ ٹھیک ہے ثمینہ! اقبال ٹاؤن والی کوٹھی۔"

"ٹھیک ہے تم چلو۔ ہم تمہارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

دونوں کاریں ایک بار پھر آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

تقریباً پینتیس منٹ بعد وہ اقبال ٹاؤن والی کوٹھی پہنچ گئے نولکھا اکیلا ہی تھا گاما اور راجو مزنگ والے اڈے پر چلے گئے تھے رضیہ اور مریم کے سوٹ کیس اوپر والے کمروں میں پہنچا دیئے گئے۔ وہ دونوں اس وقت ثمینہ والے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ شارق اس وقت نیچے نولکھے کے پاس تھا۔ ثمینہ نے شاداں سے چائے کے لئے کہا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔

"بات کیا ہے ثمینہ بیٹی۔" مریم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس گھر سے چوروں کی طرح کیوں بھاگے ہیں؟"

"ماں جی آپ تو مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ شارق کے کچھ پرانے دشمن ایک بار پھر سامنے آ گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی یہ تو اتفاق تھا کہ شارق وقت پر پہنچ گیا تھا۔ آپ نے فائرنگ کی آواز سنی ہو گی شارق کو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ حملہ کر کے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں اس لئے وہ سب کو یہاں لے آیا ہے۔"

"یہ کوٹھی کس کی ہے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"تمہارے بھیا ہی کی ہے۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا...؟" رضیہ اچھل پڑی۔ "مم..... مگر شارق بھائی نے پہلے تو کبھی اس کوٹھی کا ذکر نہیں کیا۔"

"خیال نہیں رہا ہو گا ویسے اس کوٹھی میں آئے ہوئے چند ہی روز گزرے ہیں۔"

مریم خاموش بیٹھی تھی۔ اس صورت حال سے اسے ذہنی طور پر اس قدر شدید دھچکا پہنچا تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں تو صرف ایک بات تھی کہ شارق کے پرانے دشمن اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شارق کے پرانے دشمنوں میں منشیات کے اسمگلر تھے اور پولیس والے بھی تھے لیکن شارق نے تو کبھی ان کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ دشمنوں نے شارق کا پیچھا چھوڑ دیا تھا اور شارق باعزت طریقے سے کوئی کاروبار کر رہا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ شارق کا کاروبار کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شاداں چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ایک ایک کپ ان تینوں کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

"شارق کو چائے دی؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"جی بی بی جی.... شارق صاحب اور نولکھا کو بھی چائے دے دی ہے۔" شاداں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" ثمینہ نے کہا۔

شاداں چلی گئی ثمینہ ان کے ساتھ بیٹھی چائے پیتی رہی پھر تینوں خالی کپ لے کر نیچے آ گئی۔ اس نے خالی کپ شاداں کے حوالے کئے اور نولکھے کے کمرے میں آ گئی جہاں شارق بھی موجود تھا۔

"آؤ ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔"

"مثلاً کیا؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ تم نے بڑی ہمت سے کام لیا جو چلتی کار سے چھلانگ لگا دی۔" نولکھا نے کہا۔ "ویسے ماجھا گجر تو بڑا ہی بے غیرت نکلا اس نے تو گجروں کا نام ہی ڈبو دیا۔"

"ارے ہم لاکھ برے سہی مگر کسی کی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ لڑائی تو مردوں میں ہوتی ہے عورتوں کو بیچ میں لانے کا کیا مطلب؟"

"اب اس نے عورتوں کو گھسیٹ ہی لیا ہے تو اسے بتا دیا جائے گا کہ عورتیں کمزور نہیں ہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟" نولکھا نے اسے گھورا۔

"اب تک میں ڈرتی رہی تھی لیکن پچھلے واقعات نے اور خاص طور پر آج کے واقعہ نے میرا سارا ڈر خوف نکال دیا ہے اب میں خود ماجھے گجر سے نمٹوں گی۔ اسے بتاؤں گی کہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"نہیں ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے کہا۔ "ابھی ہم زندہ ہیں ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے آج اس نے جو حرکت کی ہے اس کا نتیجہ تو اسے میں دکھاؤں گا۔ اس بزدل کو اگر کہیں ٹکنے دیا تو میرا نام بدل دینا۔"

"جو آدمی گجر کے ساتھ تھا اس کا کیا نام بتایا تھا تم نے۔" اس مرتبہ شارق نے پوچھا۔

"صدیقا!" ثمینہ نے جواب دیا۔ "لیکن اب تم اس معاملے میں دخل نہیں دو گے۔ ماجھے گجر نے میری بے عزتی کی ہے اس کا مزہ بھی اسے میں ہی چکھاؤں گی۔ کل ہی میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔"

"ایک بات سوچ لو۔" شارق نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم پہلے ہی اس کا ایک بندہ مار چکی ہو اگر تم اس کے ہاتھ لگ گئیں تو وہ تمہیں خونی بھیڑیئے کی طرح چیر پھاڑ ڈالے گا۔"

"سوچنے کا وقت تو اب گزر چکا ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "اور تم بھی میری ایک بات نوٹ کر لو... اب ماجھا گجر مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔"

"میرا خیال ہے ماجھا گجر بھی اب آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔" شارق بولا۔

"میں کل ہی اسے تلاش کر لوں گی دیکھ لینا۔" ثمینہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ماجھے گجر کو تم اچھی طرح سمجھ چکی ہو' وہ نہایت کمینہ اور گھٹیا ذہنیت کا ملک ہے۔ ایسے کمینے دشمن سے نمٹنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔" ثمینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس جیسے کمینے لوگوں سے نمٹنا سیکھ لیا ہے۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ گئی۔ "اب میں سونے کے لئے جا رہی ہوں نیند آ رہی ہے۔"

ثمینہ جب اپنے کمرے میں پہنچی تو مریم اور رضیہ اس کے پلنگ پر سو رہی تھیں اس نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور دوسرے کمرے میں آ گئی۔ یہ کمرہ پہلے شارق کے استعمال میں تھا۔ مریم اور رضیہ کے سوٹ کیس اسی کمرے میں رکھوائے گئے تھے۔ دونوں سوٹ کیس اب بھی

پلنگ پر پڑے ہوئے تھے ثمینہ نے دونوں سوٹ کیس اٹھا کر نیچے رکھ دیئے اور پلنگ پر لیٹ گئی کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اپنے ساتھ کسی کو لیٹے پا کر بری طرح گڑبڑا گئی۔ اس کے ساتھ پلنگ پر جو کوئی بھی تھا اس کا ایک ہاتھ ثمینہ کے سینے پر تھا ثمینہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا' وہ رضیہ تھی جو کس وقت اپنے کمرے سے آ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی تھی ثمینہ کے اس طرح گڑبڑا کر اٹھنے سے رضیہ بھی جاگ گئی۔

"اوہ!" رضیہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کو جگانے آئی تھی اور خود بھی یہاں لیٹ کر سو گئی۔"

"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تم بھی رات کو دیر تک جاگتی رہی تھیں۔" ثمینہ نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دس بج رہے ہیں اب واقعی اٹھ ہی جانا چاہئے۔"

"دس!" رضیہ اچھل پڑی۔ "میں آٹھ بجے آئی تھی آپ کو جگانے کے لئے' ماں جی کمرے میں بیٹھی غصے سے کھول رہی ہوں گی ابھی ناشتہ نہیں کیا۔"

"تو پھر جلدی سے اٹھ جاؤ۔" ثمینہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی جب وہ باتھ روم سے نکلی تو رضیہ وہاں نہیں تھی ثمینہ تیار ہو کر رضیہ والے کمرے میں آ گئی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بالوں میں کنگھا کر رہی تھی مریم کمرے میں نہیں تھی۔

"کہاں ہیں ماں جی؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"وہ گھوم پھر کر کوٹھی دیکھ رہی ہیں۔" رضیہ نے بتایا۔

"ابھی تک ناشتہ نہیں کیا انہیں واقعی غصہ آ رہا ہو گا۔" ثمینہ بولی۔

"اب پریشانی کی ضرورت نہیں شاداں نے انہیں ناشتہ کروا دیا تھا۔" رضیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "شارق بھائی اور وہ دوسرا آدمی' کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا؟"

"نولکھا۔" ثمینہ بولی۔

"ہاں.... وہ دونوں ابھی تک سو رہے ہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

وہ دونوں ابھی باتیں کر رہی تھیں کہ شاداں کمرے میں داخل ہوئی۔

"ثمینہ بی بی..... آپ لوگ ناشتہ کر لیں ساڑھے دس بج رہے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم ناشتہ تیار کرو ہم نیچے ہی آ رہے ہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ دونوں ڈائننگ روم میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں اسی دوران مریم بھی آ گئی اور ثمینہ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ثمینہ بیٹی۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "شارق نے یہ کوٹھی کب خریدی تھی؟"

"یہ کوٹھی دراصل شارق کے ایک دوست کی ہے ماں جی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "ابھی خریداری کی بات مکمل نہیں ہوئی دوست نے کوٹھی شارق کے حوالے کر دی ہے کہ سودا بھی ہو جائے گا فکر کی بات نہیں ہے شارق نے آپ لوگوں کو اس لئے نہیں بتایا کہ وہ سودا مکمل ہو جانے کے بعد آپ کو بتا کر سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن رات کو جو کچھ بھی ہوا اس کی وجہ سے آپ کو یہاں لانا پڑا۔"

"ہم جس طرح وہاں سے بھاگے ہیں وہ میرے لئے بہت ہی تکلیف دہ ہے۔" مریم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس محلے کے لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ کتنے اچھے تعلقات تھے ان لوگوں سے اس طرح چوروں کی طرح وہاں سے بھاگنا...."

"کوئی بھی کچھ نہیں سوچ رہا ہو گا ماں جی۔" ثمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سب ہی لوگوں کو رات ہی میں پتہ چل گیا تھا کہ وہ ڈاکو تھے جنہوں نے مجھے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی ڈاکو اگرچہ بھاگ گئے تھے لیکن ایسی صورت میں وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا ظاہر ہے اپنی جان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے ہم بھی اپنی جان بچانے کے لئے اس طرح وہاں سے نکلے ہیں بس چند روز کی بات ہے آپ لوگ دوبارہ وہاں جائیں گی تو کسی کے دل میں اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے تو وہ دور ہو جائے گی۔"

"اور میرا یونیورسٹی کا کیا بنے گا؟" رضیہ نے پوچھا۔

"آج تو تم غوطہ لگا گئیں لیکن کل تم یونیورسٹی جاؤ گی۔" ثمینہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "گاڑی تمہارے پاس موجود ہے خادم تمہارے ساتھ رہے گا۔"

"خادم کون؟" رضیہ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کوٹھی کا ملازم ہے تم نے شاید ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"وہ کیوں میرے ساتھ جائے گا؟" رضیہ بولی۔

"اول تو تمہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "لیکن احتیاطاً خادم تمہارے ساتھ رہے گا خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہوئی تو خادم ایک بہت اچھا گن مین ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ میں گن مین کے ساتھ یونیورسٹی آیا جایا کروں گی۔" رضیہ نے کہا۔

"کسی کو کیا پتہ کہ وہ گن مین ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "وہ ڈرائیور کی حیثیت سے تمہارے ساتھ رہے گا۔"

رضیہ کوئی جواب دینے کے بجائے ماں کی طرف دیکھنے لگی وہ خاموش بیٹھی تھی اس کے چہرے پر پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد شارق اور نولکھا بھی اٹھ گئے۔ مریم اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی اور ثمینہ' رضیہ کو کوٹھی دکھانے لگی۔ پوری کوٹھی دیکھ کر رضیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اتنی شاندار کوٹھی۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "دل چاہتا ہے کہ ساری زندگی یہیں رہ جاؤں۔"

"رہ جاؤ۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور وہ مکان؟" رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

رضیہ نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ثمینہ نے کپڑے بدل لئے۔ اس نے پھر پینٹ شرٹ پہنی تھی پیروں میں جوگرز سر پر ٹوپی اور آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ' اس نے شارق کا پستول بھی چیک کر کے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" نولکھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شیرنی پہلی مرتبہ اپنے شکار کی تلاش میں جا رہی ہے۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" نولکھا ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

"تم صدیقے کو جانتے ہو؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"نہیں میں نے یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہے۔" نولکھا نے جواب دیا۔

"تو پھر تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں مزنگ سے گامے کو ساتھ لے لوں گی وہ صدیقے کو ضرور جانتا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ مگر ذرا محتاط رہنا۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ نے میز پر سے سفید ٹویوٹا کی چابی اٹھائی اور منک منک کر چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ کمپاؤنڈ میں کھڑی ہوئی گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں رضیہ باہر والی بالکونی میں کھڑی تھی ثمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی کو گیٹ سے نکال لے گئی خادم نے گیٹ بند کر دیا۔

ثمینہ کو مزنگ والے اڈے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے پھاٹک کے سامنے گاڑی روک لی اور اتر کر پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ گلی کی ورکشاپوں میں کام کرنے والے لوگ

عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گاما سائبان کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ احاطے کی صفائی ہو چکی تھی تھوڑا بہت کام رہ گیا تھا۔ گامے نے دو مزدور لگا رکھے تھے راجو بھی مزدوروں کے ساتھ کام میں لگا ہوا تھا۔ ثمینہ کو دیکھ کر گاما ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"خیریت ثمینہ بی بی؟" اس نے ثمینہ کے قریب آتے ہی پوچھا۔

"صدیقے کو جانتے ہو؟" ثمینہ نے سوال کیا۔

"صدیقا! وہ باغبانپورے والا۔" گامے نے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ باغبانپورہ ہی کا رہنے والا ہے مانجھے گجر کا ساتھی ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"گنجا اور قدرے چھوٹے قد کا بھاری بھرکم آدمی ہے۔" گاما بولا۔

"ہاں وہی۔" ثمینہ نے کہا۔

"وہ باغبانپورہ ہی میں ہے گھاس منڈی کے آس پاس گھوم پھر کر کام کرتا ہے۔"

"اس وقت کہاں ملے گا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"وہیں ہونا چاہئے۔" گامے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میرے ساتھ چلو۔" ثمینہ نے کہا۔

گامے نے راجو کو کام کے بارے میں بتا دیا اور ثمینہ کے ساتھ احاطے سے باہر آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ ثمینہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا اور کار ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھا دی۔

ثمینہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ جب کسی ٹریفک سگنل پر گاڑی رکتی تو لوگ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی نہایت خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکی اور اس کی ساتھ پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہوا گاما جو لباس اور شکل و صورت ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ یہی تضاد لوگوں کے لئے غالباً حیرت کا باعث تھا۔

باغبانپورہ میں گھاس منڈی کے سامنے ثمینہ نے گاڑی روک لی۔

"کسی سے معلوم کرو صدیقا کہاں ہے؟" ثمینہ نے گامے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گاما گاڑی سی اتر کر کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر گھاس منڈی کے ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا اس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی وہ پاکستانی بازار کی طرف سے آیا تھا۔

"پتہ چلا؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں وہ باغیچی سیٹھاں والی میں بیٹھا ہوا ہے۔" گامے نے جواب دیا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی گلی میں۔" گامے نے سڑک کے پار اشارہ کیا۔

"بیٹھو۔" ثمینہ نے اشارہ کیا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے یو ٹرن لیا اور گامے کے کہنے پر گاڑی ایک تنگ سی گلی میں موڑ دی۔ اس گلی میں دائیں طرف ایک بہت بڑا احاطہ تھا جو گھوڑوں کے اصطبل کا کام دے رہا تھا۔ اس سے آگے فرنیچر کا ایک بہت بڑا ورکشاپ تھا بائیں طرف مکان بھی تھے اور دو تین ایسے چھوٹے چھوٹے کارخانے تھے جہاں سائیکلوں کے پرزے تیار ہوتے تھے۔

اس سے آگے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے چاروں طرف کسی قلعہ نما عمارت کی قدیم چار دیواری تھی فرنیچر کے ورکشاپ کے ساتھ ہی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کا واٹر پمپ اور میونسپل کارپوریشن کی ایک چھوٹی سی ڈسپنسری تھی۔ بالکل سامنے چھوٹی سرخ اینٹوں کا ایک بہت بڑا چبوترہ تھا جس کے عین وسط میں ایک ٹوٹی پھوٹی قبر تھی قبر والے چبوترے پر پیپل کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ پیپل کا یہ درخت بھی شاید اتنا ہی قدیم تھا جتنی یہ قبر..... اس کی پھیلی ہوئی شاخیں قبر پر سایہ فگن تھیں۔

یہ مہابت خان کی قبر تھی..... وہی مہابت خان جو شہنشاہ جہانگیر کا جرنیل تھا۔ لاہور کا گورنر..... بڑا دبدبہ تھا اس کا..... لیکن اب اس کی قبر کے چبوترے پر بچے کرکٹ کھیلا کرتے تھے کسی زمانے میں اس کے چاروں طرف ایک عظیم مقبرے کی دیوار ہوا کرتی تھی چار دیواری اور احاطے کا کچھ حصہ اب بھی باقی تھا جسے لوگوں نے اصطبل بنا لیا تھا۔

ثمینہ نے گاڑی قبر والے چبوترے کے قریب روک لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی اس کی نظریں چار دیواری کے بالکل آخری کونے میں ایک جگہ جم گئیں احاطے کے اس حصے میں تانگوں کی مرمت کرنے والے نے قبضہ جما رکھا تھا تین چار ٹوٹے پھوٹے تانگے کھڑے تھے ایک طرف ایک دائرے میں اپلے سلگ رہے تھی ان اپلوں میں کسی تانگے کے پہیے کا رم دبا ہوا تھا۔

قریب ہی دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی زمین پر پڑی ہوئی تانگے کی ایک ٹوٹی پھوٹی گدی پر بیٹھا ہوا تھا اس نے میلی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

"میرا خیال ہے صدیقا وہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ جس نے چادر اوڑھ رکھی ہے۔" ثمینہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی ہے میں اسے لے کر آتا ہوں۔" گاما اترنے کے لئے کار کا دروازہ کھولنے لگا۔

"خیال رکھنا بھاگنے نہ پائے۔" ثمینہ نے کہا۔

"میری نظروں میں آ گیا ہے اب بچ کر کہاں جائے گا۔" گاما کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا۔

قبر والے چبوترے کے قریب مکانوں کے سامنے کوئی گاڑی رکنا انوکھی بات نہیں تھی لیکن تانگوں والے ورکشاپ میں بیٹھے ہوئے دو تین آدمی بڑے غور سے اس طرف دیکھ رہے تھے اور جب گاما گاڑی سے اتر کر آگے بڑھنے لگا تو دو آدمی وہاں سے کھسک گئے۔ تانگے کی ٹوٹی ہوئی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے بھی گامے کو دیکھ لیا تھا اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے۔

وہ صدیق تھا۔ گامے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور آہستہ آہستہ تانگوں کے پچھلی طرف جانے لگا۔ گاما ابھی دور ہی تھا کہ صدیقے نے فصیل نام دیوار کی طرف دوڑ لگا دی گاما بھی للکارتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔

فصیل نما دیوار ٹوٹی پھوٹی تھی دیوار کی بلندی اگرچہ بیس بائیس فٹ تھی مگر اس پر چڑھنا زیادہ مشکل نہیں تھا اور صدیقا دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گامے نے جیب سے پستول نکال کر گولی چلا دی وہ اسے نشانہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ فائر کا مقصد محض اسے ڈرانا تھا۔ گولی صدیقے کے پیر سے تقریباً دو فٹ دور دیوار میں لگی دیوار کا چونے کا پلستر اکھڑ کر گرا صدیقے کی منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بھی دھڑام سے نیچے گر گیا۔

فائر کی آواز سے ڈسپنسری اور آس پاس کے لوگ چونک گئے۔ کچھ لوگ خوفزدہ ہو کر وہاں سے محفوظ جگہ کی طرف دوڑے تھے۔ گاما دوڑ کر صدیقے کے قریب پہنچ گیا جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا گامے نے قریب پہنچتے ہی اس کے سر اور پسلیوں پر دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں اور چادر کھینچ کر دور پھینک دی چادر کے ساتھ ہی کپڑے کا ایک چھوٹا سا تھیلا بھی دور جا گرا تھا جس میں سے پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں نکل کر ادھر ادھر بکھر گئیں وہ ہیروئن کی تھیلیاں تھیں۔ گامے نے صدیقے کو قمیض کے کالر سے پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا کار کی طرف لے جانے لگا۔

لوگ اب خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی بجائے کھڑے یہ دلچسپ منظر دیکھ رہے تھے بہت سے لوگ صدیقے کو ہیروئن فروش کی حیثیت سے جانتے تھے ان کے خیال میں اسے پکڑنے والا کوئی پولیس کا آدمی تھا لیکن جب انہوں نے کار میں ایک خوبصورت لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو انہیں حیرت ہوئی تھی کہ کیا اس خوبصورت لڑکی کا تعلق خفیہ پولیس سے ہو سکتا ہے؟

تانگوں والے ورکشاپ پر بیٹھے ہوئے بعض لوگ گامے کو بھی جانتے تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ صدیقا ماجھا گجر کا آدمی تھا اور گاما کا تعلق شارق سے تھا اور یہ دونوں گروہ طویل عرصہ سے آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان لوگوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب صدیقے کی خیر نہیں۔

گاما صدیقے کو ٹھوکریں مارتا ہوا کار کے قریب لے آیا اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے ٹھوکریں مارتے ہوئے اندر ٹھونس دیا اور خود بھی اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

ثمینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس نے کار ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی کار واپس موڑنے کے بجائے وہ ایک اور گلی میں گھوم کر پچھلی طرف ایک تنگ سے بازار میں نکل آئی۔ تنگ دھڑنگ بچے بھی سڑک پر دوڑ رہے تھے ٹریفک اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن ثمینہ کار کی رفتار بڑھا نہیں سکی تھی۔ اسے رفتار بڑھانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اسے اطمینان تھا کوئی ان کے تعاقب میں نہیں ہے۔

یہ تنگ سی سڑک انگوری سینما کے قریب مغلپورہ لنک روڈ پر جا ملتی تھی اس سڑک پر پہنچتے ہی ثمینہ نے کار دائیں طرف موڑ دی اور اس کے ساتھ ہی کار کی رفتار بڑھا دی لاہور چھاؤنی کی مختلف سڑکوں اور آر اے بازار کی طرف سے ہوتی ہوئی کار گڑھی شاہو والی سڑک پر آ گئی۔

پچھلی سیٹ پر گاما صدیقے کو دبوچے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے صدیقے کی تلاشی لی تھی اس کی جیب سے ایک کمانی دار چاقو برآمد ہوا تھا جسے گامے نے ثمینہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ثمینہ نے وہ چاقو ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دیا تھا اس کمانی دار چاقو کے علاوہ اس کی جیبوں سے ہیروئن کی چند پڑیاں اور کچھ رقم برآمد ہوئی تھی۔

"تم جیسے لوگوں کا مال تو جائز اور حلال ہے۔" گامے نے کہتے ہوئے وہ رقم اپنی جیب میں ڈال لی۔

"گامے!" ثمینہ نے سامنے لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے معلوم کرو ماجھا گجر کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم..... خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم....." صدیقا گھگھیایا۔

"کل تو تمہیں معلوم تھا۔" ثمینہ نے کہا۔ "مجھے بازار میں دیکھ کر تم نے تعاقب کر کے میرا گھر دیکھ لیا اور گجر کو اطلاع کر دی۔ گجر تو بڑے غیرت مند ہوتے ہیں لیکن ماجھے جیسا بے غیرت گجر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس میں شارق کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں مجھے اٹھانے کی کوشش کر ڈالی اور اس کوشش کا نتیجہ تم نے بھی دیکھ لیا۔ اگر عین وقت پر شارق نہ بھی پہنچ جاتا تو تم لوگ مجھے لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے یہ میرے ہاتھ دیکھ رہے ہو؟" اس نے بایاں ہاتھ اٹھا کر دکھایا۔ "میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ ماجھے گجر سے اب شارق نہیں میں نمٹوں گی۔ تم تو اس کے بہت معمولی سے کارندے ہو کل تم نے وہی کیا تھا جو تمہیں کرنا چاہئے تھا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور میں نہیں

چاہتی کہ میرے ہاتھ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم شرافت سے مجھے دو کہ ماجھا گجر کہاں ہے میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔"

"رب جانتا ہے ثمینہ بی بی مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔" صدیقا نے جواب دیا۔

"کل تم نے اسے میرے بارے میں اطلاع کیسے دی تھی؟" ثمینہ نے کہا۔

"کل وہ نہر والی کوٹھی پر تھا۔" صدیقے نے جواب دیا۔ "لیکن رات والے واقعہ کے بعد اس نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا ہے وہ ڈر گیا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں اب وہ کہاں ہو گا۔"

"ثمینہ بی بی! یہ ایسے نہیں مانے گا۔" گامے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اسے حویلی لے چلو میں خود ہی معلوم کر لوں گا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے ایسے لوگوں کی زبان کھلوانے کے لئے پیار بھری باتوں کی نہیں لاتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

صدیقہ گھگھیا گھگھیا کر ثمینہ کی منت سماجت کر رہا تھا کہ وہ بے قصور ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ گامے نے اس کی پسلیوں پر دو تین گھونسے جما دیئے وہ دانت بھینچ کر دوہرا ہو گیا۔

"اب اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو گردن مروڑ دوں گا۔" گاما غرایا۔

صدیقا پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہو کر بیٹھا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ حویلی پہنچ گئے۔ ثمینہ نے کار گیٹ کے باہر ہی روک لی تھی۔

"گامے! میں شام کو آؤں گی اس وقت تک تمہیں اس سے یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ ماجھا گجر کہاں ہے۔" ثمینہ نے کہا اور کار موڑ لی۔

واپسی پر جب وہ سمن آباد موڑ پر پہنچی تو کسی حادثے کی وجہ سے ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ ثمینہ آہستہ آہستہ گاڑی کو آگے بڑھاتی رہی۔ ٹریفک سڑک کے کنارے بہت ہلکی رفتار سے چل رہا تھا۔ سمن آباد موڑ سے ذرا آگے گندے نالے کا پل تھا۔ اس پل کے دوسری طرف سڑک کے دائیں طرف چوبرجی کوارٹرز تھے لیکن اب ثمینہ کو اس طرف سے گزرنے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

پلیا پر ٹریفک کی رفتار کچھ اور بھی سست ہو گئی تھی دفعتاً" ایک موٹر سائیکل آگے نکل کر کار کے برابر آ گئی۔ ثمینہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ موٹر سائیکل سوار نے کھڑکی پر ہاتھ مارا۔ ثمینہ نے گردن گھما کر دیکھا اس کے ساتھ ہی اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا موٹر سائیکل سوار اس کا باپ تھا۔

"گاڑی ایک سائیڈ پر روکو۔" اس کے باپ نے اشارہ کیا۔

باپ کو دیکھ کر ثمینہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ گاڑی روک رہی ہے۔

تقریباً پچاس گز آگے نکل کر اس نے گاڑی بائیں طرف ایک راستے پر موڑ لی اس طرف بھی سرکاری کوارٹرز تھے اور یہ راستہ ان کوارٹروں میں آنے جانے کے لئے تھا۔ اس سے چند گز آگے چوبرجی کوارٹرز کا گیٹ تھا۔ ثمینہ نے اس راستے پر موڑتے ہی گاڑی روک لی۔ اس کے باپ نے بھی قریب آ کر موٹر سائیکل روک لی تھی۔ باپ کی چہرے کے تاثرات دیکھ کر ثمینہ کے دل پر گھونسہ سا لگا۔

"ڈیڈی!" وہ کار سے اتر کر باپ کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔ "کچھ کہنے سے پہلے میری بات سن لیجئے ہم پہلے ہی بہت رسوائی دیکھ چکے ہیں۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے لمبی داستان ہے میری ذلت اور رسوائی کی' آپ پلیز! گھر چلے جایئے کسی کو مت بتایئے کہ مجھ سے ملاقات ہوئی تھی میں کسی روز گھر آؤں گی پھر چاہے آپ میرا گلا گھونٹ دیجئے لیکن پلیز ڈیڈی اس وقت آپ کچھ مت بولئے۔"

باپ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے اور پھر دفعتاً" موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ کک لگا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اسے تیزی سے گھما کر کالونی کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس نے مڑ کر ثمینہ کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

ثمینہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی قریبی کوارٹر کا دروازہ کھلا ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا وہ عجیب سی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ کار میں بیٹھ گئی اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور یو ٹرن لے کر کار کو سڑک پر لے آئی سڑک پر آتے ہی اس نے کار کی رفتار ایک دم بڑھا دی اس کے دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

وہ گھر جانے کی بجائے مال روڈ کی طرف نکل گئی۔ لارڈز کے سامنے کار روک کر وہ نیچے اتر آئی اس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے مال روڈ پر بڑی چہل پہل تھی۔ لارڈ کے سامنے بہت کھلی جگہ تھی جہاں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں اور کچھ لوگ کھڑے باتوں میں وقت گزار رہے تھے۔ ایک موٹر سائیکل کے قریب ایک نوجوان کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی موٹر سائیکل کی سیٹ پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں پیر ایک ہی طرف تھے وہ بھی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

ثمینہ نے تاریک شیشوں کی عینک اتار کر سیٹ پر ڈال دی اور اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکایا'

کار کا دروازہ کھول کر شیشہ چڑھایا اور درواز لاک کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگی یہاں آنے میں ا
کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ باپ سے ملاقات کے بعد وہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو
تھی اور غیر ارادی طور پر اس طرف نکل آئی تھی۔

موٹر سائیکل کے قریب کھڑے ہوئے نوجوان نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ساتھی کو اشا
کیا۔ اس نے بھی گھوم کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں سے بے اختیار سیٹی نکل گئی۔

ثمینہ نے سیٹی کی آواز سن لی اور گھورتی ہوئی نظروں سے ان نوجوانوں کی طرف دیکھنے لگی
وہ دونوں اچھے اور معزز گھرانوں کے لگتے تھے لیکن ان کے مزاج میں آوارگی نمایاں تھی۔ ثمی
لاپرواہی سے قدم اٹھاتی ہوئی ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھی دروازے پر کھڑے ہو
باوردی دربان نے پہلے اسے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور پھر دراوزہ کھول دیا۔

ثمینہ پہلی مرتبہ شارق کے ساتھ یہاں آئی تھی تو سہمی سہمی تھی لیکن آج وہ بڑے بے باک
انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ دروازے کے قریب ہی رک کر ادھر ادھر دیکھنے گی۔ اند
روشنی بہت مدھم تھی چند میزوں پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے جبکہ بیشتر میزیں خالی تھیں یہاں کی
رونق دراصل شام کے بعد شروع ہوتی تھی اور اس وقت تو سیٹ حاصل کرنا بھی مشکل ہوتا تھا۔

ثمینہ چند لمحے دروازے کے قریب کھڑی رہی پھر ایک باوردی ویٹر تیزی سے اس کے قریب
آ گیا۔

"اس طرف تشریف لائیے میڈم!" ویٹر نے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔

"تھینک یو" ثمینہ آگے بڑھ کر اس میز کے قریب پہنچ گئی۔ ویٹر نے بڑے احترام سے اس
کے لئے کرسی کھینچ دی تھی۔ ثمینہ کے بیٹھتے ہی ویٹر چلا گیا چند منٹ بعد وہ واپس آیا اور ایک
خوبصورت طشتری میں رکھا ہوا ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"کافی لے آؤ.... ذرا اسٹرانگ۔" ثمینہ نے ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ویٹر کے جانے کے بعد اس نے گلاس اٹھا لیا اور ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس دوبا
میز پر رکھ دیا۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ اس کے حلق اور سینے میں ٹھنڈک کی ایک لہر سی دوڑتا ہو
چلا گیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد ویٹر نے اس کے سامنے کافی سرو کر دی ثمینہ کڑوی کافی کی چسکیاں لیتے
ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ والی میز خالی تھی۔ اس کے بعد والی میز پر ایک نوجوان
جوڑا بیٹھا ہوا سر جھکائے سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا۔

ثمینہ نے کافی کا ابھی آدھا کپ ہی ختم کیا تھا کہ ریسٹورنٹ کا دروازہ کھلا اس کی نظر

اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئی وہی دونوں نوجوان اندر داخل ہوئے جنہیں وہ باہر موٹر سائیکل
کے قریب دیکھ چکی تھی۔ وہ دونوں دروازے کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ثمینہ کو
دیکھ کر ان میں سے ایک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی وہ دونوں اس میز کی طرف آ
گئے ثمینہ ان کی طرف توجہ دیئے بغیر کافی کی چسکیاں لینے لگی۔

"ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں!" ان میں سے ایک نوجوان نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ
اپنے ساتھی کے مقابلے میں قدرے لمبے قد کا مالک تھا۔ گوری رنگت اور کلین شیو دوسرا درمیانے
قد کا مالک تھا سانولی رنگت اور پنسل ٹائپ مونچھیں۔

"ارے یار عارف۔" مونچھوں والے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پوچھنے کی
کیا بات ہے بیٹھ جاؤ کمپنی رہے گی یہ خود بھی اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہو گی۔"

"جناب محمود صاحب آپ شاید بھول گئے ہیں کہ ایٹی کیٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" لمبے قد
والے عارف نے کہا۔

"ارے چھوڑو یار ایٹی کیٹ کو.... بیٹھو۔" محمود کہتے ہوئے بے تکلفی سے ثمینہ کے سامنے
والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اس کی ساتھ ہی چٹاخ کی آواز ابھری اور مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ گھوم کر اس
طرف دیکھنے لگے۔ محمود کے گال پر پڑنے والا تھپڑ اس قدر زور دار تھا کہ وہ کرسی سمیت ہل کر رہ
گیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بے اختیار گال پر پہنچ گیا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تت..... تم.... تمہاری یہ ہمت..." محمود کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کا چہرہ غصے کی
شدت سے ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

"آؤٹ!" ثمینہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے چیختے ہوئے ایک ہاتھ سے
دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "تم لوگ یہ کیوں سمجھتے ہو کہ اکیلی نظر آنے والی ہر لڑکی آوارہ ہوتی
ہے۔ اگر تم ایک سیکنڈ کے اندر اندر یہاں سے دفعان نہ ہوئے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ
اپنے پیروں پر چل کر جا بھی نہیں سکو گے۔"

دراز قامت عارف ثمینہ کی اس کارروائی سے بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے محمود کا ہاتھ پکڑ کر
وہاں سے ہٹ جانا چاہا لیکن محمود نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اسی لمحہ ریسٹورنٹ کا مینجر اور
دو تین ویٹر بڑی تیزی سے وہاں پہنچ گئے۔

"یہ ریسٹورنٹ ہے یا قحبہ خانہ؟" ثمینہ' مینجر کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کیا لچے لفنگوں کے
داخلے پر کوئی پابندی نہیں' یا شرفاء یہاں آنا چھوڑ دیں۔"

"مجھے افسوس ہے میڈم!" مینجر نے کہا۔ "میں ابھی ان دونوں کو پولیس کے حوالے کر
ہوں۔"

"پولیس کے حوالے کرنے کی ضرورت نہیں۔" ثمینہ نے کہا۔ "چھوڑ دو انہیں۔ غیرت
ہوں گے تو آئندہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔"

مینجر نے ویٹروں کو اشارہ کیا۔ ویٹر محمود اور عارف کو بانہوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر
گئے۔ محمود مڑ مڑ کر ثمینہ کو بدترین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

"میں ایک بار پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں خاتون۔" مینجر نے ثمینہ کی طرف دیکھ کر
اظہار ندامت کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ نے بہت اچھا کیا۔ ان غنڈوں کی اگر اسی طرح پٹائی
ہوتی رہے تو آئندہ یہ واقعی کسی خاتون کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔"

"آپ نے واقعی بہت اچھا کیا۔" قریبی میز سے ایک نوجوان نے کہا وہ بھی اٹھ کر ان کے
قریب آ گیا۔ "لیکن شاید آپ نے یہ نہیں سوچا کہ یہاں سے باہر نکلنے کے بعد یہ بدمعاش آپ کو
کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"ان جیسے بدمعاشوں سے نمٹنا میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" ثمینہ نے جواب دیا اور ویٹر
کو دوسری کافی لانے کے لئے کہا پہلی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ثمینہ ریسٹورنٹ سے نکلی۔ ریسٹورنٹ کے سامنے رونق بڑھ گئی
تھی۔ اس نے دروازہ سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا نہ تو وہ موٹر سائیکل نظر آ رہی تھی اور نہ ہی
آس پاس کہیں وہ نوجوان دکھائی دیئے تھے۔ ثمینہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کے لوگ آسانی
سے ہار ماننے والے نہیں ہوتے۔ اسے یقین تھا کہ وہ دونوں آس پاس کہیں نہ کہیں ضرور موجود
ہوں گے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کر کے اسے ہلکی رفتار سے
سروس روڈ پر ہی ریگل چوک کی طرف لے جانے لگی۔

اور پھر وہ دونوں نظر آ گئے ریسٹورنٹ سے تقریباً پچاس گز آگے وہ اپنی موٹر سائیکل کے
قریب کھڑے تھے۔ ثمینہ کو دیکھتے ہی عارف نے سیٹ پر بیٹھ کر موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کر دیا
اور محمود اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ثمینہ نے ٹریفک سگنل کی سرخ بتی دیکھ کر گاڑی روک لی اور پھر روشنی تبدیل ہوتے ہی اس
نے یوٹرن لیتے ہوئے سڑک پر گاڑی واپڈا ہاؤس کی طرف موڑ دی۔ وہ موٹر سائیکل بھی اسی طرف
مڑی تھی۔

اسمبلی والے موڑ پر اسے ایک بار پھر سرخ بتی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے گاڑی روک لی اس

کے آگے دو گاڑیاں تھیں اور پیچھے بھی دو تین گاڑیاں آ کر رک گئی تھیں۔ موٹر سائیکل ان
گاڑیوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی ثمینہ کی کار کے برابر آ کر رک گئی۔ ثمینہ نے گردن گھما کر
دیکھا موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا محمود خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں حساب چکانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا' تھوڑی دیر بعد ہی تم سے نمٹ لوں گا۔" محمود
نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کے لہجے میں کتے کی سی غراہٹ تھی۔

ثمینہ طیش دلانے والے انداز میں مسکرا دی اسی دوران ٹریفک سگنل پر پہلے اورنج اور پھر سبز
بتی روشن ہو گئی ثمینہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اپر مال روڈ بہت کشادہ سڑک تھی اور غالباً لاہور کی سب سے خوبصورت سڑک بھی یہی تھی۔
تمام فائیو اسٹار ہوٹل اسی سڑک پر واقع تھے۔ سڑک پر کئی گاڑیاں اور بھی تھیں۔ موٹر سائیکل کبھی
ثمینہ کی کار کے برابر آ جاتی اور کبھی پیچھے رہ جاتی ثمینہ اطمینان سے ڈرائیونگ کرتی رہی۔

نہر والے موڑ سے پہلے ہی اس نے رفتار کم کر دی اور دائیں طرف مڑنے کے لئے انڈی
کیٹر آن کر دیا۔ اس سے آگے ایک اور گاڑی دائیں طرف نہر کے کنارے والی سڑک پر مڑی
تھی یہی نہر گلبرگ کی طرف چلی گئی تھی اور گلبرگ نہر کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے دونوں
کناروں پر سڑکیں تھیں اور ان کے پیچھے بڑی بڑی رہائشی کوٹھیاں۔

اس وقت سورج غروب ہونے والا تھا دن کی روشنی کم ہو رہی تھی۔ اس سڑک پر اکا دکا ہی
گاڑیاں تھیں اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ صرف ثمینہ کی گاڑی اکیلی رہ گئی۔ موٹر سائیکل اس سے
تقریباً بیس گز پیچھے تھی اور پھر دفعتاً" موٹر سائیکل جیسے ہی کار کے برابر پہنچی ثمینہ نے غیر محسوس
انداز میں کار کو دائیں طرف لینا شروع کر دیا۔

موٹر سائیکل کی رفتار خاصی تیز تھی وہ اسے دائیں طرف لیتا چلا گیا۔ کار اسے مسلسل دبا رہی
تھی عارف کو ثمینہ کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی اس نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا کر آگے
نکلنا چاہا مگر ثمینہ نے بھی کار کی رفتار بڑھا دی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا محمود چیخ چیخ کر
ثمینہ کو گندی گالیاں بک رہ تھا۔ موٹر سائیکل نہر کے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی ثمینہ نے
مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کار کو کچھ اور دائیں طرف کر لیا موٹر سائیکل نہر کے بالکل کنارے
پر پہنچ گئی۔ عارف کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا وہ تیز رفتار موٹر سائیکل کو ایک دم روک بھی نہیں سکتا
تھا آگے نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جو ثمینہ چاہتی تھی۔ موٹر سائیکل کے پہیوں نے زمین چھوڑ دی اور وہ ہوا
میں اڑتی ہوئی نہر کے عین وسط میں جا کر گری۔ عارف اور محمود بھی چیختے ہوئے موٹر سائیکل کے

ساتھ ہی نہر میں گرے۔ ثمینہ کار کو سڑک کے وسط میں لے آئی۔ اس نے نہر کے دوسرے کنارے والی سڑک پر مخالف سمت سے آنے والی دو کاروں کو رکتے ہوئے دیکھا تھا ان لوگوں نے موٹر سائیکل کو نہر میں گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ثمینہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ثمینہ حویلی پہنچ گئی اس نے کار گیٹ کے سامنے روک کر ہارن بجایا تو چند منٹ بعد گامے نے گیٹ کھول دیا ثمینہ کار کو اندر لیتی چلی گئی۔

"کیا رہا صدیقا کہاں ہے؟" ثمینہ نے درخت کے نیچے کار سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"اوپر ہے۔" گامے نے مسکراتے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

ثمینہ نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی چونک گئی۔ صدیقا درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔

"اس کا مطلب ہے اس نے کچھ بتایا نہیں؟" ثمینہ بولی۔

"بڑا پکا ہے ثمینہ بی بی۔" گامے نے جواب دیا۔ "اب تک میں اس سے پیار محبت سے باتیں کرتا رہا تھا لیکن یہ منہ سے کچھ نہیں پھوٹا۔ اسے لٹکائے ہوئے ابھی صرف تین چار منٹ ہوئے ہیں دیکھتا ہوں کہ یہ کب تک اپنی زبان بند رکھتا ہے۔"

"واقعی بہت پکا ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ بتائے گا نہیں۔" ثمینہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔ "اسے چھوڑ دو اور تم میرے ساتھ چلو۔ ماجھے گجر کا پتہ بھی خود ہی چلا لیں گے۔"

"اس کا کیا کریں.... قیں کر دیں۔" گامے نے مخصوص انداز میں اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا۔

"نہیں اسے ایسے ہی لٹکا رہنے دو خود ہی قیں ہو جائے گا۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اور یہ اطمینان کر لو کہ اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نہ نکل جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شور مچا کر کسی کو متوجہ کر لے۔"

"کپڑا تو میں نے اس کے حلق کے اندر تک ٹھونسا ہوا ہے اور ہاتھ بھی پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔ اب یہ بول نہیں سکے گا اسی طرح خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔" گامے نے جواب دیا۔

صدیقا بول نہیں سکتا تھا لیکن ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح حرکت دینے لگا کہ اس کا جسم جھولے کے طرح جھولنے لگا۔ گامے نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ ثمینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گامے نے آگے جا کر کمروں کے دروازے بند کر دیئے اور ایک بار پھر ثمینہ کی طرف

دیکھنے لگا۔

ثمینہ کار میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ صدیقا اسی طرح الٹا لٹکا رہا تو زیادہ سے زیادہ آدھے پونے گھنٹے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے گامے کو اشارہ کیا گامے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ ثمینہ نے گاڑی گھماتے ہوئے ایک بار پھر صدیقے کی طرف دیکھا اسے صدیقے پر ذرا سا بھی ترس نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے اور رضیہ وغیرہ کو اپنا گھر چھوڑنا پڑا تھا اپنی تو اسے فکر نہیں تھی لیکن رضیہ اور مریم کا افسوس تھا۔ وہ کتنے سکون سے اس گھر میں رہ رہی تھیں لیکن انہیں رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح اس گھر سے بھاگنا پڑا تھا۔ مریم نے اس واقعہ کا سب سے زیادہ اثر لیا تھا۔ شارق نے اسے بتا رکھا تھا کہ وہ بزنس کرتا ہے۔ ان ماں بیٹیوں کے ذہن میں شارق کا تصور نجانے کیا تھا۔ وہ شاید اسے فرشتہ سمجھتی تھیں لیکن اب شارق کے بارے میں جو انکشافات ہوں گے اس کا انہیں کتنا صدمہ ہو گا اور اس کی تمام ذمے داری ثمینہ کے خیال میں اسی صدیقے پر عائد ہوتی تھی' جو ماجھے گجر کے ساتھ ان کے گھر پر چڑھ دوڑا تھا اور ثمینہ کے خیال میں اس کی یہی سزا ہونی چاہئے تھے کہ وہ اس وقت تک درخت سے الٹا لٹکا رہے جب تک روح اس کے جسم کا ساتھ نہیں چھوڑ دیتی۔

گامے نے گیٹ کھول دیا۔ ثمینہ گاڑی باہر لے آئی تو گامے نے گیٹ بند کر کے تالہ لگا دیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ثمینہ کار کو موڑ کر کچے راستے پر لے آئی۔

جب وہ مزنگ چوک پر پہنچی تو آٹھ بج رہے تھے ثمینہ نے گامے کو چوک پر ہی اتار دیا تھا۔

"صبح سویرے حویلی چلے جانا اور اسے اوپر سے اتار کر انڈر گراؤنڈ کر دینا۔" اس نے گامے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گا ثمینہ بی بی۔" گامے نے جواب دیا۔

"اور یہاں دھندہ کب شروع کر رہے ہو؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ایک دو دن میں شروع کر دیں گے۔" گامے نے کہا "گاہک تو اب بھی آ رہے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ دھندہ شروع کرنے سے پہلے ایسے انتظامات بھی کر لئے جائیں کہ اپنا بچاؤ بھی ہوتا رہے۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

ثمینہ جب گھر پہنچی تو سوا نو بج رہے تھے۔ نوکھا کوٹھی کے گیٹ کے سامنے ہی مل گیا' پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی ثمینہ نے جیسے ہی گاڑی روکی وہ لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر

مسکراتے ہوئے کہا۔

"بارہ نہ بجیں تو اور کیا ہو۔" نولکھا نے کہا۔ "تم دوپہر سے گئی ہوئی ہو کہیں سے ٹیلی فون ہی کر دیتیں سب لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔ شارق باؤ تمہیں تلاش کرنے گیا ہے اور وہ جو ہیں نا ماں جی اور رضیہ بہن وہ تو بہت ہی پریشان ہیں تم ذرا اندر چلو ماں جی تمہاری خبر لیتی ہیں۔"

"سوری نولکھا بھائی۔" ثمینہ نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

"انگریزوں کی طرح صرف ایک لفظ کہہ دینے سے بات ختم نہیں ہو جاتی۔" نولکھا نے اسے گھورا۔ "تمہیں تفصیل سے بتانا پڑے گا کہ کہاں غائب تھیں۔"

"پتہ ہے کیا ہوا؟" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "میں مزنگ سے گامے کو ساتھ لے کر صدیقے کی تلاش میں گئی تھی۔ اسے باغبانپورہ سے اٹھا کر حویلی پہنچایا واپس آ رہی تھی کہ سمن آباد موڑ کے قریب ڈیڈی سے ملاقات ہو گئی۔" باپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ثمینہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "بڑی مشکل سے ڈیڈی کو ٹالا پھر مال روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی کہ دو غنڈوں نے مال غنیمت سمجھ کر مجھ پر قبضہ کرنا چاہا انہیں گلبرگ نہر میں نہانے کے لئے چھوڑ کر دوبارہ حویلی گئی وہاں سے گامے کو لے کر مزنگ چھوڑا اور اب یہاں آئی ہوں۔"

"صدیقے نے کچھ بتایا یا نہیں؟" نولکھا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں لیکن ماجھے گجر کا پتہ اب میں خود معلوم کر لوں گی۔" ثمینہ نے جواب دیا' وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رضیہ بھی گیٹ سے باہر آ گئی' اس نے بھی گیٹ پر کھڑے کھڑے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔

"اچھا چلو اندر چل کر بات کرتے ہیں' ماں جی کہاں ہیں؟" ثمینہ نے کہا۔

"اوپر ٹیرس پر بیٹھی ہیں۔" رضیہ نے اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ثمینہ اور رضیہ اندر آ گئیں وہ رکے بغیر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر والی منزل کے ٹیرس پر آ گئیں۔

ٹیرس بڑا خوبصورت تھا۔ تین اطراف میں چھت کے کنارے پر تقریباً چار فٹ اونچی گرل لگی ہوئی تھی جس کے ساتھ ساتھ پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔

ٹیرس پر آنے والے دروازے کے اوپر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ پانچ چھ گارڈن چیئرز پڑی ہوئی تھیں ایک کرسی پر مریم بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے ہو ثمینہ سے ناراض ہے اور جب اس نے زبان کھولی تو ثمینہ کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ثمینہ کرسی کے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر مریم کی گود میں رکھ لیا مریم نے اس

کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ لوگ میرے لئے اتنا پریشان ہوں گے۔" ثمینہ نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو پریشانی اٹھانا پڑی۔"

"کل رات جو کچھ بھی ہوا تھا اس کے بعد تم سوچ سکتی ہو کہ تمہارے اس طرح غائب رہنے سے میں چین سے کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔"

"واقعی میری غلطی تھی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "مجھے کہیں سے ٹیلی فون کر دینا چاہئے تھا تا کہ آپ لوگ تو پریشان نہ ہوتے۔"

"شارق تمہیں تلاش کرنے کے لئے پتہ نہیں کہاں گیا ہے۔" مریم نے کہا۔

"اسے مزنگ سے پتہ چل جائے گا کہ میں گھر پہنچ گئی ہوں وہ بھی جلد واپس آ جائے گا۔" ثمینہ نے کہا اور پھر اٹھ کر رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ شاداں کیا کر رہی ہے کھانا تیار ہوا یا نہیں؟ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ کچن ہی میں ہے۔" رضیہ نے کہا۔ "بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے چلو چل کر دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔"

"ماں جی آپ یہیں بیٹھیں گی یا نیچے چلیں گی؟" رضیہ نے پوچھا۔

"میں ابھی یہیں بیٹھوں گی بیٹا ٹھنڈی ہوا بہت اچھی لگ رہی ہے۔" مریم نے جواب دیا۔

وہ دونوں کچن میں چلی گئیں۔ شاداں وہیں موجود تھی۔ "کتنی دیر ہے بھئی کھانے میں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"بس جی روٹیاں پک جائیں تو میں کھانا نکالتی ہوں۔" شاداں نے کہا۔

وہ دونوں کچن سے نکل کر ہال کمرے میں آ گئیں۔ نولکھا بھی گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد ہال کمرے میں آ گیا لیکن ان دونوں کو دیکھ کر وہ کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"میں کل رات سے آپ سے ایک بات پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن موقع نہیں ملا۔" رضیہ نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو کیا بات ہے؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' ویسے وہ رضیہ کے لہجے سے سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔

"یہ نولکھا کون ہے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"شارق کا دوست۔"

"دوست؟" رضیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔ "شارق بھائی کا دوست نولکھا؟"

"جب تم شارق کے دوسرے دوستوں سے ملو گی تو تمہیں مزید حیرت ہو گی۔" ثمینہ نے کہا "ویسے ایک بات تمہیں بتا دوں شارق کے جتنے بھی دوست ہیں سب کے سب نہایت مخلص اور بے حد وفادار ہیں۔ یہ لوگ شارق کے لئے جان دینے کو بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ویسے ان سب میں ایک اور ایسا رشتہ بھی ہے جس میں یہ لوگ آپس میں بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں۔"

"کیسا رشتہ؟" رضیہ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم ابھی اس بات کو نہیں سمجھ سکو گی' ویسے شارق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ثمینہ نے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"ایک بہن کے اپنے بھائی کے بارے میں کیا خیالات ہو سکتے ہیں لیکن آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟" رضیہ نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" ثمینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

"ایک اور بات پوچھنا چاہتی ہوں۔" رضیہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کی بعد بولی۔ "آپ کا شارق بھیا سے کیا ناطہ ہے میرا مطلب ہے...."

"میں سمجھ گئی۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے جوا دیا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں بہت گہرے دوست لیکن اس سے آگے کچھ مت پوچھنا۔"

"چلئے دوستی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتی لیکن یہ تو بتایئے آپ کا گھر کہاں ہے میرا مطلب ہے آپ کے والدین...."

"میرے والدین لاہور ہی میں ہیں۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن کچھ عرصہ سے ناراضگی چل رہی ہے اس لئے آج کل میں تمہارے بھیا کے ساتھ ہی رہ رہی ہوں۔"

"کب تک؟" رضیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جب تک حالات اجازت دیں گے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

ان کی گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ شارق بھی پہنچ گیا۔ اس نے بلا اطلاع غائب رہنے پر زیادہ برہمی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ صوفے پر ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ شاداں نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ وہ لوگ اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ اوپر والے ٹیرس سے ماں جی کو بھی بلا لیا گیا۔ نولکھا بھی اپنے کمرے سے نکل کر آ گیا۔

کھانے کے بعد وہ سب لوگ ہال میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اوپر والا کمرہ رضیہ اور مریم کو دینے کے بعد شارق نے نیچے نولکھا کے ساتھ والے کمرے پر

قبضہ جما لیا تھا۔ اس وقت ثمینہ بھی اوپر ہی گئی تھی۔ مریم تو اپنے کمرے میں چلی گئی اور رضیہ' ثمینہ کے کمرے میں بیٹھی اس سے باتیں کرتی رہی۔

"تم یہیں سو جاؤ' مجھے ایک اہم کاروباری معاملے میں شارق سے ایک ضروری بات کرنی ہے آتی ہوں تھوڑی دیر میں۔" ثمینہ کہتی ہوئی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ثمینہ جب شارق کے کمرے میں داخل ہوئی تو نولکھا بھی وہاں موجود تھا ثمینہ' شارق کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میں تمہیں بلانے ہی والا تھا۔ اچھا ہوا تم خود ہی آ گئیں۔" شارق نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیریت! کوئی خاص معاملہ؟" ثمینہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"حاجی عبداللہ سے ایک اور آفر ملی ہے۔" شارق بولا۔

"کیسی آفر؟"

"افغانستان سے اس کا مال لانا ہے۔ اس نے آج تک جتنا بھی مال منگوایا ہے یہ اس کی سب سے بڑی کھیپ ہو گی۔" شارق نے بتایا۔ "یہ مال دراصل شمالی افغانستان سے لایا جائے گا جو وادی پنج شیر میں واقع ایک غیر معروف بستی کے قریب ایک قلعہ نما پرانی عمارت میں پہنچا دیا جائے گا وہاں سے آگے یہ مال ہمیں پشاور اور پھر کراچی پہنچانا ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کروڑوں کا مال ہو گا۔" ثمینہ بولی۔

"اس سے بھی زیادہ۔" شارق مسکرایا۔

"پچھلے ٹرپ میں حاجی عبداللہ نے ہمیں جو ٹرپ دیا تھا وہ ایسا تھا جیسے تمہیں خوش کرنے کے لئے تمہارے ہاتھ میں ٹافی تھما دی گئی ہو لیکن اب صورت حال مختلف ہو گی اور ہمیں سارا معاملہ پہلے ہی سے طے کرنا ہو گا۔" ثمینہ نے کہا۔

"کل رات سمن آباد والے مکان میں میری اور حاجی کی ملاقات ہو گی اس میں یہی معاملہ طے کیا جائے گا۔" شارق نے بتایا۔

"ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" ثمینہ نے کہا۔ "جو بھی کمیشن طے ہو گا اس کا کچھ حصہ اسے ایڈوانس دینا ہو گا۔"

"کیا تم حاجی عبداللہ کو بے وقوف سمجھتی ہو؟" شارق نے اسے گھورا۔

"بے وقوف حاجی عبداللہ نہیں تم ہو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "بہرحال اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے کل دن میں کسی وقت بات ہو گی۔"

"صدیقے کا کیا کرو گی؟" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "گامے نے بتایا تھا اس نے اسے درخت سے الٹا ٹانگ دیا تھا۔"

"وہ اب تک وہیں لٹکا ہوا ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "میں صبح سویرے گامے کو لے کر جاؤں گی۔ اس کا انتظام کرنے کے بعد واپس آ کر ہی تم سے بات کروں گی۔"

ثمینہ اوپر چلی گئی' رضیہ اس کے بیڈ پر سو رہی تھی۔ ثمینہ ابھی تک پینٹ شرٹ میں تھی اس نے باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کیا اور رضیہ کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی کچھ ہی دیر بعد وہ بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

صبح چھ بجے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے رضیہ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

"چلو اٹھو تمہیں یونیورسٹی جانا ہے۔"

رضیہ نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ ان دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا پھر ثمینہ نے کوٹھی کے ملازم خادم کو بلا لیا۔

"دیکھو خادم! تمہاری ڈیوٹی آج سے رضیہ بی بی کے ساتھ ہے۔ تم اسے یونیورسٹی لے کر جاؤ گے اور جب تک اس کی چھٹی نہیں ہوتی وہیں رک کر انتظار کرو گے اور ایک بات ذہن میں رکھو رضیہ کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے اسے کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"بیگم صاحبہ۔" خادم نے کہا۔ "خادم کی لاش پر سے گزر کر ہی کوئی رضیہ بی بی تک پہنچ سکے ہے۔"

"گڈ!" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سرخ شیراڈ رضیہ کے استعمال میں رہے گی اور اسے تم ڈرائیو کرو گے۔ میں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ تم رضیہ کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ رہو گے۔"

"سمجھ گیا بیگم صاحبہ! آپ فکر نہ کریں۔" خادم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ تم گاڑی چیک کرو رضیہ آ رہی ہے۔" ثمینہ نے کہا اور خادم کے جانے کے بعد وہ رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جاؤ جی.... تم بھی اپنی تیاری کرو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے ثمینہ باجی۔" رضیہ بولی۔

"کس بات سے ڈر لگ رہا ہے۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"پرسوں رات جو واقعہ پیش...."

"اسے بھول جاؤ۔" ثمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ جو کوئی بھی تھے تمہیں نہیں پہچانتے اور پھر خادم کو اس لئے تمہارے ساتھ بھیجا جا رہا ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات

جائے تو یہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اچھا اب جاؤ.... تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"

رضیہ! اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"شاداں! اماں جی کو ناشتہ دیا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"جی بی بی جی۔ انہوں نے آپ سے پہلے ناشتہ کر لیا تھا۔" شاداں نے جواب دیا۔

ثمینہ سر ہلاتی ہوئی اپنی کمرے میں آ گئی۔ رضیہ باتھ روم میں شاید کپڑے بدل رہی تھی۔ ثمینہ بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ پانچ منٹ بعد رضیہ باتھ روم سے نکل آئی' اس نے اپنی کتابیں وغیرہ سنبھالیں اور ثمینہ کو خدا حافظ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

رضیہ کے جانے کے پانچ منٹ بعد ثمینہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔ اس وقت بھی اس نے پینٹ شرٹ پہن لی تھی۔ جب وہ برآمدے میں نکل آئی تو اس نے دیکھا شارق لان میں پودوں کی کیاری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"صدیقے کا بندوبست کرنے وہ بیچارہ ٹنگا ٹنگا تھک گیا ہو گا۔" ثمینہ کہتے ہوئے پورچ میں کھڑی سفید ٹویوٹا کی طرف بڑھ گئی۔

کوٹھی سے نکل کر وہ سیدھی مزنگ پہنچی۔ وہاں سے گامے کو ساتھ لیا اور حویلی پہنچ گئی۔ راستے میں ثمینہ نے ایک بڑا گتے کا خالی کارٹن اور ایک بوری بھی خرید لی تھی۔ گامے نے درخت سے ٹنگی ہوئی صدیقے کی لاش کو اتار کر پہلے بوری میں بند کیا اور پھر بوری اٹھا کر گتے کے کارٹن میں رکھ دی۔ کارٹن بند کر کے اس پر اچھی طرح رسیاں لپیٹ دی گئی تھیں۔ دونوں نے کارٹن اٹھا کر بڑی مشکل سے کار کی ڈگی میں اس طرح پھنسا دیا کہ وہ گر نہ سکے۔

گاڑی ایک چوراہے کے قریب پہنچی تھی کہ ٹریفک سگنل کی سبز روشنی بند ہو گئی۔ ثمینہ کا خیال تھا کہ وہ سرخ بتی جلنے سے پہلے سگنل پار کر لے گی لیکن اسی لمحہ بائیں طرف سے ایک کار سامنے آ گئی۔ ثمینہ نے پوری قوت سے بریک پیڈل دبا دیا۔ بریکوں کی تیز چرچراہٹ فضا میں گونج اٹھی۔ ثمینہ نے اپنی کار کو دوسری طرف سے آنے والی کار کے ساتھ ٹکرانے سے تو بچا لیا تھا لیکن اس کی ڈگی میں پھنسا ہوا وزنی کارٹن زور دار جھٹکا لگنے سے نیچے گر گیا تھا۔

ٹریفک جام ہونے لگا مختلف گاڑیوں کے ہارنوں کی آوازوں سے فضا گونجنے لگی۔ ٹریفک کانسٹیبل دوڑتا ہوا ثمینہ کی کار کے قریب پہنچ گیا۔

"اوئے..... ہٹاؤ گڈی کو.... اور یہ ڈبا بھی ہٹاؤ.... اور...." کانسٹیبل کہتے کہتے رک گیا اس کی نظریں سڑک پر پڑے ہوئے کارٹن کے ایک کونے پر جم گئیں جہاں سے خون کے قطرے ٹپک

رہے تھے۔

ثمینہ بھی کار سے اتر چکی تھی اور پھر صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی وہ کانپ کر رہ گئی۔

○

گاما بھی کار سے اتر آیا تھا۔ اس نے بھی کارٹن سے خون کے قطرے ٹپکتے ہوئے دیکھ لئے تھے۔ غلطی اسی کی تھی۔ صدیقا چودہ پندرہ گھنٹے درخت سے الٹا لٹکا رہا تھا جسم کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو گیا تھا۔ درخت سے لٹکانے سے پہلے گامے نے اس کی اچھی خاصی پٹائی بھی کی تھی ناک سے تو اسی وقت خون بہہ رہا تھا جب گامے نے اسے الٹا لٹکایا تھا اور اب اسے درخت سے اتارتے ہوئے گامے نے کچی زمین پر تھوڑا سا خون بھی جما ہوا دیکھا تھا لیکن اسے بوری اور کارٹن میں بند کرتے وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کی صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ غالباً جھٹکے لگنے سے صدیقے کی لاش میں جما ہوا خون بہہ نکلا تھا اور یہ صورت حال دیکھ کر وہ ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔

"اوئے.... یہ کیا ہے اوئے.....؟" ٹریفک کانسٹیبل اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "خون... اس ڈبے میں کیا ہے.....؟ کھولو اسے.....!"

"کیا کہہ رہے ہو سنتری بادشاہ!" گامے نے ڈبے کے گرد لپٹی ہوئی رسیوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہمارا اتنا نقصان ہو گیا اور تم کہتے ہو خون بہہ رہا ہے سنتری بادشاہ! خون تو ہمارے دل سے بہہ رہا ہے اس ڈبہ سے نہیں۔"

"کیا بکتے ہو..... کیا ہے اس ڈبے میں؟" سنتری نے اسے گھورا..... "اس میڈم کو نہیں جانتے تم؟" گامے نے ثمینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اب وہ اپنے آپ پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔ "یہ ملک کی بہت بڑی آرٹسٹ مس ثمر ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے بڑے ڈیوڑھے کی دیواروں پر بہت بڑی تصویریں بنائی ہیں اس ڈبے میں رنگوں کی بوتلیں ہیں پتہ نہیں کتنی بوتلیں ٹوٹی ہوں گی۔ یہ رنگ تو یہاں ملتے بھی نہیں باہر سے منگواتے ہیں ہم۔" اس نے بڑی ہمت کر کے کارٹن اٹھایا اور اسے کھلی ہوئی ڈگی میں پھنسا کر اس طرح دھکے مارنے لگا کہ وہ اچھی طرح پھنس جائے۔

ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ گاڑیوں کے ہارنوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹریفک کانسٹیبل کنفیوژ ہو گیا اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا ایک لمحہ کو اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ اتنی حسین لڑکی کوئی غیر قانونی کام نہیں کر سکتی لوگوں کا شور بھی بڑھ رہا تھا۔

"چلو... ہٹاؤ گڈی.... جلدی کرو۔" ٹریفک کانسٹیبل نے گامے کو گھورتے ہوئے کہا۔

ثمینہ اور گاما ایک لمحہ ضائع کئے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ثمینہ نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی زور دار جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ چوک کے دوسری طرف بھی ٹریفک رکا ہوا تھا لیکن وہ بڑی ارت اور پھرتی سے گاڑی نکالتی لے گئی۔ بالآخر وہ لوگ چوراہے سے خاصا دور نکل آئے تھے۔

"او مائی گاڈ۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آج تو پھنس ہی گئے تھے۔"

"بچ گئے ثمینہ بی بی۔" گاما نے کہا۔ "اس کم بخت صدیقے نے مرنے کے بعد بھی ہمیں انے کی کوشش کی تھی، مگر خدا کا شکر ہے یہ بات میرے ذہن میں آ گئی اور چھٹکارا مل گیا ورنہ تو ہتھکڑیاں لگنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔"

"تم واقعی بہت ذہین ہو۔" ثمینہ نے کہا۔ "لیکن تمہارے ذہن میں آرٹسٹ اور رنگوں والا ل کیسے آیا تھا؟"

"صبح آپ کے آنے سے پہلے میں اخبار دیکھ رہا تھا۔" گامے نے کہا۔ "ایک پورے صفحہ پر ی عورت کی بنائی ہوئی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ اس عورت کی تصویر بھی تھی۔ بڑا مشکل سا تھا اس کا وہ تو مجھے یاد نہیں رہا لیکن میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی تھی۔ اخبار میں اس ت کے بارے میں جو چھوٹا سا مضمون چھپا تھا اس میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی تصویریں نے کے لئے جو رنگ استعمال کرتی ہے وہ یہاں نہیں ملتے، وہ باہر سے منگواتی ہے اور بہت قیمتی ۔ بس عین وقت پر مجھے اس آرٹسٹ عورت کا خیال آ گیا تھا اس کے نام کے بجائے میں نے ثمر کہہ دیا۔"

"اگر تم نے صبح اخبار میں تصویروں والا وہ مضمون نہ پڑھا ہوتا تو؟" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے

"تو پھر....." گامے نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یا تو کوئی اور بات ذہن میں آ جاتی یا ں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔"

ثمینہ خاموش رہی۔ چند لمحوں بعد وہ گامے کو بتانے لگی کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ گاما سر رہا تقریباً آدھے گھنٹے بعد کار گلبرگ نہر کے کنارے ماجھے گجر کی کوٹھی کے سامنے رک رہی ٹ بند تھا۔ ثمینہ نے انجن اسٹارٹ ہی رہنے دیا اور گامے کو اشارہ کرتی ہوئی کار سے اتر آئی دونوں نے کارٹن اتار کر گیٹ کے سامنے اس طرح رکھ دیا کہ جس کونے سے خون ٹپک رہا تھا یٹ کھولنے والوں کی نظروں میں نہ آ سکے۔ ثمینہ دوبارہ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی اور گامے ل بیل کا بٹن دبا دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ذیلی دروازہ کھل گیا۔ وہ ماجھے گجر کا نوکر تھا جس نے

دھوتی اور کرتا پہن رکھا تھا سر پر مفلر لپیٹا ہوا تھا۔

"یہ ثمینہ بی بی ہے۔" گامے نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے پہچان لیا ہے تمہیں بھی جانتا ہوں گامے۔" اس شخص نے کہا۔

"ثمینہ بی بی چاہتی ہے کہ ماجھے گجر سے دنگا فساد ختم کر دیا جائے۔ ان کے خیال میں ا ایک دوسرے کا نقصان ہو رہا ہے۔ ثمینہ بی بی ماجھے گجر سے دوستی چاہتی ہے اور ماجھے گجر کے ثمینہ بی بی کی طرف سے دوستی کا یہ پہلا تحفہ ہے ایک دو دن میں وہ خود ماجھے گجر سے ملا کرے گی۔ ثمینہ بی بی کا یہ تحفہ ماجھے گجر کو دے دینا۔" گامے نے گیٹ کے سامنے رکھے ہ کارٹن کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے گامے۔" اس شخص نے کہا۔ "روز روز ایک دوسرے کے ب مارے جا رہے ہیں بتا دوں گا ماجھے استاد کو۔"

"یہ ڈبہ ذرا وزنی ہے اندر سے کسی اور کو بلا لو اکیلے تم سے نہیں اٹھے گا۔" گامے نے کارٹن کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"اس میں ہے کیا یار؟" اس شخص نے پوچھا۔

"پچھلے دنوں ثمینہ بی بی شارق کے ساتھ کراچی گئی تھیں وہاں سے کچھ غیر ملکی چیزیں تھیں۔ انہی میں سی کچھ چیزیں ہیں۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔ ماجھے استاد کو سلام کہنا اور یہ بھی بتا د یہ تحفہ دینے کے لئے ثمینہ بی بی خود آئی تھیں۔"

"تم فکر ہی نہ کرو میں بتا دوں گا۔" اس شخص نے جواب دیا۔

گاما کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا ثمینہ نے اس شخص کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہا دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی چند ہی منٹ بعد ان کی کار ماجھے گجر کی کوٹھی سے بہت دور پہنچ تھی۔

○

اسی رات نو بجے کے لگ بھگ ثمینہ اور شارق حاجی عبداللہ کی سمن آباد والی کوٹھی پر تھے۔ حاجی عبداللہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کے ملازموں نے ان دونوں کو بڑے ا سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا اور انہیں فرج میں سے ٹھنڈی بوتلیں نکال کر پیش کی ملازموں کو غالباً پہلے ہی سے ان کی بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔

حاجی عبداللہ پونے دس بجے کے لگ بھگ آیا تھا۔ اس کے آتے ہی ملازم نے کھانا لگا د کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں کھانے کی میز پر تھے۔ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا

نے ملازم کو بھی باہر بھیج دیا تھا۔

"تم کب تک روانگی کے لئے تیار ہو؟" حاجی عبداللہ نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم تو کسی بھی روز روانہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک معاملہ بالکل دو ٹوک انداز میں طے کر لینا چاہتے ہیں۔" شارق کے بجائے ثمینہ نے جواب دیا۔ "آپ شارق کے بارے میں جانتے ہیں تو میرے بارے میں بھی سب کچھ جانتے ہوں گے۔"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" حاجی عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کراچی والے مشن میں' میں بھی شارق کے ساتھ تھی اور نولکھا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس مشن پر بھی ہم تینوں ساتھ ہوں گے۔ پچھلے مشن میں آپ نے شارق کو جو کمیشن دیا تھا وہ ایسے ہی تھا جیسے کسی بچے سے کوئی کام لینے کی بعد اس کے ہاتھ میں انعام کے طور پر ایک ٹافی تھما دی جائے لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ بالکل واضح طور پر طے ہو جائے۔"

"تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ فیصل آباد کے معاملات اور لاہور میں جو واقعات پیش آئے وہ سب میرے علم میں ہیں۔"

"آپ کی معلومات میں مزید اضافے کے لئے بتا دوں کہ آج صبح بھی میں نے ماجھے گجر کو ایک تحفہ بھیجا ہے اور پولیس بڑی سرگرمی سے میری تلاش کر رہی ہے لیکن اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سے یا کسی اور سے میں بلیک میل ہو جاؤں گی تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اب میں وہ ثمینہ نہیں رہی جو کچھ عرصہ پہلے پولیس سے چھپتی پھر رہی تھی۔ اب مجھے کوئی ڈر خوف نہیں رہا بلکہ اب وقت آگیا ہے کہ لوگ میرے نام سے ڈرا کریں۔"

"گڈ؟" حاجی عبداللہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو۔ کراچی والے مشن کے بعد ڈی کوسٹا نے مجھے جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں بھی تمہاری بڑی تعریف کی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اس مشن میں بھی شارق کے ساتھ جانے کو تیار ہو۔ یہ مشن اگرچہ کراچی والے مشن سے زیادہ خطرناک ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اور شارق پہلے کی طرح کامیاب لوٹو گے بہرحال کیا چاہتی ہو تم؟"

"میرا خیال ہے کراچی والے مشن کا حساب ابھی بے باک نہیں ہوا۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "لیکن اگر اقبال ٹاؤن والی کوٹھی اس کے نام پر ٹرانسفر کروا دیں تو ہم سمجھیں گے کہ پچھلا حساب بے باک ہو گیا اور اگلے مشن کے لئے بھی بات طے ہو جائے گی۔" ثمینہ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اس

کے سامنے رکھ دیا۔

حاجی چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے کاغذ کی وہ چٹ اٹھا لی۔ اس پر کوئی نام وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ اس نے چٹ دوبارہ میز پر رکھ دی۔

"یہ کون ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"شارق کی بہن۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

ثمینہ کے اس جواب پر شارق بھی چونک گیا تھا۔ اس نے چٹ اٹھا کر دیکھا اس پر رضیہ اور اس کے والد کا نام اور اسی کوٹھی کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

"اوہ!" حاجی عبداللہ نے کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ تم اپنے لئے کچھ چاہتی ہو لیکن.....بہرحال۔ میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں میں صبح ہی وکیل کو ہدایت کر دوں گا۔ وہ کل ہی کاغذات تیار کر لے گا۔ ایک ہفتے بعد وہ کوٹھی رضیہ کے نام ٹرانسفر ہو جائے گی۔ اس دوران دیگر قانونی کارروائیاں بھی مکمل کر لی جائیں گی اس کے علاوہ کچھ اور.....؟"

"اور اب اس نئے مشن کے بارے میں بات ہو جائے۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"سو فیصد!" حاجی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مال کتنے کا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"مال اتنا ہے کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ تم دونوں کا کمیشن بن جائے گا۔" حاجی عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا پچاس فیصد ایڈوانس روانگی سے پہلے دینا ہو گا۔" ثمینہ نے کہا۔

"میں تمہیں بہت سیدھی سادھی لڑکی سمجھتا تھا جو غلطی سے پھنس گئی تھی لیکن تم تو بہت زیادہ چالاک ثابت ہو رہی ہو۔" حاجی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھنسی تو غلطی اور دھوکے ہی سے تھی۔" ثمینہ نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن اب مجھے عقل آ گئی ہے۔ مجھے اس فیلڈ میں رہنا ہے اور اب میں کسی کو اپنی سادگی اور معصومیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتی۔"

"اب واقعی تمہیں عقل آ گئی ہے۔" حاجی عبداللہ نے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ تم اس بے باکی اور دیدہ دلیری سے بات کر رہی ہو۔ میں نے ہمیشہ اپنی شرائط پر کام کروایا ہے لیکن مجھے تمہاری تمام شرائط منظور ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تم شارق سے زیادہ کامیاب رہو گی۔ کیوں شارق.... تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟ کیا تم اسے اپنا وکیل بنا کر لائے ہو؟"

"یہ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی۔" شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اب تمہاری باری ہے بولنے کی۔" ثمینہ نے کہا۔ "اب تم حاجی صاحب سے اس منصوبے کی تفصیلات طے کر لو میں خاموشی سے سنتی رہوں گی۔"

"میرا خیال ہے ہم باتوں میں الجھ کر کھانے کو بھول گئے ہیں۔" حاجی عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کھانا شروع کرو باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

وہ تینوں اگرچہ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے لیکن کھانے کی طرف اب تک کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔ حاجی کے کہنے پر سب سے پہلے ثمینہ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور پھر وہ تینوں کھانا کھانے لگے' ساتھ ہی باتیں بھی ہوتی رہیں۔

"تم لوگ یہاں سے پارہ چنار جاؤ گے۔" حاجی عبداللہ کہہ رہا تھا۔ "یہ پاکستان کا علاقہ ہے یہاں آمد و رفت کے لئے کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ پاکستانی اور غیر ملکی سیاح ان علاقوں میں اکثر گھومتے رہتے ہیں۔ پارہ چنار میں تمہاری ملاقات ملک گل رحمان سے ہو گی۔ یہ قصبے کے مرکزی بازار میں ایک دوکان کا مالک ہے جہاں مرچ مصالحہ اور آٹا نمک سے لے کر گولہ بارود تک فروخت ہوتا ہے۔ ملک گل رحمان تم لوگوں کو وہاں سے آگے علی مینگل نامی گاؤں میں پہنچا دے گا۔ وہاں سے آگے درہ پیروار سے تم لوگ سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہو جاؤ گے اور درہ ملا خاک سے ہوتے ہوئے تم لوگوں کو زرغون شہر پہنچا دیا جائے گا جہاں تم لوگ ملک فرید کے مہمان ہو گے۔ ملک فرید خان ہی وہ اصل آدمی ہے جو مال تمہارے حوالے کرے گا۔ مال سرحد میں داخل ہونے کے بعد ملک گل رحمان کے آدمی تمہارے ساتھ ہوں گے اور پھر کراچی تک مال پہنچانا تم لوگوں کی ذمہ داری ہو گی۔ ایک بات میں بالکل واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں۔" حاجی عبداللہ باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھتا رہا' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"یہ مشن کراچی کے مشن سے بہت مختلف ہو گا۔ یہاں قدم قدم پر تم لوگوں کو موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کسی کی جان بھی چلی جائے لیکن تم لوگوں کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم لوگ ہر قسم کی صورت حال سے آسانی سے نمٹ سکو گے۔"

"کراچی کی مہم سے کچھ تجربات حاصل ہوئے ہیں ہم ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔" شارق نے جواب دیا۔

"تو پھر تم لوگ کب روانہ ہو رہے ہو؟" حاجی عبداللہ نے پوچھا۔

"کوٹھی رضیہ کے نام ٹرانسفر ہونے کے اگلے ہی روز ہم اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیں گے۔" شارق سے پہلے ثمینہ بول اٹھی۔

"ٹھیک ہے۔" حاجی عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کا پروگرام معلوم ہونے کے بعد میں اپنے آدمیوں کو اطلاع دے دوں گا۔"

ثمینہ یا شارق نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے یہاں چائے کا دور چلا اور جب وہ لوگ باہر نکل رہے تھے تو بارہ بجنے والے تھے۔

دونوں گاڑیاں پورچ میں کھڑی تھیں۔ آگے سفید ٹویوٹا تھی اور پیچھے حاجی عبداللہ کی ہونڈا ایکارڈ۔ ثمینہ ٹویوٹا کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

"حاجی صاحب۔" وہ حاجی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس گاڑی کے بارے میں تو کوئی فیصلہ ہوا ہی نہیں۔"

"تم تو میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہو رہی ہو لڑکی۔" حاجی عبداللہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ گاڑی میں نے شارق کو دی تھی لیکن لگتا ہے کہ تم شارق کے پاس کچھ نہیں رہنے دو گی' چلو یہ گاڑی تمہاری ہوئی۔"

"شکریہ!" ثمینہ کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ شارق دوسری طرف سے پسنجرز سیٹ پر آ گیا تھا۔ ثمینہ نے انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد حاجی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کار کو پختہ روش پر گھماتی ہوئی گیٹ کی طرف لے آئی۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گیٹ سے کار نکالتے ہوئے ثمینہ نے دو آدمیوں کو لان میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گیٹ کے باہر بھی ایک کار کھڑی تھی اس میں بھی دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب حاجی کے محافظ تھے۔

سمن آباد کی سڑکوں پر سناٹا تھا۔ ثمینہ کسی مین روڈ پر آنے کے بجائے چھوٹی سڑکوں پر ہوتی ہوئی اقبال ٹاؤن کی طرف نکل آئی اور جب اس کی کار کوٹھی کے سامنے رکی تو بارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔

ثمینہ کچھ دیر نیچے ہی ہال میں بیٹھی شارق اور نولکھا سے باتیں کرتی رہی پھر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رضیہ اس کے پلنگ پر کتابیں پھیلائے بیٹھی پڑھائی میں مصروف تھی۔ ثمینہ کو دیکھ کر وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔

"تم اپنا کام کرتی رہو مجھے سونے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور باتھ روم میں گھس کر کپڑے بدلنے لگی۔ چند منٹ بعد وہ پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھی رضیہ کی طرف دیکھ رہی تھی جو اپنے کام میں مصروف تھی۔ ایک بجے کے لگ بھگ رضیہ نے

ہیں سمیٹ کر رکھ دیں اور اپنے کمرے میں جانے لگی تو ثمینہ نے اسے روک لیا۔

"یہیں سو جاؤ۔ اپنے کمرے میں جاؤ گی تو آہٹ سن کر ماں جی کی نیند خراب ہو گی۔ لیٹ ہیں۔"

رضیہ واپس آ گئی۔ اس نے گلے میں لٹکا ہوا دوپٹہ اتار کر کرسی پر ڈال دیا اور بیڈ پر لیٹ ثمینہ نے ٹیوب لائٹ بجھا کر نائٹ بلب جلا دیا اور وہ خود بھی رضیہ کے بستر پر لیٹ گئی۔

"تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے رضیہ۔" وہ رضیہ کی طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔

"کیا...؟" رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں ابھی نہیں ایک ہفتے بعد بتاؤں گی۔" ثمینہ نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" رضیہ نے اسے گھورا۔ "ایک ہفتہ تک آپ مجھے تجسس کی اذیت میں رکھیں گی؟"

"تجسس اور انتظار میں تو مزا ہے۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پلیز باجی!" رضیہ اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔ "بتائیں نا کیا بات ہے؟"

"ایک ہفتہ انتظار کرو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

رضیہ چند لمحے ثمینہ کو گھورتی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں ثمینہ نے اپنا ایک ہاتھ اس سر پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرنے لگی۔

ثمینہ کو اگرچہ صبح کے وقت کوئی کام نہیں ہوتا تھا لیکن وہ ٹھیک چھ بجے اٹھ جایا کرتی تھی۔ بجے وہ ماں جی کو ناشتہ کرواتی اور پھر رضیہ کو اس کی تیاری میں مدد دیتی۔ ناشتہ وہ رضیہ کے ساتھ بیٹھ کر ہی کیا کرتی تھی رضیہ کے یونیورسٹی چلے جانے کے بعد وہ یا تو لان میں بیٹھی اخبار پڑھتی رہتی یا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر دوبارہ اونگھنے لگتی۔

اس روز رضیہ کے جانے کے بعد وہ اخبار لے کر لان میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اخبار کے پہلے صفحہ پر وہ خبر دیکھ کر ثمینہ اچھل پڑی۔ وہ خبر گزشتہ روز ماجھا گجر کو دیئے جانے والے تحفے کے بارے میں تھی۔

"سنگدل حسینہ نے اپنے دشمن کو لاش کا تحفہ پیش کیا۔"

خبر خاصی طویل تھی۔ اخبارات کی رپورٹ کے بیان کے مطابق کل صبح گیارہ بجے کے قریب نہ نامی ایک حسین عورت ماجھا گجر کی کوٹھی پر ایک وزنی کارٹن چھوڑ گئی اور نوکر کو بتایا کہ ماجھا گجر کے لئے تحفہ ہے۔ اس حسینہ کے جانے کے بعد نوکر نے کارٹن اٹھانا چاہا تو اس میں سے خون بہتا ہوا دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے کارٹن کھولا تو اس میں ایک آدمی کی لاش تھی جس کے جسم پر

تشدد کے نشانات تھے۔ ناک' منہ اور کانوں سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔ ماجھا گجر کے نوکر
ہی پولیس کو اطلاع دے دی۔ لاش کی شناخت صدیقے نامی ایک شخص کی حیثیت سے کر لی
جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ باغبانپورہ میں ہیروئن فروخت کرنے کا دھندہ کرتا تھ
اطلاع کے مطابق صدیقے کو پرسوں باغبانپورہ کے علاقے باغیچی سیٹھاں والی سے اغواء کیا
اغواء کرنے والوں میں ایک آدمی اور ایک خوبصورت عورت شامل تھے جو صدیقا کو سفید ر
ایک کار میں لے گئے تھی۔

ایک الگ چھوٹی سی خبر میں اس ٹریفک کانسٹیبل کا بھی بیان تھا جس نے شہر کے ایک چ
پر سفید کار والی اس حسینہ کو دیکھا تھا۔ اس کانسٹیبل نے اپنے بیان میں اس کارٹن کا حوالہ بھی
جو کار سے سڑک پر گر گیا تھا اور اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کانسٹیبل نے
میں کہا تھا کہ اس خوبصورت عورت کے ساتھی نے بتایا تھا کہ وہ عورت ملک کی معروف ہ
مس ثمر ہے لیکن تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ پورے ملک میں اس نام کی کوئی آرٹسٹ نہیں
ریلوے حکام نے بھی اس بات سے انکار کیا ہے کہ انہوں نے مس ثمر نامی کسی خاتون آرٹ
ریلوے اسٹیشن کے بڑے ڈیوڑھے میں کوئی تصویر بنانے کا آرڈر دیا تھا ریلوے حکام کے مطابق
کا اس قسم کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔

پولیس ماجھا گجر سے بھی رابطہ قائم نہیں کر سکی۔ پولیس ذرائع کے مطابق ماجھا گجر بھ
سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب ہے اور عرصہ سے روپوش ہے۔

باکس میں ایک الگ خبر ثمینہ نامی اس پراسرار حسینہ کے بارے میں تھی جو ماجھا گجر کی
پر لاش کا تحفہ چھوڑ کر گئی تھی۔ پولیس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ وہی ثمینہ ہے جو فیصل
پولیس کو قتل کے ایک کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں مطلوب ہے لیکن عرصہ سے لاپتہ ہے۔

ثمینہ نے اس حوالے سے تمام خبریں پڑھ کر اخبار ایک طرف ڈال دیا اس کے ہونٹوں
خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی اخبار نے اسے پراسرار حسینہ' سنگدل حسینہ اور نجانے کیا کیا لکھ
تھا۔

"دوپہر کو کھانے میں کیا پکانا ہے ثمینہ بی بی؟"

ثمینہ شاداں کی آواز سن کر چونک گئی۔ وہ اس سے دو تین قدم کے فاصلے پر کھڑی تھ
ثمینہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھی کہ اسے شاداں کا پتہ ہی نہیں چل سکا تھا۔

"پہلے تم مجھے ایک کپ چائے پلاؤ اس کے بعد سوچا جائے گا کہ دوپہر کے کھانے میں کیا
جائے۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بی بی جی۔" شاداں کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔

لان میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ ثمینہ جس جگہ بیٹھی تھی وہاں ابھی تک سایہ تھا۔ وہ اپنی
جگہ پر بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس وقت وہ کسی اور نظروں سے کوٹھی کا جائزہ لے رہی
تھی کوٹھی واقعی خوبصورت تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ایک ہفتے بعد
جب اس کوٹھی کی ملکیت کے کاغذات رضیہ کو ملیں گے تو مریم اور رضیہ کتنا خوش ہوں گی۔

باغبانپورہ والے مکان میں رہتے ہوئے مریم نے ثمینہ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کہ
وہ شارق کے والدین کی ایک معمولی سی ملازمہ تھی۔ ان کے قتل کے بعد جب شارق سزا بھگت کر
جیل سے باہر آیا تو مریم ہی اس دنیا میں وہ واحد ہستی تھی جس نے شارق کو پیار دیا تھا۔ وہ اسے
اپنی اولاد ہی کی طرح سمجھتی تھی اور شارق بھی اسے ہمیشہ ماں ہی کی طرح عزیز سمجھتا تھا۔ اس نے
اپنے لاابالی پن کی وجہ سے آج تک کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھا سکا تھا۔ ثمینہ اچھی طرح جانتی تھی
کہ شارق کی زندگی پانی کے ایک ایسے بلبلے کی طرح تھی جو کسی بھی وقت پھٹ کر ختم ہو سکتا تھا
اس کے بیسیوں دشمن تھے۔ سب سے بڑا دشمن ماجھا گجر تھا اور پھر پولیس تھی وہ کسی بھی وقت
پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو سکتا تھا یا گولیوں کا نشانہ بن سکتا تھا۔ ایسی صورت میں مریم اور رضیہ
بے سہارا ہو جاتیں۔ شارق کی لاابالی طبیعت دیکھتے ہوئے ثمینہ نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی
تھی کہ اس کے یا شارق کے بعد یہ ماں بیٹی بے سہارا نہ ہو جائیں اس لئے اس نے حاجی عبداللہ
سے رضیہ کے نام کوٹھی ٹرانسفر کرانے کے لئے مطالبہ کیا تھا۔

شاداں چائے لے کر آ گئی۔ ثمینہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی یہی سب کچھ سوچتی رہی۔
اس وقت دس بجنے والے تھے اور جس جگہ ثمینہ بیٹھی ہوئی تھی وہاں بھی اب دھوپ آنے لگی
تھی۔ اس نے شاداں کی طرف دیکھا جو قریب ہی گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہاں تو تمہارا دوپہر کے کھانے کا مسئلہ ہے۔" ثمینہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"روز روز کا یہ مسئلہ تو بڑا پیچیدہ ہے کم از کم میرے بس کی بات نہیں ہے' تم ایسا کرو کہ
ماں جی کی پاس چلی جاؤ.... وہی نمٹ سکتی ہیں اس مسئلے سے۔"

"جی وہ کہتی ہیں ثمینہ بی بی سے پوچھا کرو۔" شاداں نے اس کے ہاتھ سے خالی کپ لیتے
ہوئے کہا۔

"نہیں ماں جی سے ہی جا کر پوچھو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"اچھا جی۔" شاداں کپ لے کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔

ثمینہ اب پودوں کی کیاریوں کے پاس بیٹھ گئی اور کیاریوں میں سوکھے ہوئے پتے نکال نکال کر ایک طرف ڈالنے لگی۔ اسے ایک اور مصروفیت مل گئی تھی۔ کیاریاں صاف کرنے کے بعد اس نے ربر پائپ اٹھا لیا اور پودوں کو پانی دینے لگی لان اور پودوں کو پانی دینا خادم کی ذمے داری تھی۔ وہ روزانہ صبح سویرے پانی دیا کرتا تھا۔ ثمینہ نے کل سے خادم کی ڈیوٹی رضیہ کے ساتھ لگا دی تھی اس طرح کل بھی پانی نہیں دیا جا سکا تھا اور آج بھی..... اس لئے ثمینہ نے یہ ذمہ داری بھی سنبھال لی اور پودوں کو پانی دینے لگی۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ شارق کی آواز سن کر اس نے پائپ گھاس پر ہی چھوڑ دیا اور نلکا بند کر کے اندر آ گئی۔ شارق ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا اور ہال کمرے میں آ کر بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے رات کو گھوڑے بیچ کر سوئے تھے کیا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "کئی روز بعد آج پہلی مرتبہ اس قدر سکون اور اطمینان کی نیند سویا ہوں۔"

"اس سے پہلے کوئی ذہنی الجھن تھی کیا؟" ثمینہ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں۔" شارق بولا۔ "سوچتا رہتا تھا کہ ماں جی یا رضیہ کے نام کوئی جائیداد خرید لی جائے مگر ہمیشہ سوچ کر ہی رہ جاتا تھا لیکن تم نے میری یہ مشکل حل کر دی۔ انہیں کم از کم چھت تو مل جائے گی۔"

"میں انہیں اور بھی بہت کچھ دینا چاہتی ہوں۔" ثمینہ نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "تم تیار ہو کر ناشتہ کرو میں نولکھا کو جگاتی ہوں وہ بھی ناشتہ کر لے تو اسے ایک ضروری کام سے بھیجنا ہے۔"

"نولکھا جاگ رہا ہے ثمینہ بی بی۔"

نولکھا کی آواز سن کر ثمینہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر اسی طرف آ رہا تھا۔

"تم ناشتہ کر کے تیار ہو جاؤ تمہیں ایک کام سے بھیجنا ہے۔ میں اوپر اپنے کمرے میں ہوں تیار ہو جاؤ تو مجھے بتا دینا۔" ثمینہ کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

ایک گھنٹے بعد نولکھا ثمینہ کے سامنے موجود تھا۔

"ہاں ثمینہ بی بی۔" وہ ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا ضروری کام ہے؟"

"تم مزنگ چلے جاؤ' وہاں کی خیر خبر معلوم کرو' گامے سے پتہ کرو کہ وہ اپنا کام کب تک شروع کر رہا ہے۔"

"بہتر ہے ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے جواب دیا۔

"اس سے کہنا کہ جلد سے جلد اپنا بندوبست کرے میں چاہتی ہوں کہ ہمارے افغانستان جانے سے پہلے اس کا کام سیٹ ہو جائے تاکہ ہمارے بعد ان لوگوں کو کوئی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔" ثمینہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے ثمینہ بی بی میں اسے سمجھا دوں گا۔" نولکھا کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

ثمینہ کچھ دیر شارق کے پاس بیٹھی رہی پھر مریم کے کمرے میں آ گئی۔ شاداں سبزی گوشت وغیرہ لینے کے لئے بازار جا چکی تھی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ماں جی!" ثمینہ نے اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن پتہ نہیں اداسی کیوں لگ رہی ہے۔" مریم نے جواب دیا۔

"ایک دو دن بعد اداسی بھی ختم ہو جائے گی۔" پڑوسنوں سے باتیں کر کے دل بہلا رہے گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔ کل بائیں طرف تیسری کوٹھی کے گیٹ پر میں نے آپ ہی کی عمر کی ایک خاتون کو کھڑے دیکھا تھا بظاہر تو وہ بڑی اچھی لگتی ہیں۔ آپ جائیے ان سے ملئے محلے میں جتنے لوگوں سے تعلقات ہوں گے اتنا ہی اچھا ہو گا۔"

"ایک محلے میں پڑوسیوں سے تعلقات بنائے تھے نا! کیا ہوا جس طرح ہم لوگ وہاں سے نکلے ہیں وہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔" مریم نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"مجھے افسوس ہے ماں جی۔" ثمینہ نے کہا۔ "میری وجہ سے آپ کو یہ ذہنی اذیت اٹھانا پڑی۔ لیکن....." وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "وہ پرایا مکان تھا اور ایک نہ ایک دن تو چھوڑنا ہی پڑتا لیکن یہ ..... یہ آپ کا اپنا مکان ہے۔ آپ کا گھر ہے....."

"میرا مکان؟" مریم نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے آپ کے بیٹے کا۔" ثمینہ نے کہا۔

مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ثمینہ بھی خاموش بیٹھی رہی اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی باتوں سے مریم کی اداسی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد نولکھا واپس آ گیا۔ وہ خاصا بدحواس لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے نولکھے خیریت؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت ہی نہیں ہے ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے جواب دیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے جلدی بتاؤ۔" ثمینہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"آج رات پچھلے پہر راجو کو قتل کر دیا گیا ہے' گاما بھی ڈیرے سے غائب ہے۔" نولکھا نے

کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" ثمینہ چیخی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے کہا۔ "میں جب وہاں پہنچا تو ڈیرہ خالی پڑا تھا' ایک جگہ خون کے دھبے دیکھ کر میں چونک گیا' اسی دوران گلی کے دو تین آدمی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ رات کے پچھلے پہر کچھ لوگوں نے ڈیرہ پر حملہ کر دیا تھا جس میں راجو مارا گیا اور گاما غائب ہے۔ شبہ ہے کہ حملہ آور اسے پکڑ کر ساتھ لے گئے ہیں۔ پولیس صبح سویرے وہاں پہنچی تھی انہوں نے راجو کی لاش کو اسپتال بھجوا دیا ہے لیکن اس سے آگے انہوں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔"

"حملہ آور کون ہو سکتے ہیں؟" ثمینہ بڑبڑائی۔

"ماجھے گجر کی پارٹی کی علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔" نولکھا نے جواب دیا۔ "ویسے میں نے پتہ کر لیا ہے۔ ماجھا گجر آج کل راوی کے دوسری طرف اپنی بہن کے گھر میں رہ رہا ہے۔"

"اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔" ثمینہ نے کہا۔ "شارق کہاں ہے؟"

"وہ تو اپنے کمرے میں نہیں ہے' شاداں نے بتایا ہے کہ شارق باؤ تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے باہر گیا ہے۔"

"تمہیں ماجھے گجر کی بہن کا گھر معلوم ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"جی نہیں' لیکن میرا خیال ہے مولوی حمید کو معلوم ہو گا۔ وہ ہمارے ساتھ ملنے سے پہلے کافی عرصہ ماجھا گجر کے ساتھ رہا ہے۔" نولکھا نے جواب دیا۔

"تم اسی وقت جاؤ اور مولوی حمید کو بلا کر لاؤ' اپنے ساتھ لے کر آنا کہنا بہت ضروری کام ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔" نولکھا پھر باہر چلا گیا۔

ثمینہ ہال کمرے میں بیٹھ گئی۔ اس نے شاداں سے کہہ کر چائے منگوائی اور اس تازہ ترین صورت حال کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ مزنگ والے ڈیرے پر حملہ ماجھا گجر ہی نے کیا ہو گا۔ اس نے صدیقے کے قتل کا بدلہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ راجو اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اور گاما لاپتہ تھا گاما اگر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا تو کسی نہ کسی طرح یہاں تک ضرور پہنچ جاتا لیکن وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ ماجھے گجر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ گامے پر ثمینہ کو پورا اعتماد تھا۔ اگر ماجھا گجر اس کی کھال بھی اتار دے تو گاما' شارق اور ثمینہ کے کسی ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتائے گا لیکن ثمینہ کی نظروں میں

سب سے اہم معاملہ یہ تھا کہ گامے کو ان کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

شاداں چائے لے کر آئی تو ثمینہ نے اس سے شارق کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ شارق تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے کہیں چلا گیا تھا اور کچھ بتا کر بھی نہیں گیا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ یا تو ٹیکسی وغیرہ پر گیا تھا یا کہیں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔

دو بجے کے لگ بھگ شارق واپس آ گیا۔ ثمینہ نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ افسردہ سے لہجے میں بولا۔

"مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میں ڈیرے پر ہی گیا تھا اور تھانے بھی۔ پولیس نے نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف رپورٹ درج کر لی ہے۔ انسپکٹر کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حملہ آوروں کے بارے میں جانتا ہے لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کارروائی تو ہم کریں گے۔" ثمینہ نے کہا۔ "راجو مارا گیا' گاما ان لوگوں کے قبضے میں ہے' ہم اسے ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

"تم کچھ زیادہ ہی ایکٹو نہیں ہو رہیں؟" شارق نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کارروائی کس کے خلاف کرو گی؟"

"ماجھا گجر کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ تو نجانے کس بل میں چھپا بیٹھا ہے۔" شارق نے گہرا سانس لیا۔

"میں نے اس بل کا سراغ لگا لیا ہے اور آج رات اسے بل سے باہر نکلنے پر مجبور کر دوں گی۔" ثمینہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟ تم نے اس کا سراغ کیسے لگا لیا' کہاں ہے وہ؟" شارق نے اسے گھورا۔

"دریا کے اس پار اپنی بہن کے گھر میں۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "مولوی حمید یہاں آنے والا ہے اس سے پتہ چل جائے گا کہ اس کی بہن کا گھر کہاں ہے۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد نولکھا اور مولوی حمید آ گئے۔ مولوی حمید نے بتا دیا کہ ماجھا گجر کی بہن کا گھر کہاں ہے۔

"گڈ!" ثمینہ نے کہا۔ "اب یہ تصدیق کرنا باقی ہے کہ ماجھا گجر واقعی وہاں ہے یا نہیں اور یہ کہ اس گھر میں کتنے افراد ہیں۔"

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔" مولوی حمید نے کہا۔ "میرا ایک رشتہ دار اسی علاقے کے زمیندار عبداللطیف کے پاس کام کرتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ماجھے گجر کے بہنوئی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی بہن کو شبہ ہے کہ قتل لطیف اور اس کے آدمیوں نے کیا تھا ان کا کیس عدالت میں چل

رہا ہے۔ میرے رشتہ دار قدیر کا نام بھی مبینہ ملزمان میں شامل ہے قدیر یہ معلوم کر لے گا کہ ماجھا گجر وہاں ہے یا نہیں۔"

"آج شام سے پہلے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"معلوم ہو جائے گا۔" مولوی حمید نے کہا۔ "میں اپنے بھانجے کو بھیج دیتا ہوں وہ شام تک سب کچھ معلوم کر لے گا۔"

"تو ٹھیک ہے تم ابھی چلے جاؤ اور اپنی بھانجے کو وہاں بھیج دو۔" ثمینہ نے کہا۔ "مولوی حمید فوراً ہی رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ثمینہ' شارق اور نولکھا بیٹھے آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد رضیہ بھی یونیورسٹی سے آ گئی اور پھر وہ سب لوگ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

شام چھ بجے کے قریب مولوی حمید آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا بھانجہ سلیم بھی تھا۔

"نولکھے کی اطلاع درست ہے شارق باؤ۔" مولوی حمید نے کہا۔ "ماجھا گجر راوی کے اس پار اپنی بہن کے گھر پر ہی چھپا بیٹھا ہے۔"

"تفصیل سے بتاؤ' وہاں اور کتنے آدمی ہیں۔" ثمینہ نے پوچھا۔

"ماجھے گجر کے علاوہ وہاں تین آدمی اور بھی ہیں باجی۔" مولوی حمید کے بجائے اس کے بھانجے نے جواب دیا۔ "دو آدمی تو اس کے اپنے ہیں اور تیسرا گھر کا نوکر ہے۔"

"گھر کے افراد کتنے ہیں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ماجھے گجر کی بہن اور بھانجی کئی دنوں سے بھینی کی طرف ماجھے کے گاؤں میں ہیں۔ ماجھے نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا ہے۔" سلیم نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات؟ کوئی مزارع وغیرہ؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دس بارہ مزارع ہیں جی لیکن ان کے گھر پانچ چھ کھیتوں کے فاصلے پر ہیں۔" سلیم نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "ایک بات اور ہے باجی' وہاں دو کتے بھی ہیں سنا ہے بڑے خوں خوار کتے ہیں۔"

"کتوں کی ہمیں پرواہ نہیں یہ بتاؤ وہ مکان کہاں پر واقع ہے۔" ثمینہ نے پوچھا۔

"راوی کا پل ختم ہوتے ہی ایک سڑک بائیں طرف مڑتی ہے اسی سڑک پر تقریباً ایک میل آگے دائیں طرف سڑک سے ذرا ہٹ کر ماجھے گجر کی بہن کا مکان ہے۔ وہیں سے اس کی زمینیں شروع ہوتی ہیں۔" سلیم نے جواب دیا۔

"کیا تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"چلا جاؤں گا۔" سلیم نے مولوی حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" مولوی حمید نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

"ہم تمہارے بھانجے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔" ثمینہ نے مولوی حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم آٹھ بجے سے پہلے پہلے دو آدمیوں کا بندوبست کرو' آدمی بھروسے کے ہونے چاہئیں بھاگنے والے نہ ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔" مولوی حمید نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں شارق باؤ کے آدمیوں میں ایسا کوئی بھی نہیں ہے جو کسی موقع پر بھاگنے کا سوچ سکے۔"

"ٹھیک ہے سلیم ہمارے پاس ہی رہے گا تم ان آدمیوں کو لے آؤ یا ایسا کرو کہ ان آدمیوں کو یہاں لے کر آنے کے بجائے راوی پل کے پیٹرول پمپ کے قریب ہمارا انتظار کرو ہم نو بجے کے قریب وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے ثمینہ بی بی۔" مولوی حمید نے جواب دیا۔

مولوی حمید کے جانے کے بعد ثمینہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"نولکھا تم میرے ساتھ چلو حویلی کی چابیاں تو گامے کے پاس تھیں دوسری چابیاں کہاں ہیں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے نولکھا کی طرف دیکھا۔

"شارق باؤ کے پاس ہوں گی۔" نولکھا نے کہا۔

شارق نے سوٹ کیس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر ثمینہ کی طرف اچھال دیا۔ ثمینہ نے چابیوں کا گچھا ہوا ہی میں دبوچ لیا اور میز پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھا کر نولکھا کو اشارہ کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ مڑی اور شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں آ جائیں گے۔"

وہ دونوں باہر آ گئے۔ ثمینہ حسب معمول اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھی تھی اور نولکھا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ گلیوں سے نکل کر سڑک پر آتے ہی ثمینہ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

وہ پینتیس منٹ میں ٹھوکر نیاز بیگ والی حویلی پہنچ گئے نولکھا نے اٹھ کر گیٹ کھولا اور ثمینہ گاڑی کو اندر لیتی چلی گئی۔ وہ گاڑی روک کر نیچے اتری تو نولکھا بھی گیٹ بند کر کے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"پچھلے کمرے کا دروازہ کھولو...." ثمینہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

نولکھا نے پہلے باہر والا دروازہ کھولا اور بتی جلا کر اندر داخل ہو گیا۔ ثمینہ بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔ حویلی کے تمام کمروں میں سیلن کا احساس نمایاں تھا۔ حویلی کے کمرے عرصہ سے بند پڑے ہوئے تھے اور یہ لوگ بھی کبھی کبھار ہی یہاں آتے تھے اور صرف باہر والا ایک ہی کمرہ استعمال ہوتا تھا' باقی کمرے بند رہتے تھے جس سے سیلن سی ہو رہی تھی۔

آخری کمرے میں اسلحہ کی پیٹیاں تھیں۔ ثمینہ نے وہ پیٹی کھلوا لی جس میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ جب سے یہ اسلحہ یہاں رکھا گیا تھا اس کے بعد یہ کمرہ آج کھولا گیا تھا۔

"کتنی رائفلیں نکالوں بی بی؟" نولکھا نے پوچھا۔

"پانچ نکال لو... اور دو دو میگزین فالتو نکال لینا۔" ثمینہ نے کہا۔

نولکھا پیٹی سے رائفلیں نکال کر چیک کرتا رہا تمام رائفلیں نئی تھیں۔ رائفلیں چیک کرنے کے بعد اس نے میگزین بھی نکال لئے۔ ایک ایک میگزین تو رائفلوں میں فٹ کر دیا گیا اور باقی تھیلے میں ڈال لئے گئے۔

"ٹھیک ہے اب چلو۔" ثمینہ نے کہا۔

ایک رائفل اور میگزینوں والا تھیلا ثمینہ نے اٹھا لیا اور تین رائفلیں نولکھا نے اٹھا لیں۔ رائفلیں گاڑی کی ڈگی میں رکھنے کے بعد نولکھا نے دوبارہ اندر جا کر تمام کمروں کے دروازے بند کر کے تالے لگا دیئے اور باہر آ کر پھاٹک کھول دیا۔ ثمینہ کے گاڑی نکالنے کے بعد اس نے پھاٹک بند کر دیا اور گاری میں آ کر بیٹھ گیا۔

ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ وہ کوٹھی واپس پہنچ چکے تھے۔

"ہم لوگ ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔" ثمینہ نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خادم سے دوسری گاڑی کی چابیاں لے لو ہم دونوں گاڑیاں لے کر جائیں گے۔"

ثمینہ اوپر چلی گئی اور شارق اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ چند روز سے ثمینہ بڑی ایکٹو ہو گئی تھی۔ ہر وقت ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہنی والی لڑکی اب بہت بے باک اور نڈر ہو گئی تھی اور غیر محسوس انداز میں گروہ کے آدمیوں پر کنٹرول حاصل کرتی جا رہی تھی۔ دو روز پہلے اس نے حاجی عبداللہ سے جس بے باکی اور دبنگ لہجے میں بات کی تھی اس پر شارق کو بھی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے شارق کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ ثمینہ نے اب پوری طرح حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور آہستہ آہستہ کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ ماجھا گجر کو لاش کا تحفہ بھیجنا اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے دل سے سارا خوف دور ہو گیا تھا اور اخبارات بھی اب اسی کو اہمیت دینے لگے تھے۔ اخبارات نے

اسے پراسرار حسینہ اور سنگدل حسینہ جیسے خطابات دیئے تھے اور دو دن سے اس کے بارے میں مسلسل خبریں شائع ہو رہی تھیں اور اب وہ جو کچھ کرنے جا رہی تھی اس کا بھی شارق کو اندازہ تھا۔

ماجھا گجر کے کسی ٹھکانے پر حملہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی' لیکن ثمینہ نے اس کے بارے میں جس طرح معلومات جمع کی تھیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس قسم کی کارروائیوں کی منصوبہ بندی میں بھی اناڑی نہیں ہے۔

گھر میں کھانا عام طور پر ساڑھے نو بجے کھایا جاتا تھا اور ابھی آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ ثمینہ نے چائے بنوائی تھی۔ چائے پیتے ہوئے وہ اوپر اپنے کمرے یں آ گئی رضیہ اسی کمرے میں تھی۔ رضیہ اب مستقل طور پر اسی کے کمرے میں رہ رہی تھی اور حسب معمولی پلنگ پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے ثمینہ باجی آج گھر میں کچھ عجیب سی ہلچل نظر آ رہی ہے؟" رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"لوگوں کی آمد و رفت اور آپ کی بھاگ دوڑ... مجھے تو کوئی گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔" رضیہ نے اسے گھورا۔

"ارے کوئی خاص بات نہیں ہے' دراصل ہم لوگ ایک جگہ ضروری کام سے جا رہے ہیں کچھ انتظامات کرنے تھے اس لئے ان لوگوں کو بلایا تھا۔" ثمینہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "اچھا ہم لوگ جا رہے ہیں کھانے پر ہمارا انتظار مت کرنا دیر ہو جائے گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" رضیہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

ثمینہ نیچے آ گئی اور پھر چند ہی منٹ بعد وہ دونوں کاروں پر کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ مولوی حمید کا بھانجا سلیم' ثمینہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور نولکھا پچھلی سیٹ پر تھا۔ شارق اکیلا ہی تھا۔ ثمینہ نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ راوی کے پل کے ساتھ والے پیٹرول پمپ پر پہنچ جائے۔

یہ لوگ سوا آٹھ بجے کے لگ بھگ کوٹھی سے نکلے تھے مین روڈ پر آ کر شارق نے اپنی گاڑی کسی اور راستے پر موڑ لی تھی۔

وہ لوگ تین چار منٹ کے وقفے سے پیٹرول پمپ پر پہنچے تھے۔ مولوی حمید کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں کو لے کر نو بجے یہاں پہنچ جائے۔ ابھی نو بجنے میں پانچ منٹ تھے اور مولوی حمید کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ان کی گاڑیاں پیٹرول پمپ سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھیں۔ نو بج گئے پھر دس منٹ اوپر ہو گئے مولوی حمید کا کوئی نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ثمینہ بے چین سی ہونے لگی۔ اس نے مولوی حمید کے بھانجے سلیم کی طرف دیکھا وہ بھی کچھ بے چین سا دکھائی دے رہا تھا۔

"سلیم تم نیچے اتر کر ادھر ادھر دیکھو وہ لوگ کہیں اور نہ کھڑے ہوں۔"

سلیم نیچے اتر گیا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ سلیم کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کا دراز قامت اور خوبرو نوجوان تھا۔ مولوی حمید کے کہنے کے مطابق وہ ایک مقامی کالج میں فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ثمینہ اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اسے محض مکان کی نشاندہی کے لئے ساتھ لیا گیا تھا اس سے زیادہ وہ اس سے کوئی کام نہیں لینا چاہتی تھی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد مولوی حمید بھی اپنے آدمی لے کر پہنچ گیا۔ وہ دونوں آدمی شکلوں ہی سے خونخوار لگ رہے تھے۔ دونوں شارق کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور سلیم دوبارہ ثمینہ کی گاڑی میں آ گیا۔ مولوی حمید واپس چلا گیا تھا۔

اس مرتبہ ثمینہ کی گاڑی آگے تھی اور شارق کی پیچھے۔ راوی کا پل پار کر کے سلیم کے اشارے پر ثمینہ نے گاڑی بائیں طرف ایک چھوٹی سی سڑک پر موڑ لی۔ اس سڑک پر کھجور کے چند درخت تھے لیکن اس سے آگے ناریل کے درخت تھے۔

سڑک پر بائیں طرف کچھ فاصلے پر راوی بہہ رہا تھا اور دائیں طرف ڈھلان میں کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ثمینہ نے گاڑی روک لی۔ شارق کی گاڑی بھی اس کے پیچھے ہی رکی تھی۔ ثمینہ نے گاڑی کا انجن بند کر کے چابیوں کا گچھا نولکھا کی طرف بڑھا دیا نولکھا کو اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے نیچے اتر کر ڈگی کھولی اور شارق اور اس کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کو ایک ایک رائفل اور فاضل میگزین تھما دیئے۔ ایک رائفل اس نے اپنے پاس رکھ لی اور ایک ثمینہ کی طرف بڑھا دی۔ ثمینہ نے رائفل پیروں کے قریب رکھ لی اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"اب ذرا دھیان رکھنا سلیم۔" ثمینہ نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ ہو ہم کسی اور طرف نکل جائیں۔"

"چودھرانی کا مکان میں نہیں بھول سکتا۔" سلیم نے جواب دیا۔ "میں اکثر قدیر چاچا کے پاس آتا رہتا ہوں اور یہی راستہ استعمال کرتا ہوں۔"

گاڑیوں کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ مزید نصف میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد سلیم نے

دائیں طرف نشیب میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کچا راستہ اسی مکان کی طرف جاتا ہے۔ وہ جلتا ہوا بلب دیکھ رہی ہیں آپ وہی مکان ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ثمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اس نے گاڑی نہیں روکی تھی۔ نصف میل کا فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی روک لی اور انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آئی۔

"وہ مکان میں نے جان بوجھ کر پیچھے چھوڑ دیا ہے شارق۔" ثمینہ نے شارق کی کار کے قریب پہنچ کر کہا۔ "یہاں سے ہم واپس مڑیں گے۔ گاڑی کی تمام بتیاں بجھی ہوئی ہوں گی۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ کرنا ہو گا وہ تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔"

ثمینہ دوبارہ اپنی کار میں آ گئی۔ پہلے اس نے اپنی کار موڑی اس کے پیچھے شارق نے بھی کار موڑ لی۔ مکان کے سامنے سڑک پر پہنچ کر ثمینہ نے کار روک لی شارق کی کار بھی اس کے پیچھے ہی رک گئی۔ وہ سب لوگ نیچے اتر آئے۔

"تم کار ہی میں بیٹھے رہو گے سلیم۔" ثمینہ نے کہا۔ "ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ نشیب کی طرف دیکھنے لگی۔ مکان وہاں سے تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ایک جلتا ہوا بلب نظر آ رہا تھا۔ ثمینہ کچھ دیر تک مکان کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ سب مکان کی طرف جانے والے کچے راستے پر اترنے لگے۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر پہنچ کر وہ رک گئے اور پھر ثمینہ کے اشارے پر وہ مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ نولکھا، ثمینہ کے ساتھ تھا۔

انہوں نے مکان کو اس طرح گھیرے میں لے لیا تھا کہ اگر کوئی فرار ہونے کی کوشش کرتا تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ثمینہ نولکھا کو اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی دفعتاً ایک کتے کی غراہٹ سن کر وہ دونوں رک گئے۔ ٹھیک اسی لمحہ مکان کے دوسری طرف سے بھی ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دینے لگی اس کے ساتھ ہی فضا گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔

"یہ گولی کس احمق نے چلائی ہے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا بھی تھا کہ جب تک مخالف سمت سے فائر نہ ہو گولی نہ چلائی جائے۔" ثمینہ نے نولکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گولی مکان کے اندر سے چلائی گئی ہے ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے مکان کے دوسری طرف ہمارے کسی آدمی کو دیکھ لیا گیا ہے۔"

ثمینہ ابھی کوئی جواب نہ دینے پائی تھی کہ فضا گولیوں کی مسلسل تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی جس کا مطلب تھا کہ باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ جو کتا ان دونوں کو دیکھ کر غرایا تھا اس

نے بھی اب بھونکنا شروع کر دیا تھا نولکھا نے فائر کر دیا۔ کتا چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

مکان کے اندر سے اب زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ ثمینہ اور اس کے ساتھی جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک آدمی مکان سے نکل کر دوڑتا ہوا نظر آیا۔ ثمینہ نے فا کھول دیا۔ وہ شخص چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

ثمینہ کے ساتھی گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مکان میں ایک جگہ اچانک ہی آگ بھڑکتے دیکھ ثمینہ چونک گئی غالباً کوئی گولی آنگن میں خشک بھوسے وغیرہ کے ڈھیر میں لگی تھی جس نے آگ پ لی تھی۔ اس طرف سے مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ثمینہ نے نولکھا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں فائرنگ کرتے ہوئے مکان کی طرف دوڑے۔ نولکھ نے رائفل کے بٹ مار کر ایک کھڑکی توڑ دی۔ پہلے اس نے کمرے میں ایک برسٹ مارا اور پھ کھڑکی پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ ثمینہ نے بھی اس کے پیچھے کمرے میں کودنے میں دیر نہیں لگا تھی۔

اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ثمینہ دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی آنگن میں لگی ہوئی آگ شیڈ لپیٹ میں لے چکی تھی اور رہائشی کمروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً دائیں طرف آہٹ س کر ثمینہ بڑی پھرتی سے نیچے گر گئی اور ٹھیک اسی لمحہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ اس کے اوپر سے گز گئی' اگر اسے گرنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جاتا۔ ا نے بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا۔ رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور اس فائرنگ کرنے والا شخص بھی چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

ثمینہ دندناتی ہوئی اسی کمرے میں گھس گئی جس کمرے سے وہ شخص باہر آیا تھا اور پھ دوسرے ہی لمحہ اسے چونک جانا پڑا' گاما کمرے میں فرش پر بندھا ہوا پڑا تھا۔ ثمینہ نے چیخ کر نولکھ کو بلا لیا۔

"اسے دیکھو.... میں دوسرے کمرے میں جا رہی ہوں۔ بہتر ہو گا کہ اسے لے کر باہر چ جاؤ.... جلدی کرو۔" ثمینہ چیخی۔

سلیم کی اطلاع کے مطابق اس مکان میں چار آدمی تھے۔ ایک ماجھا گجر' دو اس کے آدمی او چھوٹا گھر کا ملازم.... دو آدمی مارے جا چکے تھے۔ ماجھا گجر اور ایک آدمی بچ گیا تھا۔ ثمینہ ایک او کمرے میں داخل ہوئی تو ادھیڑ عمر کا ایک آدمی کمرے کے کونے میں دبکا کانپ رہا تھا۔ وہ بے خوفزدہ تھا۔

"مجھے مت مارو.... خدا کے لئے مجھے مت مارو میں بے قصور ہوں۔" وہ آدمی ہاتھ جوڑ

چیخا۔

ثمینہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ نوکر تھا۔

"اس کھڑکی سے کود کر بھاگ جاؤ.... جلدی کرو۔" ثمینہ چیخی۔

وہ شخص کھڑکی پر چڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی اور کھیتوں کی طرف دوڑنے لگا۔ ثمینہ ایک اور کمرے میں پہنچی تو ایک اور آدمی کھڑکی سے کودتا ہوا نظر آیا۔ ثمینہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ماجھا گجر تھا۔ ثمینہ نے بھی اس کی پیچھے چھلانگ لگا دی۔

ماجھا گجر کھیتوں میں پہنچ چکا تھا' ثمینہ اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔

"رک جاؤ ماجھے ورنہ چھلنی کر دوں گی۔" ثمینہ چیخی' اس کے ساتھ ہی اس نے ماجھے سے ذرا ہٹ کر ایک برسٹ مار دیا تھا۔

ماجھا گجر لڑکھڑا کر گرا ثمینہ اس کی سر پر پہنچ چکی تھی۔

"اٹھو بے غیرت۔" ثمینہ اسے رائفل کی زد پر لی کر چیخی۔

"تت..... تم....." ماجھا گجر ہکلا کر رہ گیا۔

"ہاں میں۔" ثمینہ غرائی۔ "شارق تو اب تک تمہارا لحاظ کرتا رہا تھا لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی' تمہیں ایسی سزا دوں گی کہ تم نہ مر سکو گے اور نہ ہی اپنے آپ کو زندوں میں شمار کر سکو گے۔"

"مم... مجھے معاف کر دو ثمینہ..... میں...." ماجھا گجر نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"یہی تمہاری بے غیرتی کی نشانی ہے۔" ثمینہ بولی۔ "اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو ایک عورت کے سامنے اس طرح ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک نہ مانگتے۔"

ثمینہ نے رائفل کی نال ذرا سی جھکا کر ٹرائیگر دبا دیا کئی گولیاں ماجھے گجر کی دونوں ٹانگوں میں پیوست ہو گئیں وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

"مجھے امید ہے کہ تم مرو گے نہیں۔" ثمینہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر مر بھی گئے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ زندہ رہو گے تو پھر تم سے ملاقات ہو گی۔"

ثمینہ تیزی سے واپس دوڑی' مکان کا بہت سا حصہ اب آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ ثمینہ نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا اور سڑک کی طرف دوڑنے لگی۔

اس کے ساتھی بھی تقریباً اس کے ساتھ ہی سڑک پر پہنچے تھے۔ نولکھا پہلے ہی گامے کو لے کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا وہ سب اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ گئے اور دوسرے ہی لمحہ کاریں

حرکت میں آکر بڑی تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگیں۔

○

اس واقعہ نے پورے شہر میں سنسنی اور ہلچل سی مچا دی تھی۔ ماجھا گجر کی بہن کا وہ گ
اگرچہ ضلع لاہور کی حدود سے باہر تھا لیکن ماجھا گجر اور بھاگ جانے والے نوکر کے بیان کے حوا
سے اسے انہی واقعات کی ایک کڑی قرار دیا گیا جو ایک تسلسل سے لاہور شہر میں رونما ہو ر
تھے۔

ماجھا گجر بچ گیا تھا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھیں اور اس کی
بچانے کے لئے ڈاکٹروں کو گھٹنوں کے قریب سے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑی تھیں۔ ہوش میں
آنے کے بعد اس نے جو بیان دیا تھا اس میں اس نے ثمینہ کو اس کارروائی کا ذمہ دار قرار دیا تھا
اس کی بہن کا ادھیڑ عمر نوکر جسے خود ثمینہ نے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ بھاگ کر قریبی تھانے میں
پہنچ گیا تھا وہ شاہدرہ تھانے کا علاقہ تھا اس نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ مکان پر حملہ کرنے والے
آدمی تھے اور ان کی لیڈر ایک خوبصورت لڑکی تھی اور اسی لڑکی نے اسے بھاگنے کا موقع دیا تھا۔

اس کارروائی میں ماجھا گجر کے دو آدمی مارے گئے تھی مکان مکمل طور پر جل گیا تھا اور پا
چھ مویشی بھی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔

اخبارات نے ایک بار پھر اس پراسرار اور سنگدل حسینہ کے قصے چھاپنا شروع کر دیئے تھے
ایک اخبار نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ثمینہ نامی یہ حسینہ خود کسی کی بے رحمی کا شکار ہوئی ہے
اور اب اپنا انتقام لے رہی تھی' لیکن بعض لوگوں کے لئے یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ انتقام
کے لئے وہ صرف ماجھا گجر اور اس کے گروہ ہی کو نشانہ کیوں بنا رہی تھی۔

ماجھا گجر اسپتال میں تھا اور پولیس کی حراست میں تھا۔ اس کے خلاف لاہور کے کئی تھانوں
میں سنگین نوعیت کے مقدمات درج تھے۔ ثمینہ سوچ رہی تھی کہ اگر پولیس دیانت داری سے
لے تو ماجھے کو ان مقدمات میں اتنی سزا ہو سکتی تھی کہ ایک اور جنم لینے کے بعد بھی وہ رہا
حاصل نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسے معاملات میں پولیس کیا کرتی ہے اور ان کا اصل
مقصد کیا ہوتا ہے۔

اخبارات کی اطلاع کے مطابق پولیس اس پراسرار اور سنگدل حسینہ کی تلاش میں پورے
لاہور میں چھاپے مارتی پھر رہی تھی۔ دوسرے دن کے اخبار میں یہ سنسنی خیز خبر شائع ہوئی کہ
کی تلاش میں پولیس نے اس کے باپ کے گھر پر چھاپہ مارا تھا اور اس کے باپ اور بھائی کو
گچھ کے لئے حراست میں لے لیا تھا۔ پولیس کسی طرح یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی

یہ پراسرار حسینہ وہی ثمینہ ہے جو قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں فیصل آباد پولیس کو بھی مطلوب ہے اور طویل عرصہ سے روپوش ہے۔

یہ خبر پڑھتے ہی ثمینہ کانپ اٹھی۔ رگوں میں اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی وجہ سے پہلے کیا کم ذلت اٹھائی تھی کہ اب پولیس نے اس کے باپ اور بھائی کو حراست میں لے لیا تھا۔

یہ خبر پڑھنے کے بعد ثمینہ دیر تک سنسنی کی سی کیفیت میں مبتلا رہی پھر اٹھ کر اس صوفے پر بیٹھ گئی جس کے قریب سائیڈ ٹیبل پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے۔ شارق وغیرہ سو رہے تھے۔ رضیہ یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ثمینہ نیچے والے ہال میں تھی۔ اس نے چائے پیتے ہوئے اخبار اٹھا لیا تھا اور یہ خبر پڑھ کر وہ بدحواس ہو گئی تھی۔

اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ رضیہ کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"آج تم جلدی تیار ہو گئیں کیا بات ہے؟" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی ایک دوست کو گھر سے لینا ہے۔ اس کا گھر ہمارے راستے سے ذرا ہٹ کر ہے اس لئے میں جلدی نکلنا چاہتی ہوں۔" رضیہ نے کہا اور شاداں کو آواز دے کر ناشتہ لگانے کو کہا۔

"آج تو تم اکیلی ہی ناشتہ کرو۔" ثمینہ نے کہا۔ "میں نے ابھی ابھی چائے پی ہے اس لئے اس وقت ناشتہ کو بالکل جی نہیں چاہ رہا۔"

"کوئی بات نہیں آج اکیلے ہی سہی۔" رضیہ کہتی ہوئی میز پر بیٹھ گئی۔

شاداں نے اس کے سامنے ناشتہ لگا دیا اور رضیہ ناشتہ کرنے لگی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ اپنی کتابیں اٹھا کر جانے لگی تو ثمینہ نے کہا کہ کار میں پیٹرول ڈلوا لے۔

رضیہ کے جانے کے بعد ثمینہ نے پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا اور اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگی جس علاقے کی پولیس نے اس کے باپ کے گھر پر چھاپہ مارا تھا۔ لائن ملنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

"ہیلو کون بول رہا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"میں تھانہ محرر عبدالخالق بول رہا ہوں' آپ کون ہیں بی بی کس سے بات کرنی ہے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"ایس ایچ او سے۔" ثمینہ نے کہا۔

"ایس ایچ او صاحب تو ابھی تک نہیں آئے کوئی پیغام...."

"میری بات غور سے سنو مسٹر محرر۔" ثمینہ نے کہا۔ "میرا نام ثمینہ ہے' وہی پراسرار اور سنگدل حسینہ جس کی تم لوگوں کو تلاش ہے تم لوگوں نے...."

"ایک منٹ...." محرر نے کہا۔ "ایس ایچ او صاحب آ گئے ہیں آپ ان سے بات کر لیں۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"ایس ایچ او بول رہا ہوں تم کون ہو بی بی؟"

"وہی پراسرار اور سنگدل حسینہ جس کی تمہیں تلاش ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "میری تلاش میں تم جگہ جگہ چھاپے مار کر شریف لوگوں کو پریشان کر رہے ہو۔ کل میرے والد اور بھائی کو حراست میں لے لیا۔ میری ایک بات غور سے سن لو آفیسر' میرے گھر والے میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے' میں عرصہ سے ان سے لاتعلق ہوں میں نے تمہیں اس لئے فون کیا ہے کہ میرے باپ اور بھائی کو چھوڑ دو میں تمہیں صرف دو گھنٹے کی مہلت دے رہی ہوں اگر دو گھنٹے بعد میرا باپ اور بھائی باعزت طور پر گھر نہ پہنچے تو تمہارا حشر ماجھا گجر سے بھی برا ہو گا یہ محض دھمکی نہیں ہے میں جو کچھ کہتی ہوں اس پر عمل بھی کرتی ہوں۔ تمہیں اپنی کھال بچانے کے لئے صرف دو گھنٹے کی مہلت دے رہی ہوں اس کے بعد تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

ثمینہ نے فون بند کر دیا' اس نے دوسری طرف سے ایس ایچ او کی آواز سننے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے ایس ایچ او کو دھمکی تو دی تھی لیکن اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس کی دھمکی کا کوئی اثر لے گا۔

دو کے بجائے ڈھائی گھنٹے بعد اس نے پھر فون کیا اس مرتبہ بھی کال پہلے محرر نے ریسیو کی تھی پھر ایس ایچ او کی آواز سنائی دی۔

"تمہارے باپ اور بھائی کو ہم اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہیں کر دیتیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا معاملہ ہے کس کو انجام کی دھمکیاں دے رہی ہو؟"

شارق کی آواز سن کر ثمینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شارق ہال کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا وہ غالباً ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا۔

"پولیس نے ابو اور میرے بھائی ندیم کو حراست میں لے لیا ہے۔ انسپکٹر سے بات کر رہی تھی وہ ابو اور ندیم کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ پولیس والے اپنے آپ کو پتہ نہیں فرعون کیوں سمجھ لیتے ہیں۔ جس کو دل چاہا پکڑ لیا ویسے کیا۔ اس انسپکٹر کو جانتے ہو؟" ثمینہ نے کہا۔

"کونسا انسپکٹر؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ثمینہ نے پولیس اسٹیشن کا نام بتایا تو شارق نے کہا۔

"انسپکٹر شفیق! وہ سیالکوٹ کا رہنے والا ہے' اس کے بیوی بچے لاہور ہی میں ہیں۔ والدین اور دوسرے رشتہ دار سیالکوٹ ہی میں رہتے ہیں۔"

"گڈ۔" ثمینہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ "اب اسے میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اس نے تمہارے ڈیڈی اور بھائی کو حراست میں لیا ہے۔" شارق نے پوچھا۔

ثمینہ نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ شارق اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے۔

"کیا کرنا چاہتی ہو؟" اس نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "نولکھا اٹھ جائے تو پروگرام بناتے ہیں۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد ثمینہ اور نولکھا کار پر باہر چلے گئے۔ ان کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ تقریباً آٹھ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ اس بچے کے جسم پر کسی اسکول کی یونیفارم تھی اور گلے میں اسکول بیگ بھی تھا۔ ثمینہ نے ایک چادر بچے کو اس طرح اوڑھا رکھی تھی کہ وہ راستہ نہ دیکھ سکے۔ گھر میں آتے ہی وہ بچے کو لے کر ایک کمرے میں گھس گئی اور ٹیلی فون بھی وہیں لے آئی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا اتفاق سے اس مرتبہ کال انسپکٹر شفیق ہی نے ریسیو کی تھی۔

"انسپکٹر شفیق..." ثمینہ نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔ "تمہارا بیٹا اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ اگر تم اس کی زندگی چاہتے ہو تو پندرہ منٹ کے اندر اندر میرے باپ اور بھائی کو چھوڑ دو بصورت دیگر آدھے گھنٹے بعد تمہیں شہر کی کسی سڑک پر اپنے بیٹے کی لاش مل جائے گی۔"

"کیا بکتی ہو!" جواب میں انسپکٹر کی دھاڑ سنائی دی۔

"لو..... پہلے اپنے بیٹے سے بات کر لو تاکہ تمہیں یقین آ جائے۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے ریسیور بچے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بچے نے ایک دو جملے کہے تھے کہ ثمینہ نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ "اپنے بیٹے کی آواز سن لی انسپکٹر۔ اب تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں اگر

پندرہ منٹ بعد مجھے اپنے آدمی کی کال نہ ملی تو تمہارے بیٹے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

ٹھیک پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی' ثمینہ نے ریسیور اٹھا لیا۔

"یس؟" وہ ماؤتھ پیس میں بولی۔

"مولوی حمید بول رہا ہوں ثمینہ بی بی۔" ریسیور پر آواز سنائی دی۔ "ابھی ایک منٹ پہلے آپ کے والد اور بھائی تھانے سے نکلے ہیں' وہ کچھ دور جا کر تانگے میں بیٹھ گئے تھے..... جی ہاں..... ان کے چہروں سے لگتا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کی گئی ہے لیکن بہرحال انہیں پولیس سے نجات مل گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ابھی وہیں رہو اور انسپکٹر شفیق پر نگاہ رکھو۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور نولکھا کی طرف دیکھ کر بولی۔ "چلو نولکھے اس بچے کو بھی چھوڑ آئیں۔"

ثمینہ نے بڑی جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ نولکھا کے ساتھ وہ بچے کو ساتھ لے کر انسپکٹر شفیق کے مکان پر پہنچ گئی۔ اسے یقین تھا کہ انسپکٹر تھانے میں بیٹھا اس کے فون کا انتظار کر رہا ہو گا۔ مکان کے سامنے گاڑی روک کر اس نے بچے کو نیچے اتارا ہی تھا کہ مکان کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر کی عورت باہر نکلی' وہ انسپکٹر شفیق کی بیوی تھی۔

"یہ بچہ ہمیں بھٹکا ہوا مل گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم اس سے گھر کا پتہ پوچھتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں' خدانخواستہ کسی بردہ فروش کے ہاتھ لگ جاتا تو آپ لوگ زندگی بھر روتے رہتے۔ بچوں کے بارے میں ذرا محتاط رہا کریں۔" ثمینہ نے کار سے اتر کر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عورت نے دوڑ کر بچے کو لپٹا لیا۔

"شکریہ بہن۔" وہ ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

ثمینہ کار میں آ کر بیٹھ گئی اور اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔ کار گلی کے موڑ پر پہنچی تھی کہ پولیس کی جیپ موڑ گھوم کر سامنے آ گئی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے انسپکٹر شفیق بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سرسری انداز میں کار میں بیٹھی ہوئی ثمینہ کی طرف دیکھا اور جیپ کو سائیڈ سے نکال لے گیا۔

ثمینہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ گلی سے نکلتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی اور چند منٹ کے اندر اندر وہ اس جگہ سے بہت دور نکل چکی تھی۔

ثمینہ کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اپنے گھر جا کر اپنے باپ' بھائی اور دیگر افراد خانہ سے ہمدردی کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس واقعہ نے اسے ایک بار پھر افسردہ کر دیا تھا اس کی وجہ سے

اس کے ماں باپ کو ایک بار پھر ذلت اٹھانا پڑی تھی۔ پولیس نے جب اس کے گھر پر چھاپہ مارا ہو گا اور پولیس والے اس کے باپ اور بھائی کو لے کر گئے ہوں گے تو ان بے چاروں کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اس نے بہرحال یہ طے کر لیا تھا کہ انسپکٹر شفیق کو معاف نہیں کرے گی۔"

پولیس پراسرار اور سنگدل حسینہ کی تلاش میں چھاپے مارتی رہی اور اخبارات اس کے بارے میں سنسی خیز خبریں چھاپتے رہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ جس رات شارق اور ثمینہ نے حاجی عبداللہ سے ملاقات کی تھی اس کے دو دن بعد حاجی عبداللہ کی طرف سے کوٹھی کے سلسلے میں اخبار میں اشتہار بھی شائع ہوا تھا۔ اس اشتہار کو شائع ہوئے پورے آٹھ دن ہو چکے تھے۔

اور پھر اسی رات ساڑھے نو بجے کے قریب فون پر حاجی عبداللہ کا پیغام ملا کہ وہ رضیہ کو لے کر صبح نو بجے رجسٹرار کے دفتر پہنچ جائیں۔

انہوں نے رضیہ کو پروگرام کے بارے میں نہیں بتایا۔ صبح اٹھتے ہی ثمینہ نے اسے بتایا کہ آج وہ یونیورسٹی نہیں جائے گی بلکہ ان کے ساتھ ایک بہت ضروری کام سے جا رہی ہے۔

اور جب رجسٹرار کے دفتر میں کئی کاغذات اور رجسٹروں پر دستخط کرنے کے بعد کوٹھی کی ملکیت کے کاغذات اس کے حوالے کئے گئے تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے ایک روز تمہیں کہا تھا کہ ایک ہفتہ بعد تمہیں خوشخبری سناؤں گی یہی تھی وہ خوش خبری۔" ثمینہ نے کہا۔

رضیہ لوگوں کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر ثمینہ سے لپٹ گئی۔

اور جب گھر آ کر اس نے مریم کو سارا قصہ سنایا تو مریم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ کوٹھی آپ کے بیٹے نے آپ کو لے کر دی ہے ماں جی۔" ثمینہ نے مریم سے لپٹتے ہوئے کہا۔ "یہ کوٹھی کے کاغذات ہیں انہیں سنبھال کر رکھئے۔"

وہ لوگ بہت دیر تک بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہے' پھر شارق اٹھ کر نیچے آ گیا جہاں نولکھا اخبار کا فلمی صفحہ دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے نولکھے؟" شارق نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آج بڑے غور سے اخبار کا یہ صفحہ دیکھ رہے ہو کوئی فلم دیکھنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"اپنی ہی فلم ختم نہیں ہوتی شارق باؤ' کوئی اور فلم کیا دیکھیں گے۔" نولکھا نے گہرا سانس لیتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"تو آج پھر فلم کا پروگرام بن ہی جائے' سب لوگ چلیں گے تمہارے خیال میں کونسی فلم

اچھی ہے؟" شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو سلطان راہی کے علاوہ کسی اور کی فلم اچھی لگتی ہی نہیں۔ بھئی شارق باؤ سچی بات تو یہ ہے کہ جس فلم میں سلطان راہی نہ ہو مزا ہی نہیں آتا۔ کیا بڑک مارتا ہے شیر دا بچہ! خون جوش مارنے لگتا ہے رگوں میں۔" نولکھا نے کہا۔

"ان بڑکوں کے جوش میں تم نے شاید کبھی ایک بات پر غور نہیں کیا۔" شارق بولا۔

"وہ کیا شارق باؤ؟" نولکھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا اس طرح کی فلمیں ہمارے معاشرے میں بگاڑ پیدا نہیں کر رہی ہیں۔ بڑکوں اور گنڈاسوں کے ذریعے قوم کو کیا پیغام دیا جا رہا ہے' ان فلموں کے ذریعے کس تہذیب کی عکاسی کی جا رہی ہے۔ حقیقی زندگی میں کبھی یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ رقص کے نام پر یہ بے ہودہ اچھل کود یہ سب کچھ کہاں ہوتا ہے۔"

"اچھل کود نہ سہی لیکن اور سب کچھ تو ہوتا ہی ہے شارق باؤ۔" نولکھا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم خود اس کی سب سے بڑی زندہ مثال نہیں ہو' کیا جرم کیا تھا تم نے جس کی سزا کاٹنے کے لئے تمہیں طویل عرصہ کے لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا' اس کے بعد تمہیں شرافت کی زندگی کیوں نہیں گزارنے دی گئی' آج تم اسمگلر ہو' قاتل ہو' دہشت گرد ہو یہ سب کچھ تمہیں کس نے بنایا ہے؟ کیا تم نے اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے یہ راستہ اختیار کیا ہے؟ نہیں شارق باؤ کوئی اپنی مرضی سی مجرمانہ زندگی اختیار نہیں کرتا نہ ہی کوئی ماں کے پیٹ سے مجرم پیدا ہوتا ہے مجرم تو اسے یہ معاشرہ ہی بناتا ہے۔ یہ زمیندار' جاگیردار اور دولت مند لوگ اپنے مفادات کے لئے شریف لوگوں کو قربانی کا بکرا بنا لیتے ہیں اور جب یہ شریف لوگ ان کے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں تو قانون کے یہ محافظ آڑے آ جاتے ہیں۔ قانون کے ان محافظوں کا مفاد بھی اسی میں ہوتا ہے کہ وہ شریف لوگوں کو مجرمانہ زندگی اپنانے پر مجبور کرتے رہیں۔ یہ شریف لوگ تو دولت مندوں اور قانون کے محافظوں کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ جو کبھی ان کے چنگل سے نہیں نکل سکتے' کیا تم ان سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے ہو.... سلطان راہی بھی ہمارے معاشرے کا ایک ایسا ہی کردار ہے۔"

"تم تو فلسفہ بگھارنے لگے۔" شارق نے اسے گھورا۔ "فلم کی بات کرو کونسی فلم دیکھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں شارق باؤ.... کوئی فلم نہیں دیکھنی۔" نولکھا نے نفی میں سر ہلایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ثمینہ بھی آ گئی۔

"ہاں بھئی! اب کیا پروگرام ہے؟" ثمینہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"کیسا پروگرام؟" شارق نے پوچھا۔

"اس کوٹھی کا مسئلہ تھا وہ تو حل ہو گیا۔ اب حاجی عبداللہ کے کام کے لئے کیا پروگرام بناؤ گے۔" ثمینہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے ایک ہفتے بعد کا پروگرام بنا لیتے ہیں اس دوران ہم یہاں سے اپنے کام سمیٹ لیں گے۔" شارق نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "ماجھے گجر کی طرف سے تو اب ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن ہماری طرف بھی صورت حال کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ گامے کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ ہماری عدم موجودگی میں یہاں کا کام سنبھال سکے اسے بھی آرام کی ضرورت ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ مرنگ والا اڈہ بند کر دیا جائے۔ گاما ٹھوکر نیاز بیگ والی حویلی میں رہے گا۔ مولوی حمید تھوڑا بہت دھندہ کرتا رہے تاکہ پارٹیوں سے رابطہ قائم رہے۔ اور ان سب لوگوں کو سختی سے ہدایت کر دی جائے کہ ہماری عدم موجودی میں وہ اس کوٹھی کا رخ نہ کریں' میں نہیں چاہتی کہ ہمارے بعد ماں جی اور رضیہ کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔"

"میرا خیال ہے ثمینہ بی بی ٹھیک کہتی ہے۔" نولکھا نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "مرنگ والا اڈہ واقعی بند کر دیا جائے' گاما ٹھیک بھی ہوتا تو وہ اکیلا یہ دھندہ نہیں سنبھال سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی کیا جائے گا۔" شارق نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کی بعد بولا۔ "تو گویا حاجی عبداللہ کو اطلاع دے دی جائے کہ ہم ایک ہفتے بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"ہاں آج رات اسے ٹیلی فون پر اطلاع دے دو۔" ثمینہ نے کہا۔

وہ باتیں کر ہی رہے تھی کہ شاداں ان کے لئے چائے لے کر آ گئی۔

"اے! تم سے چائے کے لئے کس نے کہا تھا؟" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"آپ لوگ عام طور پر اس وقت چائے پیتے ہیں اس لئے میں خود ہی بنا کر لے آئی ہوں۔" شاداں نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اس نے تو چائے پلا پلا کر میرا سینہ ساڑ دیا ہے ثمینہ بی بی جی۔" نولکھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی اور کام نہیں ہوتا تو چائے بنا کر لے آتی ہے۔"

"ایک تو وہ تمہیں بغیر مانگے چائے پلاتی رہتی ہے الٹا تم اسے الزام دے رہے ہو۔" شارق نے اسے گھورا۔

شاداں باہر چلی گئی تھی۔ چائے کے دوران وہ لوگ خوش گپیاں کرتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ثمینہ' رضیہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی اور اسے باتوں ہی باتوں میں بتا دیا کہ ایک ہفتے بعد وہ لوگ چند روز کے لئے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"افغانستان۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"افغانستان۔" رضیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔ "وہ پورا ملک تو میدان جنگ بنا ہوا ہے' روسی فوجوں کے جانے کی بعد افغانستان کے لوگ تو آپس میں لڑ مر رہے ہیں ان حالات میں آپ لوگ وہاں کیا لینے جا رہے ہیں۔"

"ایک چیز ہوتی ہے ایڈونچر۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سمجھ لو کہ ہم لوگ ایک ایڈونچر پر جا رہے ہیں۔"

وہ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔

اس رات شارق نے حاجی عبداللہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ حاجی عبداللہ نے انہیں دوسرے دن سمن آباد والی کوٹھی میں بلا لیا تھا۔

دوسرے دن رات کو وہ سمن آباد والی کوٹھی میں تقریباً دو گھنٹوں تک حاجی عبداللہ سے باتیں کرتے رہے۔ حاجی عبداللہ انہیں پارہ چنار میں ملک گل رحمان اور اس سے آگے دوسرے لوگوں سے ملاقات کے ذرائع اور دوسری باتیں بتاتا رہا۔

باقی تین چار دن یہ لوگ اپنے دیگر کاموں اور تیاریوں میں مصروف رہے اور پھر ایک روز یہ تینوں رات گیارہ بجے جی ٹی ایس کی لگژری بس کے ذریعے راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ صبح پانچ بجے یہ لوگ راولپنڈی پہنچے اور ایک ہوٹل میں کمرے لے کر دن بھر سوتے رہے۔

دوسرے دن پنڈی سے بھی رخصت ہو گئے اور بسوں کے ذریعے کوہاٹ' ہنگو' علی زئی اور سدہ ہوتے ہوئے پارہ چنار پہنچ گئے۔ کوہاٹ سے آگے کا راستہ بے حد خطرناک تھا بعض مقامات پر تو اس قدر خطرناک موڑ تھے کہ دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ نولکھا تو ایسے ہر موقع پر آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔

قراقرم ایجنسی کا ہیڈ کوارٹر پارہ چنار ایک خوبصورت چھوٹا سا شہر اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ لوگ جب پارہ چنار پہنچے تو شام ہونے والی تھی یہاں ملک بھر سے سیاح آتے رہتے تھے غیر ملکی سیاح بھی بڑی تعداد میں یہاں آتے تھے۔ بس سے اترتے ہی انہیں تین چار غیر ملکی سیاح بھی نظر آئے تھے جن میں ایک جوان اور حسین لڑکی بھی شامل تھی۔

سیاحت کا سیزن ہونے کی وجہ سے انہیں بڑی مشکل سے ایک ریسٹ ہاؤس میں جگہ ملی اور اس کے لئے انہیں دگنا کرایہ دینا پڑا تھا۔ بسوں کے طویل اور خطرناک سفر نے انہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد وہ سو گئے لیکن صبح سویرے وہ بیدار ہو گئے۔

سفر کے دوران ثمینہ پورا علاقہ دیکھتی ہوئی آئی تھی اور اس کے خیال میں یہ دنیا کی حسین ترین وادیاں تھیں۔ جو لوگ سوئٹزر لینڈ اور فرانس کی طرف بھاگتے تھے۔ وہ بے وقوف تھے' یہ وادیاں تو سوئٹزر لینڈ سے بھی زیادہ حسین تھیں یہاں کیا کچھ نہیں تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ ریسٹ ہاؤس سے نکل گئے۔ بازار کی دکانیں صبح سویرے ہی کھل گئی تھیں۔ تقریباً ہر دکان پر انہیں اسلحہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں اسلحہ اس طرح فروخت ہو رہا تھا جیسے ٹھیلوں پر پھل اور سبزیاں فروخت ہو رہی ہوں۔

شارق ایک ایسی ہی دکان کے سامنے رک گیا جہاں ضروریات زندگی کی دوسری چیزوں کے علاوہ مختلف اقسام کے ہتھیار بھی سجے ہوئے تھے۔

"آؤ بابو سیب کیا مانگتا ہے۔" دکاندار نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا' وہ اونچا لمبا قد آور آدمی تھا۔ مونچھیں اس قدر پھیلی ہوئی تھیں کہ دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔

"ہمیں ملک گل رحمٰن سے ملنا ہے خان صاحب۔" شارق نے کہا۔

"اوئے تم گل رحمٰن کا مہمان ہے' ابھی تم کو اس کے پاس بھیجے گا۔ بیٹھو ہمارے ساتھ ایک پیالی چائے پیو پھر جانا۔" خاں صاحب نے کہا۔

"نہیں خان صاحب ہمیں ذرا جلدی ہے۔" شارق نے کہا۔

"اچھا ٹھہرو' ہم تم کو بھیجتا ہے۔" خان صاحب نے کہا اور دس گیارہ سال کے ایک لڑکے کو بلا کر اس سے کچھ کہا اور ان لوگوں کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ تقریباً پچاس گز آگے وہ لڑکا ایسی ہی ایک دکان کے سامنے رک گیا' دکان میں جو شخص بیٹھا ہوا تھا وہ بہت دبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھیں سرخ اور مونچھیں رخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں وہ ملک گل رحمان تھا۔

○

گل رحمٰن نے بھی بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اس کی نظریں بار بار ثمینہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جس نے اسٹون واش جینز اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ کے سامنے کے رخ پر امریکہ کے کسی ساحلی علاقے کی تصویر بنی ہوئی تھی اور پشت پر "ڈونٹ فالو می" لکھا ہوا تھا۔ ٹی شرٹ خاصی ٹائٹ تھی جس سے اس کے سینے کے ابھار نمایاں ہو گئے تھے۔ چمکتی ہوئی دھوپ سے بچنے کے لئے اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔

اس قسم کا لباس قبائلی علاقوں میں بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہاں سیاحوں کی آمد و رفت تھی۔ ان سیاحوں میں پاکستانی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ پاکستانی خواتین تو عام طور پر شلوار قمیض پہنتی تھیں جبکہ غیر ملکی خواتین زیادہ تر پینٹ شرٹ وغیرہ استعمال کرتی تھیں۔ شہروں سے آنے والی ماڈرن پاکستانی بھی اس قسم کا ماڈرن لباس پہنتی تھیں۔ اور اس طرح بعض ناخوشگوار واقعات بھی رونما ہو جاتے تھے۔

گل رحمٰن چند لمحے گہری نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ثمینہ کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے گل رحمٰن کی نظریں سوئیوں کی طرح اس کے جسم میں چبھ رہی ہوں۔ گل رحمٰن کی نظر نولکھا کی طرف اٹھ گئی اور پھر وہ شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم حاجی عبداللہ کے دوست ہے تو امارا بھی دوست ہے۔" بالاخر گل رحمٰن نے کہا۔ "بولو۔ ہم تمہارا کیا خدمت کرے.... چائے پلائے یا روٹی کھائے گا۔"

"ہم اس وقت نہ چائے پئیں گے اور نہ روٹی کھائیں گے۔" شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہمیں ان بلند پہاڑوں کے اس پار جانا ہے اور ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"پہاڑوں کے اس پار تو کافر لوگ رہتا ہے۔" گل رحمٰن نے کہا۔

"وہ نورستان ہے۔ نورانی چہروں والے لوگ کافر نہیں ہو سکتے۔" شارق نے کہا۔

"اچھا۔ ابھی تو تم ایسا کرو کہ اس لڑکا کے ساتھ جاؤ۔ ہم آدھا گھنٹہ بعد تم لوگ سے ملاقات کرے گا۔ گل رحمٰن نے کہا اور دکان کے اندر کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی۔ چند سیکنڈ

ہی گیارہ بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا سامنے آ گیا۔

اس لڑکے کو دیکھ کر ان تینوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس نے بڑے گھیر والی کالے کپڑے شلوار پہن رکھی تھی۔ قمیض گھٹنوں تک لمبی تھی۔ اور اس کا رنگ بھی کالا ہی تھا۔ کالی مخملی ٹ جس پر گوٹے سے کشیدہ کا کام تھا' سر پر اپنی عمر کے لحاظ سے بڑی پگڑی اور گلے میں بیلٹ جس کے ہولسٹر میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔

گل رحمٰن نے اس لڑکے کو عمر کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کچھ اپنی زبان میں کہا اور پھر ارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ عمر کے ساتھ چلے جاؤ۔ ام آتا ہے۔"

شارق نے ثمینہ اور نولکھا کی طرف دیکھا اور وہ تینوں دکان سے باہر آ گئے۔ عمران سے پہلے باہر آ چکا تھا۔ عمران سے چند قدم آگے تھا۔ وہ تینوں اس کے پیچھے پیچھے بازار میں چلتے رہے ر بالاخر آبادی سے باہر نکل آئے تھے۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے نولکھا کی سانس پھولنے لی تھی۔

"شارق باؤ۔" وہ شارق کو پکارتے ہوئے رک گیا۔ "یہ لونڈا ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ ایسا ہو کہ ہماری واپسی مشکل ہو جائے۔"

"اے عمر....!" شارق نے آواز دے کر عمر کو بھی روک لیا۔ "کتنی دور جانا ہے۔"

"اس چٹان کے پیچھے۔" عمر نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چٹان وہاں سے تقریباً دو سو گز دور تھی۔ ثمینہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ان کے اردوں طرف سبزہ تھا جس میں جگہ جگہ جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ نشیب میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے آس پاس اور پہاڑیوں پر کہیں کہیں مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ یہاں چیڑ اور چنار کے درختوں کی بہتات تھی۔

وہ ایک بار پھر چلنے لگے۔ چٹان کے دوسری طرف گہرائی میں ایک چوڑی ندی بہہ رہی تھی۔ ندی تقریباً پندرہ فٹ چوڑی تھی اور اس پر رسوں کا پل بنا ہوا تھا۔ عمر تو بڑی آسانی سے یہ پل پار کر گیا مگر وہ تینوں رک گئے۔

"او خوچہ تم ڈرتا ہے۔" عمر نے ندی کے دوسری طرف سے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس موٹے والے رسے کو پکڑو اور آرام سے آ جاؤ۔ پل نہیں ٹوٹ جائے گا۔"

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہلے شارق آگے بڑھا۔ پل کی چوڑائی تقریباً تین فٹ تھی۔ کمر کے برابر بلندی تک موٹے رسے تنے ہوئے تھے۔ نیچے بھی رسوں کا جال سا بنا ہوا

تھا۔ جال اتنا گنجان تھا کہ پیر اس میں سے نہیں نکل سکتا تھا۔

شارق نے دونوں طرف کے رسوں کو پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے سے پورا پل جھول رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا اور بالآخر دوسری طرف پہنچ گیا اس کے نولکھا اور پھر ثمینہ بھی دوسری طرف آ گئے۔

ندی کے، دوسری طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ تقریباً تین تک مکان کی دیواریں پتھروں کی تھیں اور اس سے اوپر پورے مکان کی تعمیر میں لکڑی استعمال گئی تھی۔

مکان کے سامنے کے رخ پر ایک کشادہ برآمدہ تھا جس میں پانچ چھ پرانی سی گارڈن چیئرز ہوئی تھیں۔ مکان کے سامنے ایک ڈھلان تھی جو نشیب میں بہتے ہوئے دریا تک چلی گئی تھی پوری ڈھلان سبز مخملی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔

نولکھا تو برآمدے میں آتے ہی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور ثمینہ اور شارق گھوم پھر کر مکان دیکھنے لگے۔ ایک پندرہ بائی بیس فٹ کا بڑا کمرہ تھا اور دو کمرے بارہ بائی چودہ فٹ کے تھے۔ پچھلی طرف ایک کچن بھی تھا۔ دونوں کمروں میں لکڑی کے بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ دو دو کرسیاں بھی تھیں اور ہر کمرے میں دیوار میں ایک ایک الماری بھی تھی۔ کچن میں کھانے پینے کا سامان اور برتن بھی موجود تھے۔ بڑے کمرے میں ایک دری بچھی ہوئی تھی۔

یہ ایک خوبصورت کاٹیج تھا اور سیاحت کے لئے آنے والوں کے لئے ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ ثمینہ اور شارق بھی برآمدے میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برآمدے کے سامنے تقریباً پچاس بائی پچاس فٹ چوڑی ہموار جگہ تھی جس میں دبیز گھاس لگی ہوئی تھی اور ڈھلان اس ہموار جگہ سے آگے شروع ہوتی تھی۔ مکان کے اردگرد چیڑ کے درخت تھے۔

وہ تینوں برآمدے میں بیٹھے قدرتی حسن کا نظارہ کر رہے تھے کہ عمر ایک ٹرے میں چائے لے کر آ گیا۔ شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں سبز چائے تھی۔ اس نے ٹرے ان کے سامنے ایک سال خوردہ سی میز پر رکھ دی اور خود جا کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ وہ تینوں اپنے اپنے گلاس اٹھا کر چائے پینے لگے۔ چائے واقعی بڑی خوش ذائقہ تھی۔ چائے کے ساتھ وہ خوش گپیاں بھی کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد عمر بھی اٹھ کر ان کے قریب آ گیا۔

"اوئے لڑکے۔" نولکھا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ بوجھ اپنے گلے میں کیوں ڈال رکھا ہے۔" اس نے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اصلی بھی ہے یا نقلی ہے!"

عمر نے چبھتی ہوئی نظروں سے نولکھا کی طرف دیکھا۔ نولکھا چائے ختم کر چکا تھا۔ خالی گلاس

اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تم ادھر آ کر کھڑا ہو جاؤ اور یہ گلاس اوپر ہوا میں پھینک دو۔ ہم تم کو بتائے گا کہ یہ اصلی ہے یا نقلی۔" عمر نے کہا۔

نولکھا اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے سے باہر آ گیا۔ عمر اس کے دائیں طرف چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کا ریوالور ہولسٹر میں تھا۔ ہولسٹر کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ نولکھا نے عمر کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس پوری قوت سے ہوا میں اچھال دیا۔

اچانک فائر کی آواز سناٹے میں گونجی اور ہوا میں گلاس کے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کرچیاں فضا میں چاروں طرف بکھر گئی تھیں۔

نولکھا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے گلاس ہوا میں اچھالا تھا اور اس کی توجہ گلاس پر ہی تھی۔ اس نے گلاس کی کرچیاں فضا میں بکھرتے ہوئے دیکھی تھیں لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ عمر نے کب ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور کب گولی چلائی تھی۔ البتہ اس نے جب مڑ کر عمر کی طرف دیکھا تو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی نالی سے دھواں نکل رہا تھا۔

ثمینہ اور شارق نے یہ ساری کارروائی دیکھی تھی۔ وہ فضا میں گلاس کے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ اور چہروں پر ایسے تاثرات جیسے جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اس پر یقین نہ آ رہا ہو۔

عمر نے جب نولکھا کو چیلنج کیا تھا تو ثمینہ سمجھی تھی کہ وہ بچہ ہے اور انہیں اپنی باتوں سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نولکھا نے جیسے ہی گلاس ہوا میں اچھالا تھا ثمینہ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ عمر نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ کر گولی چلا دی تھی اور گلاس کے فضا ہی میں ٹکڑے ہو گئے تھے۔

نولکھا نے دوسرے دونوں گلاس بھی باری باری ہوا میں اچھالے اور عمر نے اپنی گولیوں سے ان کی کرچیاں بھی فضا میں بکھیر دیں۔

"کمال ہے بھئی۔" نولکھا نے کہا۔ "میں تو اسے بچہ ہی سمجھ رہا تھا۔ لیکن ایسا سچا نشانہ..... میں نے تو آج تک ایسا نشانہ نہیں دیکھا۔"

"ہم نے سنا تھا کہ قبائلیوں کے بچے بھی ہتھیاروں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ کبھی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن آج ہمارے سامنے جو حقیقت ہے اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" ثمینہ نے کہا۔

"یہ ذرا اپنا تو یک دکھانا مجھے۔" نولکھا نے عمر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

عمر نے ریوالور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نولکھا ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ روسی ریوالور تھا۔ روس سے افغانستان کی جنگ ہوئی تھی اور اس کے بعد ہر طرف روسی اسلحہ کی بھرمار ہو گئی تھی۔ یہی اسلحہ اسمگل ہو کر پورے پاکستان میں پھیل رہا تھا۔ نولکھا نے ریوالور عمر کو واپس کر دیا اور اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

"تم لوگ ادھر بیٹھو۔ ہم ابھی آئے گا۔" عمر نے کہا اور ڈھلان پر اترنے لگا۔ وہ دریا کی طرف جا رہا تھا۔

وہ تینوں پھر برآمدے میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"نولکھا بھائی۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس بچے کا نشانہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ اس مہم کے دوران کسی قبائلی سے الجھنے کی کوشش مت کرنا۔"

"ثمینہ بی بی۔ ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔" نولکھا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

وہ تینوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ گل رحمٰن نے کہا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے میں ان کے پاس پہنچ جائے گا لیکن اب تقریباً ایک گھنٹہ ہونے والا تھا۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے اور پھر انہیں ندی کی طرف سے تین آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ رسوں کا پل چٹان کی آڑ میں تھا اس لئے وہ انہیں ندی کا پل پار کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکے تھے۔ اور جب وہ چٹان گھوم کر سامنے آئے تھے تو ان کی نظروں میں آ گئے تھے۔

ان میں ایک تو گل رحمٰن تھا۔ دوسرے دونوں ظاہر ہے ان کے لئے اجنبی تھے لیکن وہ دونوں بھی لمبے تڑنگے تھے اور انہوں نے قبائلی لباس پہن رکھے تھے۔ گل رحمٰن کے جسم پر بظاہر کوئی اسلحہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن دوسرے دونوں آدمیوں نے اپنے کندھوں پر رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ شارق وغیرہ اپنی جگہوں پر بیٹھے ان کی طرف دیکھتے رہے اور بالآخر وہ قریب پہنچے تو یہ تینوں بھی کرسیوں سے اٹھ گئے۔ اور پھر وہ سب اندر آ کر دری پر بیٹھ گئے۔ ثمینہ ٹائٹ جینز کی وجہ سے دری پر بیٹھنے میں کچھ دشواری محسوس کر رہی تھی۔

"شارق صاب۔" گل رحمٰن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "دکان پر تم سے بات کرتے ہوئے جو کوڈ استعمال کیا تھا وہ تو ٹھیک ہے مگر حاجی عبداللہ نے ام کو یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی عورت بھی ہو گا۔"

"پہلے عورت کا ہمارے ساتھ آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ لیکن..." شارق نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ثمینہ کو ہم نے عین آخر وقت میں شامل کیا ہے اور حاجی عبداللہ کو بتا دیا میں نے تمہاری دکان پر ٹیلی فون دیکھا تھا۔ پارہ چنار کا پورا ملک سے ٹیلی فونک رابطہ قائم

ہے۔ تم اگر چاہو تو ٹیلی فون پر حاجی عبداللہ سے بات کر کے اپنی تسلی کر سکتے ہو۔"

"وہ تو کرنا ہی پڑے گیا۔" گل رحمٰن نے کہتے ہوئے کینوس کا ایک بیگ کھول لیا اس بیگ سے جو کچھ بھی برآمد ہوا اسے دیکھ کر شارق کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ یہ روسی ساخت کا وسیع حیطہ عمل والا ٹرانسمیٹر تھا۔ اس کی لمبائی و چوڑائی ایک کتاب کے برابر تھی البتہ اونچائی چھ انچ کے قریب تھی۔

گل رحمٰن نے وہ ٹرانسمیٹر بیگ میں سے نکال کر پہلے اس کا انٹینا باہر کھینچا پھر دو تین بٹن آن آف کرنے کے بعد مائیک منہ کے سامنے کرتے ہوئے کال نشر کرنے لگا۔

"پوسٹ زیرو ٹو کالنگ۔ مشن نورستان..... پوسٹ زیرو ٹو کالنگ۔"

ٹرانسمیٹر میں نصب اسپیکر پر بہت ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی سی آواز سنائی دے رہی تھی پھر ڈائل پر ایک چھوٹی سی سبز بتی روشن ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز سنائی دی۔

"پوسٹ زیرو ون ریسیونگ۔ مشن نورستان۔ یس گل رحمٰن کیا بات ہے؟"

"مہمان پہنچ گئے ہیں لیکن ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے جس کے بارے میں ہمیں پہلے سے کچھ نہیں بتایا گیا۔" گل رحمٰن نے مائیک میں کہا۔

"اندیشے کی کوئی بات نہیں ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ آواز بالکل صاف آ رہی تھی۔ "اس عورت کا نام ثمینہ ہے اور وہ شارق کی دوست ہے۔ اس مشن میں اس کے ساتھ رہے گی۔ اور کوئی بات!"

"بس یہی تصدیق کرنا تھی۔" گل رحمٰن نے کہا۔ "حاجی عبداللہ کو ہمارا سلام بولو اور بتا دو کہ مشن دو تین دن میں روانہ ہو جائے گا۔ اوور اینڈ آل۔"

اس نے ٹرانسمیٹر آف کر دیا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

نولکھا، ثمینہ اور شارق بہت حیران ہو رہے تھے۔ یہ کام بڑے منظم طریقے سے ہو رہا تھا۔ یہ تو شارق کو معلوم تھا کہ حاجی عبداللہ کا تعلق منشیات کے ایک بین الاقوامی گروہ سے ہے۔ لیکن یہ انکشاف پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ ان میں اس قدر جدید بنیادوں پر مواصلاتی رابطہ بھی موجود ہے۔

"ٹھیک ہے شارق صاحب!" گل رحمٰن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ٹرانسمیٹر پر بڑی صاف اور رواں اردو میں بات کی تھی حالانکہ اس سے پہلے وہ ان سے قبائلی لہجے میں بات کرتا رہا تھا۔ "مجھے اس مشن میں اس عورت کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے حیرت ہے۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو بڑی شستہ اردو بول

لیتے ہو۔"

"میں اس قبائلی علاقے میں پیدا ہوا تھا مگر میری پرورش ان علاقوں میں ہوئی ہے جہاں اردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ میں نے پشاور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی داخلہ لیا تھا۔ لیکن چند مہینوں بعد چھوڑ کر واپس آ گیا۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔

"مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے۔" شارق بولا۔ "اتنا پڑھنے لکھنے کے باوجود منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ....."

"تم نے بھی تو جیل میں رہتے ہوئے گریجویشن کیا ہے۔" گل رحمٰن نے اس کی بات کاٹ دی۔

شارق اچھل پڑا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گل رحمٰن اس کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتا تھا اور یہ تمام معلومات اسے یقیناً حاجی عبداللہ نے فراہم کی ہوں گی۔ کوئی بھی بین الاقوامی گروہ کسی نئے آدمی کو ساتھ ملاتا ہے یا کسی سے کام لیتا ہے تو اس کے بارے میں تمام معلومات پہلے سے جمع کر لیتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ نولکھا کے بارے میں بھی ان کے پاس مکمل معلومات ہوں گی۔ البتہ ثمینہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

"شارق صاحب!" گل رحمٰن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ہم جیسے پڑھے لکھے لوگ جب جرائم کی دنیا میں آتے ہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے اور وہ وجہ معمولی نہیں ہوتی۔ تم اپنی مثال لے لو..... تم خوشی سے تو مجرم نہیں بنے؟ تمہارے ماں باپ کو تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کیا تھا اور انصاف فراہم کرنے کے بجائے الٹا تمہیں ہی جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اور جب تم جیل سے رہا ہوئے اور تم نے شرافت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی تو قانون کے محافظوں نے تمہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ بے گناہ ہونے کے باوجود سزا کاٹنے کے بعد بھی تم سب کچھ بھول جانا چاہتے تھے لیکن تمہارے سینے میں دبے ہوئے انتقام کے جذبے کو ابھارا گیا اور پھر انسانیت کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال پیش آئی تھی جس نے مجھے یہ مجرمانہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔"

"کیا تمہارے ماں باپ کو بھی....." شارق نے جملہ ادھورہ چھوڑ کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" گل رحمٰن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا باپ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اور تم جانتے ہو ان پہاڑوں میں قبیلوں کے مابین دشمنیاں نسل در نسل چلتی ہیں۔ ہمارے قبیلے کی بھی کسی اور قبیلے سے دشمنی چل رہی تھی۔ میرا باپ ان پڑھ اور جاہل ہونے کے باوجود فطرتاً امن پسند اور صلح جو آدمی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب لوگ امن اور سکون سے رہیں۔ وہ ان پڑھ تھا لیکن تعلیم کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی علاقے میں دو اسکول بنائے تھے۔ مگر دوسرے قبائلی سرداروں کو یہ پسند نہیں تھا۔ میرا باپ چاہتا تھا کہ میں بھی پڑھ لکھ کر ان پہاڑوں میں علم کے چراغ روشن کروں اس لئے وہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا۔

میں اس وقت آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھا۔ میرا پہلا ہی سال تھا۔ ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ ہمارے مخالف قبیلے کے لوگوں نے ہماری بستی پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ بستی آٹھ دس گھروں پر مشتمل تھی۔ جسے گھیرے میں لے لیا گیا۔ کچھ لوگوں نے میرے باپ کے گھر کو آگ لگا دی اور چاروں طرف سے مکان پر مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کی جانے لگی۔ اس طرح میرے ماں باپ زندہ جل گئے۔

میں یہ اطلاع ملتے ہی واپس آ گیا۔ قبیلے کے لوگ میری واپسی کی اطلاع پا کر میرے گرد جمع ہو گئے۔ ہر شخص کے سینے میں انتقام کا لاوا کھول رہا تھا۔ اسلحے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ افغانستان کی جنگ نے ہماری یہ مشکل حل کر دی تھی۔ ان دنوں روسی فوجیں' افغانستان پر قابض تھیں۔ مختلف علاقوں میں ان کے پاس اسلحہ کے ڈپو یا تو تباہ کئے جا رہے تھے یا لوٹے جا رہے تھے۔ مجاہدین کو لڑنے کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسے گروہ بھی معرض وجود میں آ چکے تھے جو مجاہدین کے بھیس میں روسی فوجیوں کے کیمپوں سے اسلحہ لوٹ کر یا تو مجاہدین کے ہاتھوں فروخت کر دیتے یا زیادہ پیسے کے لالچ میں سرحد پار کر کے پاکستانی علاقے میں لے آتے۔ یہاں سے اسلحہ پورے ملک میں پھیل رہا تھا۔

میرے آدمیوں کے پاس اسلحہ کی کمی نہیں تھی۔ ان کے پاس ہیوی مشین گنوں کے علاوہ راکٹ اور لانچر بھی موجود تھے۔ میرے دشمن قبیلے کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور انہوں نے بھی تیاری شروع کر دی تھی۔ لیکن ہم نے انہیں مزید تیاری کا موقع دیئے بغیر چاروں طرف کے پہاڑوں پر مورچے جما لئے اور رات کو ان پر حملہ کر دیا۔ میرا دشمن قبیلہ بھی پوری تیاری سے تھا۔ میرے آدمیوں کے پاس ایک اسٹنگر میزائل بھی تھا۔ وہ لانچر اور میزائل کو پہاڑی کی چوٹی پر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے وہ میزائل فائر کر دیا گیا اور پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔

میں نے اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام لے لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہ علاقہ بھی چھوڑ دیا۔ اس اسٹنگر میزائل کے بارے میں سرکاری حلقوں میں یہ رائے قائم کی گئی کہ یہ

سرحد پار سے داغا گیا تھا۔ ان دنوں صورت حال کچھ ایسی ہی تھی کہ افغان مجاہدین' روسی فوجوں کے کیمپوں پر حملے کے بعد پاکستان کی طرف بھاگ آتے تھے اور روسی گن شپ ہیلی کاپٹر ان کا تعاقب کرتے ہوئے میزائل داغتے رہتے تھے۔ اس طرح کئی راکٹ اور میزائل پاکستانی علاقوں پر آ کر گرتے تھے۔ جس سے جانی اور مالی نقصان بھی ہوتا تھا اور حکومت پاکستان افغان انتظامیہ سے احتجاج کر کے رہ جاتی۔ اس روز بھی افغان انتظامیہ ہی سے احتجاج کیا گیا تھا۔

میں واپس چلا جانا چاہتا تھا لیکن مجھے بعض ایسے لوگ مل گئے تھے جو مجھے یہیں روکنا چاہتے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ میرے ہمدرد ہیں لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ لوگ میرے ذریعے افغانستان سے اسلحہ اور ہیروئن اسمگل کرنا چاہتے تھے۔ میں ان کے جھانسے میں آ گیا۔ اور میں نے ان کے اشاروں پر کام شروع کر دیا۔ پہلے تو میں ان لوگوں کے لئے اسلحہ ہی اسمگل کرتا رہا لیکن پھر ہیروئن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہیروئن میں زیادہ منافع تھا۔ پہلے میں دوسروں کے لئے کام کرتا تھا پھر میرے بھی اوپر کے لوگوں سے روابط ہو گئے۔ میں نے انڈی پنڈنٹ ہو کر کام شروع کر دیا۔ پھر میری ملاقات پشاور میں لاہور کے حاجی عبداللہ سے ہوئی۔ وہ ایک بہت بڑے بین الاقوامی گروہ کے جنوبی ایشیا زون کا سربراہ ہے۔ اس زون میں دو بڑے مراکز ہیں جہاں سے سب سے زیادہ ہیروئن بیرونی ممالک کو بھیجی جاتی ہے۔ پاکستان اور گولڈن ٹرائی اینگل۔"

"گولڈن ٹرائی اینگل برما' لاؤس اور تھائی لینڈ پر مشتمل ہے۔ وہاں بھی بڑے بڑے جغادری اور بین الاقوامی اسمگلر موجود ہیں لیکن حاجی عبداللہ کا ان سب پر کنٹرول ہے۔ بہت خوفناک قسم کا آدمی ہے حاجی عبداللہ۔"

گل رحمٰن خاموش ہو گیا۔ نولکھا' ثمینہ اور شارق معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ثمینہ اور شارق تو حاجی عبداللہ سے کئی بار مل چکے تھے لیکن انہیں اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی جو اسے خوفناک ثابت کرتی اور اب جو انکشافات ہوئے تھی اس سے تو یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ واقعی بہت خوفناک آدمی تھا۔ جو شخص آزاد علاقے کے خونخوار قبائلیوں اور گولڈن ٹرائی اینگل میں سرگرم چینی' برما اور تھائی مافیا کے خونخوار بھیڑیوں کو کنٹرول کر رہا تھا وہ واقعی خوفناک تھا۔

"اب ہمارے لئے کیا پروگرام بنایا ہے؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم لوگوں کے لئے پروگرام یہ ہے کہ دو تین دن یہاں رہو گے۔ اس مکان میں۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "یہ مکان میرا ہے جو سیزن میں سیاحوں کو کرائے پر دیا جاتا ہے لیکن یہاں یہ کاٹیج بنانے کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ وہ میں بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔ مجھے ایک ہفتہ پہلے اطلاع

مل گئی تھی کہ لاہور سے ایک پارٹی آ رہی ہے۔ اس لئے میں نے یہ کاٹیج کسی کو کرائے پر نہیں دیا تھا۔ دراصل...." وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "مشن نورستان تقریباً تین مہینے پہلے بنایا گیا تھا۔ لیکن اس کے لئے کوئی مناسب آدمی نہیں مل رہا تھا جس وجہ سے یہ معاملہ ٹلتا رہا اور بالآخر اس مقصد کے لئے حاجی عبداللہ نے تمہارا انتخاب کر لیا۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ تم پہلے بھی ایک مشن کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچا چکے ہو۔ نولکھا اور یہ ثمینہ بھی اس مشن میں تمہارے ساتھ تھے۔ اور اس مشن کی کامیابی ہی کے باعث مشن نورستان کے لئے بھی تم لوگوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ثمینہ کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی تمہارے ساتھ ہو گی۔ بہرحال' تم لوگوں کا پروگرام یہ ہے کہ دو تین دن یہاں رہو گے۔ زرغون شہر سے ملک فرید خان کی طرف سے سگنل ملنے کے بعد تم لوگ یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوا اور اپنے دائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ طور خان ہے۔ اور یہ بازت خان ہے۔" اس نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے اور تیسرا آدمی سرخاب اس وقت یہاں نہیں ہے۔ کل وہ آ جائے گا اور وہ بھی تم لوگوں کے ساتھ جائے گا۔"

"کیا ہم اسی مکان تک محدود رہیں گے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" گل رحمٰن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم لوگ یہاں اس کاٹیج میں کرائے دار کی حیثیت سے رہو گے۔ اندرون ملک اور باہر سے آنے والے سیاح یہاں آتے رہتے ہیں اس لئے کسی کو تم لوگوں پر شبہ نہیں ہو گا۔ تم لوگ آزادی سے جہاں چاہو گھوم پھر سکو گے۔ البتہ تم لوگوں کی حفاظت کے لئے طور خان یہاں رہے گا۔ اس کے بارے میں تم یہی بتاؤ گے کہ تم لوگوں نے کرائے پر اس کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ نیچے نشیب میں دریا بہہ رہا ہے۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں مچھلیاں پکڑنے کا سامان رکھا ہوا ہے۔ اس دریا میں دنیا کی بہترین مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ شہر کی طرف جانے کے لئے تم لوگ دریا والا راستہ بھی استعمال کر سکتے ہو۔ وہاں سے فاصلہ کم پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شارق نے سر ہلایا۔ "یہاں ہمارے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہو گا؟"

"طور خان کھانا پکانے کا ماہر ہے۔ مشن کے دوران بھی یہ تم لوگوں کو مزے مزے کے کھانے کھلاتا رہے گا۔" گل رحمٰن نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا "عمر کہاں چلا گیا۔"

"وہ ہمیں چائے پلانے کے بعد دریا کی طرف چلا گیا تھا۔" شارق نے کہا۔

"اوہ!" گل رحمٰن بولا۔ "وہ یقیناً مچھلیاں پکڑنے گیا ہو گا۔ بڑا ہی مہمان نواز لڑکا ہے۔"

"اس میں شبہ نہیں۔" اس مرتبہ نولکھا نے کہا۔ "اس نے یہاں آتے ہی ہمیں چائے بنا پلائی تھی۔ ویسے وہ لڑکا ہے بڑے کمال کا۔"

"آہا۔" گل رحمٰن ہنس پڑا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اس نے یہاں آتے ہی تم لوگوں کو اپ کمال دکھا دیا تھا۔"

"ہاں جی...." نولکھا بولا۔ "بیٹا ہے تمہارا؟"

"نہیں۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ تقریباً پانچ سال پہلے اس کا باپ پہاڑی سے گر کر مر گیا تھا۔ اسے میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کی ٹریننگ کر رہا ہوں۔ نشانہ بازی میں پورے علاقے میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ یہاں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے جس میں نشانہ بازی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ یہ بڑوں کے مقابلے میں حصہ لیتا ہے اور دو سال سے ٹرافی جیت رہا ہے۔ اندھیرے میں بھی آواز پر نشانہ لگا لیتا ہے اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔"

"وہ تو ہم نے دیکھ لیا۔ آج تین گلاس توڑے ہیں اس نے۔" نولکھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی رائفل کا نشانہ دیکھو تو تمہیں اور حیرت ہو گی۔" گل رحمٰن نے کہا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے باہر بیٹھتے ہیں۔ اور طور خان تم ہمیں چائے تو پلاؤ۔"

"بالکل پلاتا ہوں خان۔" طور خان نے جواب دیا۔

وہ لوگ باہر آ گئے جبکہ طور خان باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ اسی وقت انہیں دریا کی طرف سے عمر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے پشت پر کچھ لاد رکھا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا رسی میں بندھا ہوا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے کندھے پر رسی کو پکڑ رکھا تھا۔

وہ لوگ برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد عمر اوپر آ گیا۔ اس نے چھ عدد مچھلیاں پشت پر لاد رکھی تھیں جو ایک رسی میں پروئی ہوئی تھیں۔ وہ ٹراؤٹ فش تھی۔ واقعی کھانے کے لئے دنیا کی بہترین اور لذیذ مچھلی تھی۔

"یہ مچھلیاں طور خان کے حوالے کر دو۔ وہ چائے بنانے کے بعد ان کی صفائی کر لے گا۔" گل رحمٰن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں خود ان کی صفائی کرتا ہوں خان۔" عمر کہتا ہوا کاٹیج کے پچھلی طرف چلا گیا۔

چند منٹ بعد طور خان چائے لے آیا۔

"اس وقت تو تم لوگوں کو بغیر دودھ کی چائے ہی پینا پڑے گی۔ شام کو طور خان دودھ لے آئے گا۔" گل رحمٰن نے کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ اس مکان کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ اس مقصد کے بارے میں تم نے نہیں بتایا تھا۔" شارق نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ چائے پی لو تو پھر بتاتا ہوں۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔

اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ انہیں ساتھ لے کر اٹھ گیا اور کاٹیج کے پچھلی طرف ایک چٹان پر چڑھنے لگا۔ چٹان پر چڑھنے کے لئے ایک تنگ سا عمودی راستہ تھا۔ وہ لوگ بڑی مشکل سے اوپر چڑھ رہے تھے۔

تقریباً پچاس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ کھڑے ہونے کے لئے بڑی مختصر سی جگہ تھی۔ دوسری طرف عمودی اور سپاٹ ڈھلان تھی جو سینکڑوں فٹ نیچے تک چلی گئی تھی۔ ثمینہ ایک بڑے پتھر کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کا پیر پھسل گیا تو نیچے اس کی ہڈیوں کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔

ان کے سامنے ایک تنگ سی وادی تھی۔ جو چٹان سے تقریباً دو ہزار فٹ گہرائی میں تھی۔ اس وادی میں بہت دور بل کھاتی ہوئی ایک سرمئی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ علی مینگل کی طرف جانے والی سڑک ہے۔" گل رحمٰن نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں اس مکان کے بنانے کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ یہاں سے ہم میلوں دور تک اس وادی پر نگاہ رکھ سکتے ہیں۔"

"گڈ۔" شارق مسکرا دیا۔ "بڑی اہم جگہ ہے۔"

"ملیشیا کی پارٹیاں بھی اس طرف پیٹرولنگ کرتی رہتی ہیں۔ جب ہماری کوئی پارٹی آنے والی ہوتی ہے تو ہم یہاں سے نگرانی کرتے ہیں۔ آگے بھی پہاڑوں میں ہماری اسی قسم کی نگران اور حفاظتی چوکیاں قائم ہیں۔"

شارق دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ یہ کام بڑے منظم طریقہ سے ہو رہا تھا۔ گل رحمٰن اسے بتا رہا تھا کہ ہر چوکی میں ایک آدمی چوبیس گھنٹے موجود رہتا ہے جس کے پاس اسی قسم کا جدید ترین ٹرانسمیٹر بھی ہے۔ وہ اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنی آنے والی پارٹی اور ملیشیا کی گشتی پارٹیوں کے بارے میں گل رحمٰن کی اس چوکی زیرو ٹو کو صورت حال سے آگاہ رکھتا ہے۔

وہ لوگ تقریباً آدھا گھنٹہ اوپر کھڑے وادی کا جائزہ لیتے رہے پھر واپس آ گئے۔

"تو تمہارے خیال میں ہم کب تک یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟" شارق نے برآمدے میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ملک فرید خان کی طرف سے سگنل ملنے کے بعد تم لوگوں کی روانگی میں ایک لمحہ بھی تاخیر

نہیں کی جائے گی۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔

"کوئی پیچیدہ معاملہ ہے؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ملک فرید خان دراصل کابل گیا ہوا ہے۔ اس کے واپس آنے کے بعد ہی ہمیں سگنل ملے گا۔" گل رحمٰن نے کہا۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ثمینہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ تھوڑا سا ٹہل لیا جائے۔ جب وہ کرسی سے اٹھی تو گل رحمٰن گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم میری ایک بات غور سے سنو لڑکی!" گل رحمٰن نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں تم اس قسم کا لباس مت پہنو بہتر ہو گا کہ تم کوئی ڈھنگ کا لباس پہنو۔ ان پہاڑوں میں رہنے والے قبائلی بڑے خونخوار ہوتے ہیں۔"

گل رحمٰن کی بات پر ثمینہ دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ گل رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ قبائلی عورتوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔"

"بالکل کرتے ہیں۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "لیکن ان پہاڑوں میں تمہیں جگہ جگہ ایسے قبائلیوں سے واسطہ پڑے گا جنہوں نے برسوں کسی عورت کو نہیں دیکھا۔ تم جیسی عورت تو ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو گی۔"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں گل رحمٰن!" ثمینہ نے جواب دیا' اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

"لیکن پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم اپنا یہ لباس تبدیل کر لو۔" گل رحمٰن نے کہا۔

ثمینہ نے نولکھا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور مسکراتی ہوئی برآمدے سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئی۔ نولکھا بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اور وہ دونوں گھاس کے پلاٹ پر ٹہلتے ہوئے ڈھلان پر اترنے لگے۔ ثمینہ راستے میں رک رک کر پھول توڑ رہی تھی۔ دریا تک پہنچتے ہوئے اس نے خاصا بڑا گلدستہ بنا لیا تھا۔

دریا کا شفاف پانی آئینے کی طرح دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس جگہ پر دریا اگرچہ خاصا گہرا تھا لیکن پانی شفاف ہونے کی وجہ سے نیچے بڑے بڑے پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مچھلی بھی تیرتی ہوئی نظر آ جاتی۔ لیکن جب ثمینہ نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہاں مچھلیاں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔

دریا کا بہاؤ خاصا تیز تھا۔ ثمینہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلدستہ دریا میں اچھال دیا۔ پھول پانی میں بکھر گئے اور تیز رفتار پانی کے ساتھ تیرتے ہوئے بہت جلد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

ثمینہ نے پیروں سے جوگرز اتار لئے اور کنارے کے ایک پتھر پر بیٹھ کر پیر پانی میں لٹکا لئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑی تیزی سے پیر باہر کھینچ لئے۔

"کیا ہوا؟" نولکھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ٹھنڈا پانی ہے۔" ثمینہ بولی۔

کچھ دیر بعد اس نے پیر دوبارہ پانی میں لٹکا دیئے۔ اور آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ پانی واقعی بہت ٹھنڈا تھا۔ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر نولکھا بھی پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں ثمینہ بی بی۔" نولکھا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ٹھنڈا میٹھا اور شفاف پانی' پرسکون ماحول' آلودگی سے پاک فضا' تازہ ہوا..... شہر میں رہنے والوں کو یہ سب کچھ کہاں نصیب ہوتا ہے۔"

"خدا نے انسان کے لئے بڑی نعمتیں پیدا کی ہیں۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن انسان ہی ناشکرا ہے۔ اس نے کبھی ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا نہیں کیا اور ہوس میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو ثمینہ بی بی۔" نولکھا بولا۔

ثمینہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دریا کے دوسری طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکان بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر شہر کی آبادی شروع ہوتی تھی۔ لیکن یہاں سے پورا شہر نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ پھر شارق کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ ثمینہ نے مڑ کر دیکھا۔ مکان کے برآمدے سے ذرا آگے کھڑا شارق ہاتھ کے اشارے سے انہیں بلا رہا تھا۔

ثمینہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے جینز کے پائنچے پنڈلیوں تک موڑ رکھے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنے جوگرز اٹھا لئے اور نولکھا کو اشارہ کرتی ہوئی ڈھلان پر چڑھنے لگی۔ نولکھا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔ اس نے بھی اپنے موکیشن ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔

جب وہ لوگ کاٹیج واپس پہنچے تو بڑے کمرے میں دری پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ کھانے میں صرف فرائی مچھلی تھی جس کی بڑی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ ثمینہ نے مکان میں داخل ہونے سے پہلے اپنی جینز کے پائنچے سیدھے کر لئے تھے۔

مچھلی واقعی بہت لذیذ تھی۔ اس میں فرائی کرنے والے کا بھی کمال تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ

طور خان واقعی لذیذ کھانے تیار کر سکتا تھا۔

مچھلی کھانے کی بعد سبز قہوے کا دور چلا۔ اور پھر گل رحمٰن اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ عمر کے ساتھ واپس شہر چلے جاؤ شارق بابو! اور شام سے پہلے پہلے اپنا سامان لے کر یہاں آ جاؤ۔ ریسٹ ہاؤس والوں سے کہہ دینا کہ تمہیں ایک کاٹیج کرائے پر مل گیا ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے طور خان بھی راشن اور دیگر ضروری سامان لے کر یہاں واپس آ جائے گا۔ تم لوگ یہاں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہو لیکن پہاڑیوں میں زیادہ دور نہیں جانا۔ ایک تو راستہ بھٹک جانے کا اندیشہ ہے اور دوسرے....." وہ خاموش ہو کر معنی خیز نگاہوں سے ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"مطمئن رہو گل رحمٰن!" ثمینہ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ "ہم تمہاری ہدایت پر پورا پورا عمل کریں گے۔"

"اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔" گل رحمٰن نے کہتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔

وہ سب لوگ اس وقت برآمدے میں کھڑے تھے۔ طور خان نے کاٹیج کو تالا لگا کر گچھے میں سے ایک چابی نکال کر شارق کے حوالے کر دی اور گچھا اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"ہم لوگ رسے والے پل کی طرف سے جا رہے ہیں۔ تم لوگ دریا کی طرف سے چلے جاؤ۔ وہ راستہ نسبتاً قریب بھی ہے اور آسان بھی۔ واپسی پر بھی اسی راستے سے آ جانا۔" گل رحمٰن نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور طور خان وغیرہ کے ساتھ اس چٹان کی طرف چلنے لگا جس کے دوسری طرف ندی پر رسوں کا پل تھا۔

ان کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد شارق وغیرہ بھی روانہ ہو گئے۔ ان کا رخ دریا کی طرف تھا۔ ڈھلان کے اختتام پر وہ دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ان کے اور شہر کے درمیان چٹانیں حائل تھیں وہ جیسے ہی دریا کے ساتھ گھوم کر دوسری طرف آئے انہیں شہر دکھائی دینے لگا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد وہ شہر پہنچ گئے۔

بڑی رونق تھی شہر میں۔ اندرون ملک سے آنے والے پاکستانی سیاحوں کے علاوہ غیر ملکی سیاح بھی بڑی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ غیر ملکی عورتوں کے لباس ظاہر ہے ویسے ہی تھے جو ہمارے معاشرے میں باعث شرم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں بھی اونچی سوسائٹی میں اس لباس کو فیشن سمجھ کر اپنا لیا گیا ہے۔ ثمینہ کو بہت سی ایسی پاکستانی خواتین بھی نظر آئی تھیں جنہوں نے پینٹ شرٹس پہن رکھی تھی۔

وہ لوگ کچھ دیر تک بازاروں میں ٹہلتے رہے پھر ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ شارق نے آتے

ہی ریسٹ ہاؤس کے مینجر کو بتا دیا تھا کہ انہیں ایک کاٹیج کرائے پر مل گیا ہے اس لئے وہ چھ بجے سے لگ بھگ ریسٹ ہاؤس چھوڑ دیں گے۔

ثمینہ تھک گئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ شارق اور نوکھا کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

پانچ بجے وہ روانگی کی تیاریاں کرنے لگے۔ ثمینہ نے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹ کر بیگ میں ٹھونس لئے اور چھ بجے سے پہلے ہی وہ ریسٹ ہاؤس سے نکل آئے۔ اس وقت سورج مغربی پہاڑیوں کی طرف جھک رہا تھا۔ یہ لوگ بازار سے ہوتے ہوئے دریا کی طرف چلنے لگے۔ اگر انہیں علم ہوتا کہ پہاڑی علاقوں میں شام جلدی ہو جاتی ہے تو یہ لوگ ایک گھنٹہ پہلے ہی ریسٹ ہاؤس سے نکل آتے۔ جب وہ بازار سے باہر نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور شام بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

پہاڑی علاقوں میں رات کی تاریکی میں چلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان کے پاس کوئی ٹارچ بھی نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ لوگ جس راستے سے آئے تھے اس طرف زیادہ نشیب و فراز نہیں تھے۔ وہ لوگ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلتے رہے۔ اور بالآخر ایک جگہ رک گئے۔ بائیں طرف بلندی پر ایک جگہ روشنی نظر آ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے وہ ہمارا ہی کاٹیج ہے۔" ثمینہ نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں.... میرا بھی یہی خیال ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

وہ دریا سے ہٹ کر ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ وہ کاٹیج تقریباً تین سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے ثمینہ ہانپ گئی۔ برآمدے میں میز پر پیٹرومیکس رکھا ہوا تھا۔ لیکن طور خان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شارق نے ایک دو آوازیں بھی دیں۔ اور پھر اچانک ہی طور خان تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔

طور خان نے ان کا سامان اٹھا کر کمرے میں پہنچا دیا اور خود باورچی خانے میں گھس گیا۔ وہ لوگ برآمدے ہی میں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ثمینہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ ان کے لئے بڑے کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں کیروسین لیمپ جل رہا تھا۔ دوسرے دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ان کمروں میں بھی کیروسین لیمپ جل رہے تھے۔ ثمینہ نے بیگ کو بیڈ پر رکھ کر کھولا اور سلیپنگ سوٹ نکال لیا۔ یہ سلیپنگ سوٹ بھی پاجامے اور بوشرٹ پر مشتمل تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لی اور اپنی ٹی شرٹ اتارنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی نظر عقبی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس

نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ اس میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن پردہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

باہر تاریکی تھی لیکن کمرے میں لیمپ کی روشنی تھی۔ ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت حال میں لباس کس طرح تبدیل کرے۔ یہ سیدھی سی بات اس کی ذہن میں نہیں آئی کہ بیگ سے کوئی کپڑا نکال کر یا بستر کی چادر اٹھا کر کھڑکی پر ڈال دے۔ البتہ اس نے لیمپ کی روشنی کم کر دی اور ایک طرف ہو کر شرٹ اتارنے لگی۔

ثمینہ نے ٹی شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینک دی اور جھک کر بو شرٹ اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ یکدم چونک گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کھڑکی کے باہر کوئی دبے قدموں چل رہا ہو۔ اس نے متوحش نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے بو شرٹ اٹھا کر رخ بدل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بڑی عجلت میں بو شرٹ پہنی' بٹن لگائے اور لپک کر کھڑکی کے قریب پہنچ گئی اور ایک جھٹکے سے کھڑکی کھول دی۔ لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔ ثمینہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر دوبارہ بیڈ کے قریب آ گئی۔ وہ کھڑکی کے قریب بڑی تیزی سے اور اچانک ہی پہنچی تھی۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو ضرور نظر آ جاتا یا اگر وہ بھاگ گیا تھا تو اس کے قدموں کی آواز ہی سنائی دے جاتی۔ لیکن نہ تو کوئی نظر آیا تھا اور نہ ہی کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔

اس نے جینز اتار دی اور پاجامہ پہن لیا۔ اتارے ہوئے کپڑے اس نے اسی طرح پلنگ پر پڑے رہنے دیئے اور لیمپ کی روشنی تیز کر کے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد طور خان نے بڑے کمرے میں دری پر دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ مرغ کا گوشت فرائی کیا گیا تھا اور چپاتیاں تھیں۔

وہ لوگ کھانا کھانے لگے۔ اس دوران طور خان ایک طرف بیٹھا رہا۔ ثمینہ نے محسوس کیا تھا کہ طور خان عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی ثمینہ کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ جب وہ کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی تو باہر سے طور خان تو نہیں جھانک رہا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے فوراً ہی کھڑکی کھول کر دیکھا تھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ ممکن ہے خشک پتے ہوا سے زمین پر لڑھک رہے ہوں اور وہ ان کی آواز کو قدموں کی آواز سمجھی ہو۔

کھانے کے بعد وہ لوگ برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ دریا کے اس پار پہاڑیوں پر بھی کہیں کہیں مدہم سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ مقامی باشندوں کے مکان تھے یا سیاحوں کے کاٹیج اور ریسٹ ہاؤس تھے۔

طور خان بھی باورچی خانے میں اپنا کام ختم کر کے آ گیا تھا اور رائفل کندھے پر لٹکائے برآمدے کے سامنے گھاس پر بیٹھ گیا۔

ان میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ نولکھا اب جمائیاں لینے لگا تھا۔ ثمینہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے دس بجے تھے لیکن لگتا تھا جیسے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہو۔ نولکھا جمائیاں لیتا ہوا اٹھ کر اندر چلا گیا اور بڑے کمرے میں دری پر ہی لیٹ گیا۔ ثمینہ اور شارق تقریباً آدھے گھنٹے بعد اٹھ کر اندر آئے تھے۔ طور خان بھی ان کے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔

"آپ یہ باہر کا دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ اس نے شارق سے کہا۔ پھر ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم کہاں سو گے؟" شارق نے پوچھا۔

"میں باہر ہی رہوں گا۔ میرا تم لوگ فکر نہ کرو۔" طور خان نے جواب دیا۔ اور باہر نکل گیا۔

شارق نے کاٹیج کا مرکزی دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔ اور ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ثمینہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ باورچی خانہ پچھلی طرف تھا اور اس کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ ثمینہ نے وہ دروازہ بھی بند کر کے کنڈا لگا دیا۔

نولکھا خراٹے لے رہا تھا۔ ثمینہ اور شارق کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر سونے کے لئے الگ الگ کمروں میں چلے گئے۔ انہوں نے ایک کمرے میں سونا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ثمینہ نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ اور آگے بڑھ کر کھڑکی کو چیک کرنے لگی۔ کھڑکی میں چھوٹی سی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ وہ چٹخنی اگرچہ زیادہ مضبوط نہیں تھی لیکن دل کی تسلی کے لئے کافی تھی۔ ثمینہ بستر پر لیٹ گئی۔ لیمپ اس نے بجھایا نہیں تھا البتہ روشنی بہت مدہم کر دی تھی۔ وہ کچھ دیر تک بستر پر لیٹی سامنے والی دیوار کو گھورتی رہی اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تھکن کی وجہ سے وہ جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

ثمینہ گہری نیند میں تھی۔ اپنے سینے پر بوجھ محسوس کر کے وہ کسمسائی۔ وہ نیند میں کسمسائی تو وہ بوجھ اس کے سینے سے ہٹ گیا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ سینے پر بوجھ محسوس کرنے لگی۔ اس مرتبہ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اس کے بوجھ کے نیچے دبی چلی جا رہی ہو۔ اس کا سانس گھٹنے لگا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ بوجھ اب بھی اس کے سینے پر موجود تھا۔

ثمینہ کے دماغ پر نیند کا خمار طاری تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ شاید وہ شارق ہے جو اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے کمرے میں آ گیا ہے۔ لیکن دفعتاً" اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ شارق

کے ہاتھوں کا لمس نہیں تھا۔ شارق کے ہاتھوں کے لمس سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ یہ تو بڑے بھاری اور کھردرے ہاتھ تھے جو وحشیانہ انداز میں اس کے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔

ثمینہ کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور کوئی آدمی اسے اپنے نیچے دبائے ہوئے تھا۔

"اے۔ کون ہو تم.....ہٹو....." ثمینہ نے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ وہ شخص پلنگ پر سے کود کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ ثمینہ کو کمرے کے اندھیرے میں ایک تاریک ہیولہ سا حرکت کرتا ہوا نظر آیا اور پھر غائب ہو گیا۔ ثمینہ ایک بار پھر چیخی۔ چند سیکنڈ بعد ہی بڑے کمرے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی شارق کی آواز سنائی دی۔

"ثمینہ..... دروازہ کھولو..... کیا ہوا..... دروازہ کھولو ثمینہ....."

ثمینہ بستر پر خوفزدہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی شارق کی آواز سن کر وہ اچھل کر بستر سے اتری اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے سامنے شارق اور نولکھا کھڑے تھے۔ ثمینہ شارق سے لپٹ گئی۔

"کیا ہوا ثمینہ..... تم چیخ کیوں رہی تھیں؟" شارق اس کا کندھا سہلاتے ہوئے بولا۔

"مم.... میرے کمرے میں کوئی موجود تھا شارق۔" ثمینہ نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ شارق نے کمرے میں جھانکا۔ لیمپ بجھا ہوا تھا۔ البتہ بڑے کمرے میں رکھے ہوئے پیٹرومیکس کی روشنی اندر تک پہنچ رہی تھی۔ ثمینہ کو شارق نے اپنے سے الگ کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے کاٹیج کے باہر کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی طور خان کی آواز سنائی دی۔

"شارق بھائی۔ دروازہ کھولو۔ کیا ہوا؟"

نولکھا نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ طور خان اندر آگیا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رائفل اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا شارق بھائی..... یہ شور کیسا تھا؟" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"کوئی آدمی ثمینہ کے کمرے میں گھس آیا تھا۔ تم کہاں تھے۔" شارق نے اسے گھورا۔

"ہم تو ادھر برآمدے میں سوتا پڑا تھا۔ یہ نیند بھی بوت ظالم چیز ہے۔ بڑے بڑے بہادر لوگ کو پچھاڑ دیتا ہے۔ مگر ادھر کون آئے گا۔ میرا خیال ہے ثمینہ بی بی خواب میں ڈر گیا ہے۔" طور خان نے کہا۔

"ثمینہ خواب میں نہیں ڈری۔ کوئی واقعی اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ دیکھو کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔" شارق نے کہا۔

"طور خان نے کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی نظریں کمرے میں رینگتی ہوئی ثمینہ پر جم گئیں۔ دفعتاً" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ ثمینہ نے اسکی نظروں کا مرکز تاڑ لیا اور جب اس نے نظریں جھکا کر دیکھا تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کی بوشرٹ کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے رخ بدل کر کھڑی ہو گئی اور بٹن بند کرنے لگی۔

"ثمینہ بی بی اگر خواب میں نہیں ڈرا تو ادھر کون آئے گا یار۔" طور خان نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ کھڑکی ہوا سے کھل گیا ہو۔ بوت کمزور ہے یہ کنڈی۔" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ثمینہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طور خان اسے جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا ٹھوس حقیقت کی طرح تھا جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی آدمی اسے دبوچے ہوئے تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی تھی اور اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی تو وہ کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ ہو نہ ہو وہ طور خان ہی تھا۔ کیونکہ طور خان کل ہی سے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں طور خان۔" ثمینہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "کمرے میں کوئی اور تھا۔ میری آنکھ کھل گئی تو وہ کھڑکی سے بھاگ گیا۔ میں نے خود اسے یہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"اچھا یار مان لیتا ہے۔" طور خان نے گویا شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں پھر قصور میرا ہے نا جو ہم سو گیا۔ اب ہم نہیں سوئے گا یارا۔ پہرہ دے گا۔ تم لوگ سو جاؤ..... اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ ڈرو مت جاؤ سو جاؤ اور یہ دروازہ کھڑکی بند کر لو۔" وہ باہر جانے کے لئے مڑا۔ نولکھا اس کے ساتھ تھا۔ طور خان بیرونی دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور نولکھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "نو لاکھ کا بھائی.... گل رحمٰن کو مت بتانا ورنہ وہ میرے کو زندہ نہیں چھوڑے گا کہ تم ڈیوٹی دینے کا بجائے سو گیا تھا۔"

"فکر مت کرو۔ ہم گل رحمٰن کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ لیکن تم جاگتے رہنا۔" نولکھا نے کہا۔ اور طور خان کے باہر جانے کے بعد دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔

شارق ابھی تک ثمینہ کے کمرے میں موجود تھا۔ شارق نے کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگا دی چٹخنی واقعی بہت کمزور تھی اور ہوا کی جھونکے سے بھی کھڑکی کھل سکتی تھی۔

"یہ کھڑکی تو واقعی ہوا کے جھونکے سے بھی کھل سکتی ہے۔ کہیں واقعی تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا تھا۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں شارق۔" ثمینہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے کمرے میں کوئی موجود تھا اور میرے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ طور خان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ کل سے مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہا ہے۔"

"بہرحال، ہمیں..... نہیں بلکہ تمہیں محتاط رہنا پڑے گا۔ گل رحمٰن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تمہیں لباس کے معاملے میں احتیاط برتنی چاہئے۔" شارق نے کہا۔

"لیکن میرے پاس تو سارے لباس ایسے ہی ہیں۔ پینٹ شرٹس۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"کل بازار میں دو تین دکانوں پر میں نے خواتین کے مقامی لباس ٹنگے ہوئے دیکھے تھے۔ صبح بازار جا کر ایک دو جوڑے خرید لئے جائیں گے۔ تین بج رہے ہیں۔ اب تم بھی سو جاؤ۔" شارق نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں اس کمرے میں اکیلی نہیں سوؤں گی۔" ثمینہ نے کہا۔

"میرے کمرے میں آ جاؤ۔" شارق نے کہا۔

وہ دونوں شارق والے کمرے میں آ گئے۔ نولکھا دوبارہ بڑے کمرے میں دری پر لیٹ گیا تھا۔ شارق نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کھڑکی چیک کرنے لگا۔ اس کھڑکی کی چٹخنی ذرا مضبوط تھی لیکن پردہ اس کھڑکی پر بھی موجود نہیں تھا۔

ثمینہ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ شارق نے لیمپ کی بتی بہت دھیمی کر دی اور ثمینہ کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک دھیمے لہجے میں باتیں کرتے رہے پھر ثمینہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ شارق کے سینے پر رکھ دیا اور نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

○

انہیں وہاں رہتے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ جس رات ثمینہ کے ساتھ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا اس سے اگلے ہی روز اس نے بازار سے دو جوڑے کپڑے خرید لئے تھے۔ فراک نما ڈھیلی ڈھالی قمیض اور بڑے گھیر کی شلوار۔ پہلی مرتبہ ثمینہ کو اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں بڑی الجھن محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کا سارا نسوانی حسن چھپ کر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کا یہ ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ

مردوں کی چبھتی ہوئی نظروں سے بچ گئی تھی۔

ان تین دنوں کے دوران گل رحمٰن صرف دو مرتبہ آیا تھا۔ ابھی تک افغانستان سے ملک فرید خان کی طرف سے کوئی سگنل نہیں ملا تھا۔

ثمینہ اور شارق وغیرہ آس پاس کے علاقوں میں گھومتے رہتے۔ نولکھا کبھی ان کی ساتھ ہوتا اور کبھی کاٹیج میں لیٹا رہتا۔ قرب و جوار کے علاقوں میں گھومتے ہوئے بہت سے دوسرے سیاحوں سے بھی ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

وہ چوتھا دن تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ لوگ برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ گل رحمٰن پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ بازت خان بھی تھا۔ گل رحمٰن عام طور پر صبح کے وقت یہاں آیا کرتا تھا لیکن آج اس وقت آیا تھا جب دن ڈھل رہا تھا۔ اور شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ وہ قریب پہنچا تو انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا تھا۔

"ملک فرید کی طرف سے سگنل مل گیا ہے۔" گل رحمٰن نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ کابل سے واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا ہے۔ اور آج رات تم لوگ بھی روانہ ہو رہے ہو۔"

"گڈ۔" شارق کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ سب لوگ یہاں بیکار بیٹھے بیٹھے بور ہو چکے تھے۔ "تو ہمیں کب روانہ ہونا ہو گا؟"

"آج رات۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ آج رات دس بجے یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ طور خان اور بازت خان تمہارے ساتھ جائیں گے۔ میں اور سرخاب خان کسی اور راستے سے نکلیں گے لیکن ٹرانسمیٹر پر ہمارا آپس میں رابطہ ہو گا۔"

"آج رات دس بجے۔" شارق بولا۔

"ہاں۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "میرے دو آدمی خچر لے کر ایک مقررہ مقام پر پہنچ جائیں گے اور تم لوگ ٹھیک دس بجے یہاں سے روانہ ہو گے۔ میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤ گے۔ اور پھر ٹرانسمیٹر پر میرا سگنل ملتے ہی وہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ رات کے آخری پہر تک تم لوگوں کو اس وادی سے نکل جانا ہو گا۔"

"خچروں پر!" ثمینہ نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وحشت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"ہاں خچروں پر۔" گل رحمٰن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "قبائلی عورتیں خچروں اور

گھوڑوں سے بالکل نہیں ڈرتیں۔ وہ زیادہ تر انہی جانوروں پر سفر کرتی ہیں۔ افغانستان کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد تمہیں جگہ جگہ ایسے خانہ بدوش قبائل ملیں گے جو خچروں اور گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔" وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا اور سگریٹ کے پیکٹ سے کسی قدر بڑی سیاہ رنگ کی ایک ڈبیہ جیب سے نکال کر شارق کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹرانسمیٹر ہے جس کے ذریعے میرے اور تمہارے درمیان رابطہ رہے گا۔ اس ٹرانسمیٹر پر سو میل کے علاقے میں بات کی جا سکتی ہے۔" وہ شارق کو ٹرانسمیٹر کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگا۔

"راستے میں ہمیں حفاظت کے لئے اسلحہ کی ضرورت بھی ہو گی؟" شارق نے اس سے ٹرانسمیٹر لیتے ہوئے کہا۔

"جو آدمی خچر لے کر تمہارے منتظر ہوں گے ان کے پاس اسلحہ بھی موجود ہو گا جو تم لوگوں کو دے دیا جائے گا۔" گل رحمٰن نے کہا۔ "تم لوگوں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے علی مینگل پہنچنا ہے۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن تم لوگ جس راستے سے جاؤ گے وہ نہ صرف طویل ہے بلکہ دشوار گزار بھی ہے۔ علی مینگل اگرچہ پاکستانی علاقہ ہے۔ وہاں تک بس بھی جاتی ہے۔ تم لوگوں کو کسی بس میں بھی بھیجا جا سکتا تھا لیکن پاکستانی یا غیر ملکی سیاح اس طرف کا رخ نہیں کرتے۔ قصبہ افغان سرحد کے بہت قریب ہونے کی وجہ سے غیر مقامی لوگ نہ صرف آسانی سے نظروں میں آ جائیں گے بلکہ ان پر کسی قسم کا شبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ تم لوگ علی مینگل کی آبادی سے تقریباً دو میل دور پہاڑیوں میں ایک خاص جگہ پر رک کر ہمارا انتظار کرو گے۔ اس کے بعد آگے کا پروگرام بنائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری ہدایات پر عمل کریں گے۔" شارق نے جواب دیا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" گل رحمٰن کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر پشتو زبان میں طور خان اور بازت خان کو کچھ ہدایات دینے لگا اور پھر سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ بازت اور طور خان کچھ دور تک اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔

نولکھا، ثمینہ اور شارق برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ثمینہ اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ وہ کراچی سے سمندر کے مشن میں بھی شارق وغیرہ کے ساتھ تھی۔ لیکن وہ بات اور تھی۔ ان کے ساتھ گنے چنے لوگ تھے اور کسی قدر مہذب بھی تھے لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ قدم قدم پر خونخوار قسم کے قبائلیوں سے واسطہ تھا۔

آٹھ بجے رات کا کھانا کھا لیا گیا اور پھر وہ لوگ اپنی تیاریاں کرنے لگے۔ ثمینہ نے کپڑے اور دیگر چیزیں بیگز میں پیک کر لیں۔ اور پھر رات کو ٹھیک دس بجے وہ لوگ کاٹیج سے رخصت

گئے۔ ان کا رخ اونچے پہاڑوں کی طرف تھا۔ طور خان سب سے آگے تھا اس کے پیچھے ثمینہ وغیرہ اور آخر میں بازت خان تھا۔

وہ ایک تنگ سے راستے پر مسلسل بلندی کی طرف چلتے رہے اور بالآخر ایک تقریباً عمودی ڈھلان پر اترنے لگے۔ ان کے سامنے نشیب میں وسیع و عریض وادی تھی لیکن ان کا رخ وادی کی طرف نہیں تھا۔ وہ بائیں طرف پہاڑیوں میں ایک تنگ سے رستے پر چلتے رہے۔ بعض جگہوں پر راستہ کشادہ تھا اور وہ پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے لیکن بعض جگہوں پر انہیں ایک قطار میں تنگ سی دراڑ میں سے گزرنا پڑتا۔

ایک گھنٹے بعد وہ ایک کشادہ جگہ پر پہنچ گئے۔ تقریباً سو مربع فٹ کا ایک میدان سا تھا اور چاروں طرف بلند چٹانیں تھیں۔ طور خان نے انہیں ایک بڑے پتھر کے قریب روک دیا اور خود آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ ثمینہ نے ادھر ادھر دیکھا پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔ آسمان پر ستارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ثمینہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں کی تہہ میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ اسی لمحہ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کہیں ان کے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا جا رہا۔ یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا۔

حاجی عبداللہ ایک بین الاقوامی اور خطرناک اسمگلر تھا۔ وہ اپنے مقابلے پر کسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستان میں منشیات کے بہت سے اسمگلر ایسے تھے جو حاجی عبداللہ کی رقابت کا شکار ہوئے تھے۔ بعض کو تو مروا دیا گیا تھا اور بعض جان کے خوف سے یہ دھندہ ہی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے تھے۔ حاجی عبداللہ چاہتا بھی یہی تھا۔

شارق بھی منشیات کی اسمگلنگ میں آ گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاہور کی منشیات کی مارکیٹ پر قابض ہو گیا تھا۔ شارق سے حاجی عبداللہ کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ ایسے لوگوں سے نمٹنے کے بہت سے طریقے تھے۔ یا تو انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے یا انہیں تھوڑا سا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے تاکہ اپنا دھندہ محفوظ رہے۔ حاجی عبداللہ نے شارق کے ساتھ یہی طریقہ استعمال کیا تھا اور اسے لالچ دے کر اپنے کام سے لگا دیا۔ اسے ایک مشن دیا گیا جس میں وہ کامیاب رہا۔ اور اس مشن سے واپس آنے کے بعد شارق پھر اپنے دھندے سے لگ گیا تھا اور حاجی عبداللہ نے اسے اس خطرناک مشن پر بھیج دیا تھا اور اب ثمینہ کے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا کہ حاجی عبداللہ نے شارق کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ تو نہیں بنایا تھا۔ اگر یہاں انہیں قتل کر دیا جائے تو ان کی لاشوں کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔

ثمینہ نے سرگوشیانہ لہجے میں شارق کو اپنے اس اندیشے سے آگاہ کر دیا۔ اس کی بات سن کر بظاہر تو وہ مسکرا دیا تھا لیکن وہ اس پر سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا سکتا تھا۔ اگر واقعی حاجی عبداللہ نے ان کے خلاف کوئی منصوبہ بنایا تھا تو وہ گویا چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا جس سے اپنا دفاع کر سکتے۔ ثمینہ کا یہ اندیشہ ایسا نہیں تھا جسے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا۔ اس نے نولکھا کی طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں ثمینہ کے خدشات سے آگاہ کر دیا۔

"شارق باؤ۔" نولکھا نے بھی سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا۔ "تم فکر ہی نہ کرو۔ ہم مریں گے تو عزت سے' چوہے کی موت نہیں مریں گے۔ مرنے سے پہلے کم سے کم دو آدمیوں کو تو میں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ثمینہ بی بی کا یہ خدشہ بے بنیاد ہے۔ حاجی عبداللہ ایسی کمینی حرکت نہیں کرے گا۔ وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ اگر ہم تینوں میں سے ایک بھی بچ گیا تو اس کی زندگی جہنم بنا دے گا۔"

"بہرحال' ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔" شارق نے کہا۔

وہ تینوں اس طرح پوزیشن میں کھڑے ہو گئے کہ اگر کسی گڑبڑ کے آثار نظر آئیں تو سب سے پہلے طور خان اور بازت خان کو گرفت میں لے لیں۔

شارق ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ تاریکی میں کسی طرف سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب لوگ چونک گئے۔ بازت خان اور طور خان ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے شارق وغیرہ کو پتھر کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا اور دونوں نے رائفلیں اپنے کندھوں سے اتار لیں اور تاریکی میں پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ چند منٹ گزر گئے اور پھر پتھروں کے لڑھکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں چھوٹے چھوٹے پتھر گھوڑوں کے پیروں سے ٹکرا کر لڑھک رہے تھے۔ وہ سب آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی کچھ تاریک ہیولے دکھائی دیئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہیولے کسی چٹان میں سے نمودار ہوئے ہوں۔

"کون ہے۔ وہیں رک جاؤ ورنہ بھون دیئے جاؤ گے۔" طور خان نے پشتو زبان میں چیختے ہوئے کہا۔ اس کی رائفل فائر کے لئے بالکل تیار تھی۔

"ہم دوست ہیں۔ اندھیرے میں دوستوں کو تلاش کرنے آئے ہیں۔" دوسری طرف سے پشتو ہی میں جواب دیا گیا۔

"کوڈ بتاؤ۔" طور خان بولا۔

"مشن نورستان...." دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ وہیں رک جاؤ۔ ہم آ رہے ہیں۔" طور خان نے کہتے ہوئے رائفل نیچے کر لی اور اٹھ کر شارق وغیرہ کے قریب آ گیا۔ "وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

وہ پتھر کی آڑ سے نکل کر اس جگہ آ گئے جہاں گھوڑے کھڑے تھے۔ وہ گھوڑے نہیں دراصل پانچ خچر تھے۔ آدمیوں کی تعداد دو تھی۔ ان سب نے بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ شارق وغیرہ اب بھی بہت محتاط تھے۔

ایک خچر پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ خچروں کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی اور دوسرا خچر پر بندھا ہوا سامان اتارنے لگا۔ ایک تھیلے میں تین کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ ان کے ساتھ بیلٹ بھی تھے جنہیں کراس کی صورت میں سینے پر باندھا جا سکتا تھا۔ ان بیلٹوں میں گولیوں کے بجائے رائفلوں کے میگزین لٹکے ہوئے تھے۔ ہر بیلٹ میں پانچ میگزین تھی۔ خچر پر دو تھیلے تھے جنہیں نہیں اتارا گیا۔

طور خان نے ایک ایک رائفل شارق' ثمینہ اور نولکھا کے حوالے کر دی۔ ثمینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس کا خدشہ واقعی بے بنیاد نکلا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں رائفل کو دیکھا۔ بالکل نئی رائفل تھی۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں رائفل کو چیک کیا اور پھر ایک بیلٹ اٹھا کر گلے میں ڈال لیا۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں بیلٹ باندھنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ بیلٹ بھی خاصا وزنی تھا۔ شارق اور نولکھا بھی اپنے اپنے سینوں پر بیلٹ باندھ چکے تھے۔ ایک ایک بیلٹ طور خان اور بازت خان کے حصے میں بھی آیا تھا۔

طور خان خچروں کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر ایک خچر پر سوار ہو گیا۔ ثمینہ نے کبھی گھوڑے یا خچر کی سواری نہیں کی تھی۔ وہ خچر پر سوار ہوتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ شارق کی مدد سے وہ بڑی مشکل سے خچر پر سوار ہوئی تھی۔

انہوں نے خچروں کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنی منزل کے لئے راونہ ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی سب سے آگے طور خان تھا۔ اس کے پیچھے شارق پھر ثمینہ اور اس کے بعد نولکھا۔ سب سے آخر میں بازت خان تھا۔

وہ لوگ اونچی چٹان میں ایک تنگ سی دراڑ میں داخل ہو گئے۔ آگے جا کر یہ دراڑ کچھ کشادہ ہو گئی تھی۔ خچر آگے پیچھے نپی تلی رفتار سے چل رہے تھے۔ ثمینہ بڑی آک ورڈ پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ حالانکہ خچر بڑے آرام سے چل رہا تھا۔ لیکن لگنے والے ہلکے ہلکے جھٹکوں سے بھی ثمینہ ڈر رہی تھی اور اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

وہ تقریباً دو گھنٹوں تک رکے بغیر پہاڑوں میں ناہموار راستوں پر چلتے رہے اور بالآخر ایک کھلی

جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں سے دائیں طرف بہت دور نشیب میں کچھ روشنیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ روشنیوں کی اس قطار کو دیکھ کر شارق کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ گاڑیاں تھیں۔ شارق گنتی کرنے لگا۔ وہ تعداد میں چھ گاڑیاں تھیں۔ ظاہر ہے بسیں یا مسافر بردار گاڑیاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ رات کو اس وقت تو مال بردار ٹرک ہی ہو سکتے تھے۔

"یہ ملیشیا کے ٹرک ہیں۔" طور خان نے نشیب میں نظر آنے والی ان روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان قبائلی علاقوں میں رات کے وقت کوئی عام آدمی سفر نہیں کرتا۔ مال بردار ٹرک بھی شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے کسی نہ کسی ٹھکانے پر رک جاتے ہیں۔ لیکن ملیشیا کے ٹرک گشت کرتے رہتے ہیں۔"

"کیا ان سے ہمیں کوئی خطرہ تو نہیں؟" نولکھا نے پوچھا۔

"نہیں۔" طور خان نے جواب دیا۔ "سڑک یہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل دور نشیبی علاقے سے گزرتی ہے۔ ہمیں ان ٹرکوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ روشنیاں ایک ایک کر کے غائب ہونے لگیں۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ملیشیا کے وہ ٹرک کسی چٹان کی آڑ میں چلے گئے تھے۔

خچروں کا قافلہ چلتا رہا۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ ثمینہ کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھی تھی۔ لیکن آج وہ تین گھنٹے سے مسلسل خچر پر سفر کر رہی تھی وہ اکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور مسلسل لگنے والے جھٹکوں سے کمر میں تکلیف محسوس کرنے لگی تھی۔ اور جب تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو اس نے خچر روک لیا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" شارق نے بھی خچر روک لیا تھا۔

"جھٹکوں سے کمر میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اب میں یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتی۔" ثمینہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کچھ دیر رک کر آرام کر لینا چاہئے۔" شارق نے کہا اور طور خان کو بھی آواز دے کر روک لیا۔

پورا قافلہ رک گیا۔ شارق خچر سے اتر آیا۔ اس نے سہارا دے کر ثمینہ کو بھی اتار لیا۔ ثمینہ خچر سے اترتے ہی زمین پر لیٹ گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ سب لوگ خچروں سے اتر کر ادھر ادھر بیٹھ گئے تھے۔

اس وقت تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ ثمینہ تقریباً آدھے گھنٹے تک زمین پر لیٹی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور ایک ہاتھ موڑ کر کمر دبانے لگی۔ کمر کی تکلیف کچھ کم ہو گئی تھی۔

اونچے پہاڑوں پر تیز ہوا کی وجہ سے وہ لوگ سردی بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ لیکن ظاہر ہے سردی کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ ان کے بیگز میں کپڑے تو موجود تھے لیکن کوئی سوئیٹر وغیرہ نہیں تھے۔

تقریباً دس منٹ مزید وہاں بیٹھے رہے پھر روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ شارق نے سہارا دے کر ثمینہ کو خچر پر سوار کرا دیا اور پھر خود بھی اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور ان کا قافلہ ایک بار پھر چل پڑا۔

صبح کے پانچ بج گئے۔ سردی کچھ بڑھ گئی تھی۔ ثمینہ کی حالت سب سے زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے وہ ایک بار پھر کمر میں تکلیف محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ رکنا چاہتی تھی لیکن طور خان ان سے بہت آگے تھا اس لئے یہ لوگ بھی اس کے پیچھے چلتے رہنے پر مجبور تھے۔

شارق نے خچر روک لیا اور جب بازت خان اس کے قریب پہنچا تو شارق نے اس سے پوچھا۔

"ابھی کتنا فاصلہ باقی ہے بازت؟"

"میرے خیال میں ابھی ایک گھنٹہ کا راستہ باقی ہے۔" بازت خان نے جواب دیا۔ "ایسا چلتا رہو۔ اللہ مالک ہے پہنچ جائے گا۔"

اور ظاہر ہے وہ چلتے رہنے پر مجبور تھے۔ اس طرح ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ طور خان نے اپنا خچر روک لیا۔ وہ متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اور بالآخر اس نے خچر کا رخ دائیں طرف موڑ دیا۔ دوسرے بھی اس کے پیچھے ہی تھے اور اب وہ مسلسل اترائی کی طرف جا رہے تھے۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ مزید آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد وہ جیسے ہی ایک چٹان کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف پہنچے۔ نشیب میں ایک چھوٹی سی بستی دکھائی دینے لگی۔ یہ بستی چھ سات گھروں پر مشتمل تھی۔ اتنی بلندی سے وہ مکان بچوں کے گھروندوں کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ ایک پہاڑی راستے پر مسلسل نشیب کی طرف اترتے رہے۔ اس بستی تک پہنچنے میں انہیں آدھا گھنٹہ اور لگ گیا تھا۔ اور جب وہ بستی کے قریب پہنچے تو ٹھیک اس وقت سورج طلوع ہوا اور روپہلی دھوپ چاروں طرف پھیل گئی۔

تین آدمی بستی سے نکل کر ان کی طرف آ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے طور خان گھوڑے سے اتر گیا۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شارق نے ثمینہ کو سہارا دے کر نیچے اتار لیا۔ ثمینہ نیچے اترتے ہی پتھریلی زمین پر لیٹ گئی تھی۔

"محراب خان۔" طور خان نے بستی سے آنے والے ایک آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ساتھ ایک زنانہ بھی ہے۔ یہ بوت تھک گیا ہے۔ سردی بھی لگتا ہے اس کو۔ اپنا گھ لے جاؤ اس کو اور کوئی کمبل و بل دو۔ اپنا زنانہ کو بولو۔ اس کا تھوڑا بہت خدمت خاطر کرے۔"

"بہت اچھا خان۔" محراب خان نے کہا اور ثمینہ کی طرف مڑ گیا۔ "آؤ بی بی میرے ساتھ میں آؤ۔"

شارق نے ثمینہ کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ثمینہ محراب خان کے ساتھ چلتی ہوئی بستی کے ایک کچے مکان میں داخل ہو گئی۔ بستی کے تمام مکان کچے ہی تھے۔

اس گھر میں دو عورتیں اور تین بچے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور دوسری جوان جس کی عمر ثمینہ کے اندازے کی مطابق بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ ادھیڑ عمر عورت چولہے میں لکڑیاں جلا رہی تھی اور جوان عورت ایک پرانے سے کنستر میں سے آٹا نکال رہی تھی جبکہ تینوں بچے سو رہے تھے۔

محراب خان نے جوان عورت سے کچھ کہا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر ثمینہ کو ایک کمرے میں لے آئی۔ کمرے کے کچھ حصے پر نمدہ بچھا ہوا تھا اور ایک طرف پانچ چھ پرانے سے فوجی کمبل تہہ کئے ہوئے رکھے تھے۔ اس نے میلے سے غلاف والا ایک تکیہ نمدے پر دیوار کے قریب رکھ دیا اور ثمینہ کو اشارہ کرتی ہوئی کمبل اٹھانے لگی۔ ثمینہ نے رائفل اور بیلٹ اتار کر تکیے کے قریب رکھ دیا اور نمدے پر لیٹ گئی۔ اس عورت نے دو کمبل ثمینہ پر ڈال دیئے۔ ثمینہ اس وقت بڑی شدت سے سردی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹ لیا تھا۔

ثمینہ کا چہرہ کمبل سے باہر تھا۔ جس جگہ وہ لیٹی ہوئی تھی وہاں سے کھلے ہوئے دروازے کے عین سامنے وہ جوان عورت بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی اور ثمینہ بڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ آٹا گوندھنے کے لئے وہ کوئی پرات وغیرہ استعمال نہیں کر رہی تھی فرش پر ترپال کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا اور آٹا ترپال کے اس ٹکڑے پر گوندھا جا رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد آٹا گوندھ کے دسترخوان قسم کے ایک کپڑے میں لپیٹ دیا گیا اور اس کے اوپر ترپال کا ٹکڑا لپیٹ دیا۔ وہ لڑکی ایک طرف جا کر ہاتھ دھونے لگی۔ اور پھر ثمینہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ثمینہ نے اپنا چہرہ بھی کمبل میں لپیٹ لیا۔ اس کے اوپر دو کمبل تھے جو خاصے گرم تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے جسم میں حرارت سی محسوس کرنے لگی۔ اور پھر اپنے قریب ہی ایک نسوانی آواز سن کر وہ چونک سی گئی۔

"خور..... او خورا..... بے بہن..... او بے بہن....."

اس آواز کے ساتھ ہی کسی نے بل پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلایا۔ ثمینہ نے کمبل میں سے منہ

نکال کر دیکھا تو وہ جوان لڑکی چائے کا پیالہ لئے اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ثمینہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن کمبل اس نے اپنے جسم پر لپیٹے رکھا تھا۔ وہ اس وقت واقعی بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہی تھی۔ وہ کمبل لپیٹے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور مسکرا کر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ لے لیا۔ چائے بغیر دودھ کی تھی۔

"اردو جانتی ہو؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"تھورا تھورا....." لڑکی نے جواب دیا۔

"یہ خور کیا ہوتا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"بے.....ہن.....ام.....تو م بے ہن۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

ثمینہ بھی مسکرا دی۔ اسے لڑکی کی یہ ادا بڑی بھلی لگی تھی۔ بڑی حسین تھی یہ لڑکی، گول چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ اس نے ثمینہ کو خور کا مطلب سمجھا دیا تھا کہ وہ اسے اپنی بہن سمجھتی ہے۔"

"میرا نام ثمینہ ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"زینب۔" اس لڑکی نے جواب دیا۔

زینب ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اسے بتا رہی تھی کہ محراب خان اس کا باپ اور وہ عورت اس کی ماں ہے۔ اور تینوں بچے جو دوسرے کمرے میں سو رہے ہیں ان میں ایک اس کی بہن اور دو بھائی ہیں۔ وہ دونوں ابھی باتیں کر ہی رہی تھیں کہ باہر سے زینب کی ماں کی آواز سنائی دی جو اسے بلا رہی تھی۔

"مہمان..... چائے....." زینب نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

ثمینہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مہمانوں کو چائے دینے جا رہی ہے۔ ثمینہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ گرم گرم چائے سے اسے بڑی تسکین مل رہی تھی۔ اس کی سردی بھی اب کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اوپر سے ایک کمبل اتار دیا۔ البتہ دوسرا کمبل لپیٹے رکھا۔ چائے پی کر اس نے خالی پیالہ ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور کمبل لپیٹے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی تھی۔ اس طرح کمر کی تکلیف کو بھی کچھ آرام مل رہا تھا۔

رات بھر جاگتے رہنے اور خچر کی پشت پر سفر سے وہ بری طرح تھک گئی تھی اور اس وقت اسے نڈھال ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر اپنے آپ میں ایک تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت نہ تو اسے تھکن کا احساس ہو رہا تھا اور نہ ہی نیند کا

دور دور تک کچھ پتہ تھا۔ وہ کمبل میں دبکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد باہر سے باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک آواز زینب کی تھی اور دوسری اس کی ماں کی۔

ثمینہ اٹھ گئی۔ اس نے کمبل ایک طرف ڈال دیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ زینب اس وقت چولہے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ چولہے پر توا چڑھا ہوا تھا۔ یہ توا دیکھ کر بھی ثمینہ کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ پتھر کا ایک آڑھا ترچھا ٹکڑا تھا جس کی موٹائی چوتھائی انچ کے برابر تھی۔ آٹے والا ترپال زینب کے سامنے بچھا ہوا تھا اور زینب اس پر پیڑے کو ہاتھ سے دبا دبا کر روٹی بیل رہی تھی۔ اس نے روٹی توے پر ڈالی تو ثمینہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ روٹی بھی آڑھی ترچھی تھی اور اسکی موٹائی بھی چوتھائی انچ کے برابر تھی۔

زینب نے پہلی روٹی پکا لی تو ثمینہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے لگی۔ زینب نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تو زینب چولہے کے سامنے سے اٹھ گئی۔ اس کی جگہ ثمینہ بیٹھ گئی۔ اور آٹا لے کر پیڑا بنانے لگی اور جب وہ پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر روٹی بنانے لگی تو زینب اور اس کی ماں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور پھر ثمینہ نے روٹی توے پر ڈالی تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ روٹی بالکل گول اور بہت پتلی تھی۔

باقی روٹیاں ثمینہ ہی نے پکائی تھیں۔ اور جب وہ چولہے کے سامنے سے اٹھی تو زینب مسکراتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"مجھے..... سکھائے..... گا؟" وہ ثمینہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ضرور سکھائے گا۔" ثمینہ نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

زینب کی ماں دوسری چولہے پر سوکھا ہوا گوشت تل رہی تھی۔ زینب نے اسے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا کہ وہ لوگ گوشت کو سکھا کر محفوظ کر لیتے ہیں اور حسب ضرورت نکال کر تل لیتے ہیں۔ ناشتے میں یہی تلا ہوا گوشت اور ثمینہ کی ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیاں تھیں۔

ناشتہ کرنے کے بعد ثمینہ دماغ پر کچھ بوجھ سا محسوس کرنے لگی۔ اب اسے تھکن اور نیند کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ کمرے میں آ کر نمدے پر لیٹ گئی اور کمبل اوڑھ لیا۔ زینب بھی اس کے قریب بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ نیند کے بوجھ سے ثمینہ کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ اور پھر وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ زینب اسے بتا رہی تھی کہ کھانے کے وقت اس نے ثمینہ کو جگانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ ثمینہ نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا تو زینب نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا۔ زینب کے ہاتھ کی پکی ہوئی

آڑھی ترچھی موٹی روٹیاں اور تلا ہوا گوشت تھا۔ ثمینہ کو بھوک لگ رہی تھی اسے یہ کھانا بہت لذیذ محسوس ہوا۔

"دوسرے مہمان کہاں ہیں؟" ثمینہ نے کھانے کی بعد زینب سے پوچھا۔

زینب نے اشارے سے بتایا کہ وہ ساتھ والے مکان میں ہیں۔ ثمینہ باہر جانے لگی تو زینب نے لپک کر اس کی رائفل اور بیلٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اپنا ساتھ رکھو..... بوت..... ضروری۔" اس نے کہا۔

ثمینہ نے رائفل کندھے سے لٹکا لی اور گولیوں والا بیلٹ گلے میں ڈالنے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر مکان سے باہر آ گئی۔ مکان کے سامنے پانچ چھ بچے کھیل رہے تھے۔ محراب خان بھی دروازے کے سامنے رکھے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ ثمینہ کو دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ثمینہ نے شارق وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے ساتھ والے مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔ ثمینہ اس دروازے میں گھس گئی۔

اس بستی میں کل چھ سات مکان تھے۔ اور سب کے سب گارے اور مٹی سے بنے ہوئے تھے۔ اس مکان کے سامنے بھی ایک مختصر سا صحن تھا اور اس سے آگے دو کمرے تھے۔ صحن میں ایک طرف نیلے رنگ کا ہارڈ پلاسٹک کا ایک بہت بڑا بیرل نما ڈرم رکھا ہوا تھا۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ بیرل ظاہر ہے کسی قسم کے کیمیکل کے کنٹینر کے طور پر بنایا گیا ہو گا لیکن پسماندہ علاقوں میں انہیں پانی کے لئے ستعمال کیا جاتا تھا جو انسانی صحت کے لئے خطرناک تھا۔ لیکن لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تھے۔

سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نولکھا اور شارق زمین پر بچھے ہوئے نمدے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آؤ ثمینہ بہن۔" نولکھا اسے دیکھتے ہی بولا۔ "ہم تو سمجھے تھے کہ یہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے شاید تمہیں غائب کر دیا ہے۔"

"مجھے کون غائب کر سکتا ہے۔" ثمینہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "صبح ناشتہ کرنے کے بعد میں سو گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو اٹھی ہوں۔"

"ہم بھی سو گئے تھے۔" نولکھا نے جواب دیا۔ "رات کے سفر نے تو ہمیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ اور خچروں کی سواری سے تو میری چال ہی بگڑ گئی ہے۔"

"ابھی آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔" ثمینہ نے کہا پھر شارق کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "کیا پروگرام ہے۔ گل رحمٰن یہاں پہنچا یا نہیں؟"

"گل رحمٰن خود تو نہیں آیا لیکن ٹرانسمیٹر پر اس کا پیغام ملا تھا۔ ہمیں تین چار دن یہیں رہنا ہو گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ ہم لوگ اسی طرح خوار ہونے کے لئے گھر سے نکلے ہیں؟" ثمینہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

"مجبوری ہے۔" شارق نے کندھے اچکا دیئے۔ "اس کا کہنا ہے کہ زرغون میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ملک فرید خان نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ ہم لوگ چند روز انتظار کر لیں۔ حالات جیسے ہی بہتر ہوں گے وہ ہمیں سگنل دے دے گا۔ اس دوران ہم یہاں تھوڑی سی تفریح کر لیں۔"

"کیا یہ کوئی پکنک پوائنٹ ہے۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"ثمینہ بہن۔" نولکھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ واقعی ایسی ہے کہ یہیں زندگی گزار دینے کو دل چاہتا ہے۔ ہر طرف قدرتی حسن بکھرا ہوا ہے۔"

"تو تم یہاں کمرے میں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ..... باہر جا کر قدرت کا حسن سمیٹتے رہو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"ہمارے پاس تین چار دن ہیں۔ آرام سے سمیٹتے رہیں گے یہاں کا قدرتی حسن۔" نولکھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک اور بات۔" شارق نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے آگے کم از کم دو دن کا سفر ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں میں یہ سفر ہمیں خچروں اور گھوڑوں پر ہی کرنا پڑے گا۔ صبح طور خان کہہ رہا تھا کہ گزشتہ رات تمہاری وجہ سے سب کو کچھ پریشانی ہوئی تھی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان دو تین دنوں کے دوران تم یہاں خچر کی سواری کی پریکٹس کر لو۔ تاکہ آگے کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"خچر پر سواری کی پریکٹس۔" ثمینہ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"ہاں۔ میرے خیال میں یہ ضروری ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "طور خان یہ بھی بتا رہا تھا کہ محراب خان کی بیٹی زینب خچر اور گھوڑے کی سواری جانتی ہے۔ وہ تمہیں پریکٹس کروا دے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔" ثمینہ نے کہا۔

"شارق باؤ..... باہر چلتے ہیں یار۔ یہاں کمرے میں بیٹھے بیٹھے تو بور ہونے لگے ہیں۔" نولکھا نے کہا۔

وہ لوگ اٹھ کر مکان سے باہر آ گئے۔ شارق اور نولکھا نے بھی اپنی اپنی رائفلیں اور گولیوں

والے بیلٹ اٹھا لئے تھے۔

محراب خان اب بھی باہر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ شارق نے اس سے طور خان اور بازت خان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں تو دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہی کہیں چلے گئے تھے۔

وہ تینوں ٹہلتے ہوئے بستی سے نکل گئے۔ نولکھا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں ہر طرف قدرتی حسن بکھرا ہوا تھا۔ چیڑ اور چنار کے فلک بوس درخت اور ہر طرف بچھا ہوا مخملیں گھاس کا فرش۔ کھلے ہوئے خوش رنگ جنگلی پھول.....

اس بستی کے چاروں طرف ایک مختصر سی وادی تھی اور اس وادی کے اختتام پر اونچے پہاڑ تھے۔ یہ کوہ قراقرم کا سلسلہ تھا جو بہت دور تک چلا گیا تھا۔ وہ تینوں ٹہلتے ہوئے چشمے پر پہنچ گئے۔ پانی ایک چھوٹے سے جھرنے کی صورت میں ایک چٹان کی دراڑ سے گر رہا تھا اور اس سے آگے ایک تنگ سے ندی کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

"انسان واقعی ناشکرا ہے۔" نولکھا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی نعمتوں سے نوازا ہے لیکن ایک ہم ہیں کہ....."

"نولکھا بھائی۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت فلسفہ بگھارنے لگے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"یہ فلسفہ نہیں ثمینہ بی بی۔ یہ ایک ان پڑھ اور جاہل آدمی کے دل کی آواز ہے۔" نولکھا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تم خود ہی سوچو۔ کتنی نعمتیں دی ہیں ہمیں اللہ نے اور ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہم فساد پھیلا رہے ہیں اللہ کی زمین پر....."

"بس بس۔" ثمینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔ "اب ناصح بننے کی کوشش مت کرو۔"

"یہ ناصر کون ہے ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے کہا۔

"ناصر نہیں ناصح۔" ثمینہ نے اسے سمجھایا۔ "نصیحت کرنے والا۔ تمہاری طرح وعظ کرنے والا۔"

"میں تو بہت گناہگار آدمی ہوں ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے جواب دیا۔

ثمینہ نے بات آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ادھر ادھر گھومتے رہے اور جب سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا تو وہ بستی میں واپس آ گئے۔ طور خان اور بازت خان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

رات کا کھانا شام ڈھلتے ہی کھا لیا گیا۔ روشنی کے لئے کیروسین آئل کے دیوں کا انتظام تھا۔ ٹن کے ڈبوں میں سوراخ کر کے ان میں تیل اور کپڑے کی بٹی ہوئی بتیاں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ لیمپ جلنے سے دھواں پھیل رہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے یہ سب کچھ انہیں برداشت کرنا تھا۔

ثمینہ کے لئے محراب خان کے گھر میں انتظام کیا گیا تھا۔ وہ اور زینب ایک ہی کمرے میں ایک ہی بستر پر سوئی تھیں۔ رات کو وہ دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ زینب اسے بتا رہی تھی کہ ان علاقوں میں رہنے والے قبیلوں میں دشمنیاں نسل در نسل چلتی ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے وہ لوگ مہمند ایجنسی میں تھے۔ لیکن خاندانی دشمنوں کی وجہ سے کئی سال پہلے اس کا باپ انہیں لے کر یہاں آ گیا تھا۔ ملک فرید خان نے انہیں پناہ دی تھی۔ ملک فرید خان اگرچہ افغانستان کا رہنے والا تھا لیکن اس کا قبیلہ سرحد کے دونوں طرف آباد تھا۔ آزادانہ آمد و رفت تھی۔ یہ علاقہ بھی ملک فرید خان کی عمل داری میں تھا وہ کبھی افغانستان والے علاقے میں رہتا اور کبھی پاکستان میں آ جاتا۔ اس کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور کچھ دشمنیاں بھی تھیں۔

زینب نے بتایا کہ چند سال پہلے ایک دشمن قبیلے کے چند آدمیوں نے اس بستی پر حملہ کر دیا تھا۔ اس بستی میں محراب خان کے خاندان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی آباد تھے۔ حملہ آور بستی سے دو عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ ملک فرید خان کو پتہ چلا تو اس نے دشمن قبیلے پر حملہ کر دیا اور نہ صرف ان کے چھ سات آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا بلکہ ان کی تین عورتیں بھی اٹھا لایا تھا جنہیں بعد میں واپس کر دیا گیا تھا۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ قبائلی لوگ عورت کا بہت احترام کرتے ہیں اور اپنی لڑائی میں عورتوں اور بچوں کو شامل نہیں کرتے۔" ثمینہ نے کہا۔

"ہاں یہ درست ہے۔" زینب نے جواب دیا۔ "لیکن جب فریق مخالف اس قسم کی اوچھی حرکتوں پر اتر آئے تو اسے جواب دینا ہی پڑتا ہے۔ ملک فرید خان عورتوں کا بڑا احترام کرتا ہے۔ وہ جن عورتوں کو اٹھا کر لایا تھا انہیں بڑی عزت و احترام سے رکھا گیا تھا اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنے دی گئی تھی..... اس واقعہ کے بعد مخالف قبیلے کو فرید خان کے علاقے میں داخل ہونے کی جرات بھی نہیں ہوئی۔"

"ملک فرید خان ہے کون؟" ثمینہ نے سوال کیا۔

"قبیلے کا سردار ہے۔" زینب نے جواب دیا۔ "وہ جس مکان میں رہتا ہے وہ دراصل بہت بڑا قلعہ ہے۔ روسیوں کے خلاف جنگ کے دوران اس کا قلعہ افغان مجاہدین کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ملک فرید خان نے خود تو کبھی جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن وہ افغان مجاہدین کی ہر طرح

سے بڑی مدد کرتا رہا تھا۔"

"اور غالباً آج وہ مجاہدین پر اپنے احسانات کا معاوضہ وصول کر رہا ہے۔" ثمینہ نے کہا مگر زینب اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔

وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر ثمینہ نے کہا۔

"سنا ہے تم گھڑسواری اچھی کر لیتی ہو۔ کل میں پہلی مرتبہ خچر پر سوار ہوئی تھی۔ بری حالت ہو گئی تھی۔ ہمارا یہاں تین چار دن رہنے کا پروگرام ہے۔ اس دوران تم مجھے خچر پر سواری کی پریکٹس کرا دو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں صبح تمہیں ساتھ لے چلوں گی۔" زینب نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر اور باتیں کرتی رہیں پھر زینب کروٹ لے کر ثمینہ سے لپٹ گئی۔ ثمینہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔

حسب معمول صبح وہ جلدی اٹھ گئیں۔ ناشتہ زینب اور ثمینہ نے مل کر تیار کیا تھا۔ ناشتے کے بعد ثمینہ دوسرے مکان میں آ کر کچھ دیر شارق اور نولکھا سے باتیں کرتی رہی۔ وہاں اس وقت طور خان اور بازت خان بھی موجود تھے۔ وہ لوگ رات کو دیر سے آئے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ گئے کہاں تھے۔ ثمینہ یا شارق نے ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

زینب والے مکان میں واپس آ کر ثمینہ نے لباس تبدیل کیا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن لی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں شلوار قمیض میں خچر یا گھوڑے پر سواری نہیں کی جا سکتی تھی۔ جب وہ لباس بدل کر کمرے سے باہر نکلی تو زینب بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ خود عورت تھی لیکن ثمینہ کو اس لباس میں دیکھ کر خود اس کے جسم پر بھی چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ پھر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔

"چلو... میں تیار ہوں۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

زینب نے اپنے چھوٹے بھائی جس کی عمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی، کو بلا کر اپنی زبان میں کچھ کہا اور ثمینہ کے ساتھ مکان سے باہر آ گئی۔ زینب کا بھائی بھی ان کے ساتھ ہی باہر آیا تھا لیکن وہ دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ وہ دونوں بستی کی مختصر سی گلی میں سے گزرتی ہوئی دوسری طرف آ گئی تھیں۔ بستی سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر شہتوت کے ایک درخت کے نیچے رک کر انتظار کرنے لگیں۔

تقریباً دس منٹ بعد زینب کا بھائی آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے دو خچروں کی لگامیں پکڑ رکھی تھیں اور دونوں خچر بڑی سعادت مندی سے سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ زینب نے دونوں خچروں کی لگامیں پکڑ لیں۔

"تم اس پر سوار تو ہو سکتی ہو نا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اگرچہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بات کر رہی تھی مگر مفہوم ثمینہ کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"ہاں..... میں نے رات بھی اسی خچر پر سواری کی ہے۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ایک خچر کی لگام پکڑ لی اور چند گز دور ایک بڑے پتھر کے قریب چلی گئی۔ وہ پتھر پر چڑھ گئی اس نے ایک پیر خچر کی رکاب میں رکھا اور بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہوئی خچر پر سوار ہو گئی۔

زین پر اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی وہ پہلی مرتبہ از خود خچر پر سوار ہوئی تھی اور ڈر رہی تھی۔

زینب مسکراتی ہوئی نظروں سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے زمین پر کھڑے کھڑے ایک پیر رکاب میں رکھا اور اچک کر زین پر بیٹھ گئی۔

دونوں خچر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ زینب کا بھائی وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ زینب نے ثمینہ کی طرف دیکھا اور پھر اسے سمجھانے لگی کہ اسے خچر یا گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے کیا طریقہ استعمال کرنا چاہئے اور اگر طریقہ درست ہو گا تو وہ گھنٹوں بغیر تھکان کے خچر یا گھوڑے پر سفر کر سکتی ہے۔ پوسچر درست ہونے سے اس کا توازن برقرار رہے گا اور گھوڑا یا خچر کتنی بھی تیز رفتاری سے کیوں نہ دوڑ رہا ہو اس کے گرنے کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ لیکن اگر بیٹھنے کا پوسچر درست نہیں ہو گا تو وہ نہ صرف بے چینی اور تکلیف محسوس کرے گی بلکہ توازن بھی قائم نہیں رکھ سکے گی اور ہر وقت گرنے کا بھی خطرہ رہے گا۔

ثمینہ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہی اور اس نے محسوس کیا تھا کہ زینب کے بتائے ہوئے طریقے پر بیٹھنے سے ایک گھنٹے بعد بھی اس کی کمر میں تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اس کا توازن بھی برقرار رہا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وادی میں چلتے رہنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی ندی کے قریب رک گئیں۔

"میرا خیال ہے کہ کچھ دیر یہاں سستا لیا جائے۔" ثمینہ کہتے ہوئے خچر سے اتر آئی۔ زینب نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

انہوں نے خچروں کو کھلا چھوڑ دیا۔ وہ گھاس چرنے لگے اور یہ دونوں ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ دفعتاً ثمینہ کی نظر سامنے والی پہاڑی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ پہاڑی درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ثمینہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے درختوں کے جھنڈ میں جھاڑیوں کے پیچھے کسی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہو۔

"کیا بات ہے؟" زینب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس پہاڑی پر درختوں کے جھنڈ میں کوئی موجود ہے۔" ثمینہ نے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

زینب کی پشت پہاڑی کی طرف تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا لیکن اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

"کوئی جانور ہو گا۔" وہ سیدھی ہوتی ہوئی بولی۔ "ان پہاڑیوں پر مار خور اور چرخ بہت ہوتے ہیں۔ بھیڑیئے بھی پھرتے رہتے ہیں۔"

ثمینہ چند لمحے پہاڑی کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے بھی توجہ ہٹا لی۔ لیکن تقریباً دو منٹ بعد ہی اس کی آنکھوں پر کسی چیز کی چمک پڑی تو اس نے چونک کر دوبارہ پہاڑی کی طرف دیکھا۔ اسے جھاڑیوں کے اوپر ایک آدمی کا سر دکھائی دیا تھا جس نے بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس شخص کے کندھے پر رائفل لگی ہوئی تھی اور چمک اس رائفل کی نال کی تھی۔ سورج سامنے کے رخ پر تھا اور رائفل کی نال دھوپ میں چمک رہی تھی۔

"زینب..... اٹھو..... واپس چلیں۔ اس پہاڑی پر کوئی موجود ہے۔" ثمینہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی ابھی دھوپ میں ایک رائفل کی نال کو چمکتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے ایک آدمی کا سر بھی نظر آیا تھا جس نے پگڑی باندھ رکھی ہے۔ میرا خیال ہے کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہے۔"

"ہماری نگرانی کون کرے گا۔" زینب اٹھتے ہوئے بولی۔ "لیکن اگر تمہیں کسی قسم کا ڈر محسوس ہو رہا ہے تو واپس چلتے ہیں۔"

انہوں نے خچروں کو پکڑا اور ان پر سوار ہو گئیں۔ اس مرتبہ ثمینہ نے کسی پتھر کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ زینب کی طرح زمین پر کھڑے کھڑے رکاب میں ایک پیر رکھا اور اچک کر خچر پر سوار ہو گئی۔ واپسی میں زینب نے اسے خچر بھگانے کو کہا۔ ثمینہ ڈر رہی تھی لیکن اس نے خچر کو ہلکی رفتار میں دوڑا دیا۔ لیکن اس نے فوراً ہی رفتار کم کر دی۔

اس روز ثمینہ کی کمر میں تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ اس نے مجموعی طور پر تقریباً تین گھنٹوں تک خچر کی سواری کی تھی۔

پہاڑی پر ثمینہ نے درختوں کے جھنڈ میں جس شخص کا سر دیکھا تھا اس کے بارے میں ثمینہ کو شبہ تھا کہ وہ طور خان ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہ بستی واپس پہنچیں تو اس کا شبہ غلط ثابت ہوا۔ طور خان' شارق کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور بازت خان بھی وہاں موجود تھا۔ ان دونوں کے بارے میں بعد میں ثمینہ کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ لوگ صبح سے بستی سے باہر نہیں گئے تھے۔

وہ تیسرا دن تھا۔ ثمینہ اب باقاعدہ خچر کو دوڑانے لگی تھی۔ اس روز ان دونوں نے شرط باندھ کر ریس لگائی تھی اور بستی کے دوسری طرف تقریباً تین میل دور نکل گئی تھیں۔ اس طرف بھی ایک چھوٹی سی ندی تھی۔ ندی کے قریب پہنچ کر انہوں نے خچر روک لئے۔ اور نیچے اتر کر قہقہے لگانے لگیں۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔" زینب نے ثمینہ کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو خچر ہے اب تم گھوڑا بھی دوڑا سکتی ہو۔"

"یہ سب تمہاری محنت کا نتیجہ ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "اگر تم میرا ساتھ نہ دیتیں تو آج میں اس طرح تیز رفتاری سے خچر نہ دوڑا سکتی۔"

وہ دونوں ندی کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔ ان کے چاروں طرف گنجان درخت تھے اور قد آدم خود رو پودے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔

انہیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اور پھر دفعتاً" اپنے عقب میں پودوں کی سرسراہٹ سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' تیز ہوا سے پودے حرکت کر رہے تھے اور ان میں سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ مڑ کر دوبارہ زینب سے باتیں کرنے لگی۔ زینب نے اس کے چہرے کے تاثرات سے تاڑ لیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہو رہی ہے۔

"کیا بات ہے تم بات بات پر چونک جاتی ہو؟ تمہارے دل میں کسی قسم کا خوف ہے کیا؟" اس نے ثمینہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"ہم جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اس میں قدم قدم پر ہمیں خطرات کا سامنا رہتا ہے۔ اگر ہم احتیاط سے کام نہ لیں تو کسی بھی وقت بے خبری میں مارے جا سکتے ہیں۔" ثمینہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کی بعد بولی۔ "تم جانتی ہو کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور افغانستان کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں میں سب جانتی ہوں۔" زینب نے جواب دیا۔ "ملک فرید خان اب واقعی افغان مجاہدین سے اپنے احسانات کا معاوضہ وصول کر رہا ہے۔ وہ پہلے انہیں روسیوں کے خلاف لڑنے کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود سپلائی کرتا تھا۔ روپے پیسے سے بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ لیکن اس وقت بھی وہ

اپنے احسانات کی قیمت وصول کر رہا تھا اور اب بھی کر رہا ہے۔ روسیوں سے چھینا ہوا اسلحہ اب افغان مجاہدین کے لئے بوجھ بن گیا ہے۔ لڑائی اب صرف کابل اور اس کے گرد و نواح میں صرف حصول اقتدار کے لئے ہو رہی ہے۔ جبکہ پورے ملک میں روسیوں کے خلاف جنگ میں جن مجاہدین نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا وہ اب یہ اسلحہ بیچ بیچ کر اپنا نقصان پورا کر رہے ہیں۔ ملک فرید خان ان کا سب سے بڑا گاہک ہے۔ وہ آٹے کی ایک بوری کے بدلے کم از کم دس کلاشنکوف رائفلیں وصول کرتا ہے مجاہدین بڑی خوشی سے یہ سودا منظور کر لیتے ہیں۔ دس رائفلیں انہیں کھانے کو کچھ نہیں دے سکتیں جبکہ ان کے بدلے ملنے والی آٹے کی ایک بوری سے وہ چند روز تک پیٹ کی آگ تو بجھا لیتے ہیں۔

ہماری یہ چھوٹی سی بستی ملک فرید خان نے ہم پر ترس کھا کر نہیں بسائی' یہ بستی علی مینگل شہر سے تقریباً پانچ میل اور ہائی وے سے تقریباً دس میل دور ہے۔ ملک فرید خان کے قافلے جب افغانستان سے ہیروئن اور اسلحہ کی کھیپ لے کر آتے ہیں تو سرحد پار کرنے کے بعد یہ ان کا پہلا پڑاؤ ہوتا ہے۔ وہ اپنا سارا مال یہاں رکھتے ہیں۔ بستی کے مکان بظاہر کچے جھونپڑے نظر آتے ہیں مگر انکے نیچے بڑے بڑے تہہ خانے ہیں جہاں مال رکھا جاتا ہے اور پھر وہی تھوڑا تھوڑا کر کے اندرون ملک منتقل کر دیا جاتا ہے۔

میں جانتی ہوں تم کس مقصد کے لئے افغانستان جا رہے ہو۔ تم لوگوں کے بارے میں میں کئی روز پہلے اطلاع مل گئی تھی۔ یہاں پارٹیاں آتی رہتی ہیں جن میں عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں۔ لیکن پہلی مرتبہ ایک عورت کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ تم اتنی پیاری سی ہو۔ خطرات سے کیوں کھیل رہی ہو؟"

"اب تو خطرات میری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔" زینب نے کہا۔ "یہ طور خان بڑا کمینہ اور خطرناک آدمی ہے۔ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ مجھ پر بری نیت رکھتا ہے لیکن ملک فرید خان کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم اس سے ذرا ہوشیار رہنا وہ جن نظروں سے تمہیں دیکھتا ہے اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہارے بارے میں بھی اس کی نیت اچھی نہیں ہے۔"

"میں اسے اچھی طرح جان چکی ہوں۔" ثمینہ نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو واقعی وہ بہت خبیث آدمی ہے۔ لیکن مجھے اس جیسے آدمیوں سے نمٹنا بھی آتا ہے۔"

وہ باتیں کر رہی تھیں کہ پودوں میں ایک بار پھر سرسراہٹ کی تیز آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ

ان دونوں نے مڑ کر دائیں طرف دیکھا تھا اور پھر اس کے ساتھ ہی ثمینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ زینب بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے خوف کی ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

قد آدم پودوں سے دو آدمی نکل کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر آٹو میٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی اور دوسرے کے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ان کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس انداز میں آگے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی شکاری کسی شکار کو گھیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کون ہو تم لوگ؟" ثمینہ نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"طور خان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔" ان میں سے ایک آدمی نے جواب دیا۔ "تم تو واقعی قیامت ہو قیامت۔"

"اور تم شاید یہ نہیں جانتے کہ جب قیامت ٹوٹ پڑتی ہے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔" ثمینہ نے کہا۔

"ایسی قیامت کو تو ہم ہنسی خوشی سہہ لیں گے۔" پستول والے نے دو قدم اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ اور کراہت سی آ گئی تھی۔

"دور رہو ہم سے۔" اس مرتبہ زینب نے چیختے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ "تم لوگ اس علاقے کے تو نہیں لگتے۔ کون ہو تم لوگ؟ کہاں سے آئے ہو اور طور خان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"ہم بھی اسی زمین کے رہنے والے ہیں اور طور خان ہمارا دوست ہے۔" اسی شخص نے جواب دیا۔ "ہم طور خان سے اپنی دوستی کا حق ادا کرنے آئے ہیں۔ یہ قیامت تو طور خان کی گود میں جائے گی اور تم.... تم پر ہمارا حق ہے۔"

"تم شاید نہیں جانتے کہ ہمارا تعلق ملک فرید خان سے ہے اور یہ علاقہ بھی اسی کا ہے۔ تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ چوروں کی طرح آئے ہو اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ ورنہ ملک فرید تمہارے پورے قبیلے کو ملیامیٹ کر دے گا۔" زینب نے کہا۔

"ملک فرید خان۔" پستول والے نے قہقہہ لگایا۔ "فرید خان کے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ تمہیں زمین نگل گئی یا آسمان نے اچک لیا ہے۔ ہم تمہیں ایسی جگہ لے جا کر رکھیں گے جہاں فرید خان کا پورا قبیلہ بھی تم لوگوں کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔ تم دونوں کے لئے بہتری ہے

کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو۔ ورنہ ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں گے۔"

وہ دونوں ان کے بالکل سامنے آ گئے۔ پستول والے نے ہولسٹر سے پسٹول نکال لیا تھا اور دوسرے آدمی نے بھی کندھے سے رائفل اتار لی تھی۔

ثمینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ آج وہ اپنی رائفل لے کر نہیں آئی تھی حالانکہ وہ جب بھی زینب کے ساتھ بستی سے باہر نکلی رائفل اس کے کندھے پر ضرور ہوتی تھی لیکن آج اس نے رائفل کو فالتو بوجھ سمجھ کر مکان پر ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس کے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمی مسلح تھے۔ اور ان کے ارادے بھی خطرناک تھے لیکن ثمینہ بھی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی تو نہیں تھی۔ ماضی میں وہ کئی بار اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال کا سامنا کر چکی تھی۔ اس نے موت کی آنکھوں میں جھانکنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس قسم کی صورت حال میں جوش سے کام بگڑ جاتا ہے۔ ایسے موقع پر تو ہوش اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت بھی ثمینہ نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے زینب کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ سے مخصوص اشارہ کیا اور پستول والے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں لیکن تم ہمیں ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ راستے میں تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے لیکن اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد تم لوگ ہمارا ہاتھ نہیں روک سکو گی۔" پستول والے نے کہا۔

وہ دونوں ان کے آگے چل پڑیں۔ پستول والا دائیں سمت ثمینہ کی طرف تھا اور رائفل والا زینب کی طرف۔ وہ جھاڑیوں سے نکل کر دوسری طرف آ گئے ادھر تقریباً سو فٹ نشیب میں درختوں کے ساتھ دو گھوڑے بندھے ہوئے نظر آئے۔

ثمینہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کچھ سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا۔ طور خان ان کی نگرانی کرواتا رہا تھا اور بالآخر آج انہیں اغوا کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ لوگ ان کے تعاقب میں گھوڑوں پر آئے تھے۔ گھوڑے انہوں نے دور ہی چھوڑ دیئے تھے۔ اور شاید اس وجہ سے انہیں گھوڑوں کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ ڈھلان پر اترنے لگے۔ وہ دونوں آدمی ان کے دائیں بائیں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ڈھلان میں اترتے ہوئے ثمینہ نے زینب کی طرف دیکھا اور پھر انہوں نے بیک وقت حرکت کی تھی۔ ثمینہ نے بڑی پھرتی سے گھوم کر پستول والے کے ہاتھ پر کک لگائی تھی۔ پستول اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا دور جھاڑیوں میں جا گرا۔

وہ شخص بدحواس ہو گیا۔ ثمینہ کی یہ حرکت اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا ثمینہ نے اچھل کر اس کی پسلیوں پر ایک اور زور دار کک رسید کر دی۔ وہ شخص کراہتا ہوا جھاڑیوں میں گرا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ ثمینہ بھی سنبھل کر اس کے پیچھے لپکی تھی۔

دوسری طرف زینب نے بھی کچھ ایسی ہی کارروائی کی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے گھوم کر رائفل والے کے پہلو میں کک مار دی تھی۔ رائفل والا لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ لیکن رائفل اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی تھی۔ زینب نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کی رائفل پر گرفت جما دی۔

دونوں میں رائفل کے لئے کشمکش ہونے لگی۔ زینب نازک سی لڑکی ہونے کے باوجود بڑی طاقتور ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ رائفل پر جما رکھے تھے اور رائفل چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے حریف کو بھی زیر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس شخص کے دائیں ہاتھ کی انگلی کسی طرح ٹرائیگر پر پہنچ گئی اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ رائفل کی نال اوپر کی طرف تھی۔ گولیاں فضا کو چیرتی ہوئی اوپر نکل گئیں۔

زینب فائرنگ کی آواز سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے حریف کے دائیں بازو پر دانت گاڑ دیئے۔ وہ شخص بلبلا اٹھا۔ رائفل سے اس کا ہاتھ ہٹ گیا۔ زینب نے بھی اپنا سیدھا ہاتھ رائفل سے ہٹا لیا اور اپنی گھیر والی قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک خنجر نکال لیا۔ اس نے خنجر والا ہاتھ بلند کر کے اس شخص کے سینے پر وار کرنا چاہا مگر اس شخص نے بڑی پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا' بڑی عجیب سی صورت حال تھی۔ ان دونوں کا ایک ایک ہاتھ رائفل پر تھا اور دوسرا ہاتھ خنجر پر اب خنجر کے لئے کشمکش ہو رہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی اس شخص نے پوری قوت سے لوٹ لگائی اور زینب کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی درندگی تھی۔ اس نے رائفل چھوڑ دی۔ ایک ہاتھ سے زینب کا کندھا دبائے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر نیچے لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زینب نے ایک ہاتھ سے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے رائفل چھوڑ دی اور دوسرا ہاتھ بھی خنجر والے ہاتھ کی کلائی پر جما دیا۔

زینب پوری قوت سے اپنے حریف کا خنجر والا ہاتھ روکے ہوئے تھی۔ قوت آزمائی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس کے ہاتھوں کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی ہوئی تو خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو جائے گا۔

زینب نے لیٹے لیٹے اپنی ایک ٹانگ سمیٹ لی اور اس شخص کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ٹھوکر لگائی۔ وہ شخص کراہ اٹھا لیکن خنجر پر اس کی گرفت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ زینب نے

گھٹنے سے اسی جگہ ایک اور ضرب لگائی یہ ضرب پہلے سے زیادہ زور دار تھی۔ وہ شخص بلبلا اٹھا۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ زینب نے بڑی پھرتی سے اس شخص کو اپنے اوپر سے پلٹ دیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

تکلیف کے باوجود اس شخص نے ایک بار پھر خنجر سے زینب پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر زینب نے بڑی تیزی سے ایک طرف چلانگ لگا دی اور چند فٹ دور پڑی ہوئی رائفل اٹھا لی۔

اس وقت زینب کے چہرے پر بھی بے پناہ درندگی تھی۔ رائفل اٹھاتے ہی اس نے ایک برسٹ مار دیا۔ فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی اس مرتبہ فائرنگ کی آواز میں اس شخص کی چیخ کی آواز بھی شامل تھی۔ اس شخص کے دائیں گھٹنے پر صرف ایک گولی لگی تھی۔ اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ چیختا ہوا پتھروں پر لوٹ رہا تھا۔ زینب چاہتی تو یہ تھی کہ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دے لیکن اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔

فائرنگ کے ساتھ چیخ کی آواز ثمینہ نے بھی سنی تھی۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک دم رک گئی۔ اس نے اپنے حریف کی طرف دیکھا جو ڈھلان پر لڑھکتا ہوا تقریباً بیس گز دور جا چکا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ زینب رائفل لئے کھڑی نظر آئی لیکن وہ آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ثمینہ دوڑتی ہوئی زینب کے پاس پہنچ گئی۔ وہ شخص اپنی ٹانگ پکڑے تڑپ رہا تھا۔ خون سے اس کے کپڑے اور آس پاس کے پتھر تر ہو رہے تھے۔ زینب نے اس پر رائفل تان رکھی تھی اور چیخ چیخ کر پشتو میں کچھ کہہ رہی تھی۔

"زینب!" ثمینہ نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ "اسے مارنا نہیں۔ زندہ بستی میں لے چلو تا کہ یہ اپنی زبان سے دوسروں کو بتا سکے کہ یہ لوگ کس کے کہنے پر کیا کرنے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسے گھسیٹتی ہوئی بستی تک لے جاؤں گی۔ اور پھر وہاں سب کے سامنے اس کا جسم گولیوں سی چھلنی کر دوں گی۔" زینب نے کہا۔

دفعتاً" گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر وہ دونوں چونک گئیں۔ ثمینہ نے گھوم کر اس طرف دیکھا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار زور دار قہقہہ نکل گیا۔ دوسرا آدمی گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو گیا تھا۔ وہ دونوں سورما انہیں اغوا کرنے آئے تھے مگر انہیں لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ایک اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا اور دوسرا زخمی ہو کر ان کا قیدی بن گیا تھا۔

ثمینہ نے پودوں میں سے خنجر اور پستول بھی تلاش کر لیا اور پھر نشیب میں جا کر اس شخص کا گھوڑا لے آئی۔ ان کے خچر وہاں سے تقریباً دو سو گز دور تھے۔ ثمینہ کا خیال تھا کہ زخمی قیدی کو گھوڑے پر بٹھا دیا جائے اور وہ ان کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے ندی تک آئیں لیکن زینب اس پر

آمادہ نہیں تھی۔ وہ زخمی قیدی کو ٹھوکریں اور رائفل کے بٹ مارتی ہوئی ندی تک لائی تھی۔ گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کی ٹانگ بے جان ہو کر لٹک گئی تھی۔ اور وہ بڑی مشکل سے گھسٹ گھسٹ کر وہاں تک پہنچا تھا۔

زینب تو اسے بستی تک اسی طرح لے جانا چاہتی تھی لیکن ثمینہ نے اس شخص کو سہارا دے کر ایک خچر پر بٹھا دیا اور خود اس کے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ وہ اب تک خچر کی سواری کرتی آئی تھی اور اب گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ زینب دوسرے خچر پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے زخمی کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔

اور اس طرح وہ زخمی قیدی کو لے کر بستی کی طرف روانہ ہو گئیں۔

○

وہ بستی سے تقریباً ایک میل دور تھیں کہ شارق، محراب خان، بازت اور دو آدمی خچروں پر سوار بستی کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ ثمینہ وغیرہ کو دیکھ کر وہ رک گئے۔

"کیا ہوا۔ کچھ دیر پہلے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ کون ہے؟" شارق نے پہلے ثمینہ، زینب اور پھر اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ طور خان کا ساتھی ہے۔" ثمینہ نے بتایا۔ "اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ یہ دونوں طور خان کے کہنے پر ہمیں اسلحے کے زور پر اغوا کرنے آئے تھے۔ ایک بھاگ گیا اور دوسرا تم لوگوں کے سامنے ہے۔"

"طور خان کہاں ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" زینب چیخی۔

"وہ تو صبح ہی سے کہیں گیا ہوا ہے۔ لیکن اب میں صورت حال کو سمجھ رہا ہوں۔" شارق نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ لیکن بہرحال، آج دوپہر کو گل رحمٰن یہاں پہنچنے والا ہے۔ اسے بستی میں لے چلو۔"

"اسے بستی میں لے جانے کی ضرورت نہیں۔" محراب خان نے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل اتارتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی ہماری عورتوں کی طرف بری نظر سے دیکھتا ہے تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔"

"نہیں محراب خان۔" شارق نے اسے روک دیا۔ "بات صرف عورتوں کی نہیں ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ طور خان ہمارے خلاف کوئی اور سازش بھی کر رہا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو اس شخص کی گواہی ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اس لئے اسے گل رحمٰن کے آنے تک زندہ رکھنا

ضروری ہے۔"

بات محراب خان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے رائفل دوبارہ کندھے پر لٹکا لی تاہم وہ غصے سے گالیاں بکتا رہا تھا۔

وہ لوگ بستی میں پہنچ گئے۔ زخمی شخص کا نام باسم گل تھا۔ اسے گھوڑے سے اتار کر کمرے کے فرش پر پھینک دیا گیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا اور وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

ثمینہ نے زینب کے مکان میں آتے ہی کپڑے بدل لئے۔ زینب کی ماں بھی غصے میں تھی اور وہ چیخ چیخ کر طور خان کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد گل رحمٰن بھی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ اسے جب صورت حال کا پتہ چلا تو وہ ایک دم بپھر گیا۔ وہ زخمی باسم گل سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ کوئی سازش نہیں تھی۔ طور خان صرف ان لڑکیوں کو اٹھانا چاہتا تھا۔

"وہ بہت بے چین ہے۔" وہ بتا رہا تھا۔ "اس نے کہا تھا کہ جب سے اس نے ثمینہ کو دیکھا ہے اس کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔ دو دن پہلے وہ ہمارے پاس آیا تھا اور ثمینہ کو اٹھانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ثمینہ اور زینب آج کل خچروں کی سواری کرتے ہوئے بستی سے میلوں دور نکل جاتی ہیں اگر ہم ان دونوں کو اٹھا لائیں تو وہ زینب کو ہمارے حوالے کر دے گا۔ لیکن یہ لڑکیاں ہماری توقع سے زیادہ خطرناک نکلیں۔"

"طور خان کہاں ہے؟" گل رحمٰن نے پوچھا۔

"ہماری بستی میں۔" باسم گل نے جواب دیا۔ "ہم خانہ بدوش ہیں یہاں سے تقریباً پندرہ میل دور اس پہاڑی کے پیچھے ہم نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ طور خان نے کہا تھا کہ یہاں ہمیں کوئی نہیں پہچانتا۔ یوں بھی ایک دو روز بعد ہم ڈیرہ اٹھانے والے تھے۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"طور خان نے تمہیں کوئی اور لالچ بھی دیا ہو گا؟" گل رحمٰن نے پوچھا۔

"اس نے ہمیں دو بوری آٹا لے کر دیا تھا۔" باسم گل نے جواب دیا۔

گل رحمٰن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ باسم گل کو گھسیٹتے ہوئے بستی سے باہر لے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گولیوں کی آواز پہاڑوں میں گونج گئی۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ باسم گل کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اس نے عورتوں کو اغوا کرنے کی کوشش کر کے سنگین جرم کیا تھا اور اسے اس جرم

کی سزا مل گئی تھی۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد پانچ آدمی گھوڑوں پر سوار خانہ بدوشوں کی اس بستی کی طرف جا رہے تھے جہاں باسم گل کے کہنے کے مطابق طور خان چھپا بیٹھا تھا۔ اس پارٹی کی رہنمائی گل رحمٰن کر رہا تھا اور ان پانچ آدمیوں میں زینب کا باپ محراب خان اور شارق بھی شامل تھے۔

خانہ بدوشوں کی اس بستی کا فاصلہ اگرچہ پندرہ میل سے زیادہ نہیں تھا لیکن پہاڑوں میں راستہ بہت دشوار تھا۔ گھوڑوں کی رفتار بہت کم تھی اس طرح وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد بستی کے نواح میں پہنچ سکے تھے۔

گل رحمٰن نے ایک پہاڑی پر گھوڑا روک لیا اور ہاتھ اٹھا کر دوسروں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا۔ شارق، گل رحمٰن کے دائیں طرف تھا۔ وہ نشیب میں واقع خانہ بدوشوں کی بستی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بستی ایک پہاڑی کے دامن میں چشمے کے کنارے آباد تھی۔ پندرہ بیس گھر تھے۔ جن میں دو گھر مٹی اور گارے سے بنے ہوئے تھے اور باقی خیمے تھے۔ خیموں کے نیچے بھی تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی گارے کی دیوار تھی۔ اور اوپر خیموں کے پردے۔

یہ بستی تقریباً پانچ سو فٹ نشیب میں تھی۔ وہ اس نشیب میں اترنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے کہ ایک گھوڑا سوار بستی سے نکلا۔ گھوڑے کا رخ بستی کی مخالف سمت میں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھوڑا سرپٹ دوڑانے لگا۔ گھوڑ سوار نے ایک دو مرتبہ گردن گھما کر پیچھے بھی دیکھا تھا۔

"گل رحمٰن!" محراب خان اس کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔ "طور خان فرار ہو رہا ہے۔ مجھے اجازت دو کہ میں اس کا پیچھا کروں۔"

"نہیں محراب خان۔" گل رحمٰن نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "وہ بزدل اور کمینہ آدمی ہے۔ جلد ہی ہمارے قابو میں آ جائے گا۔ فی الحال اسے جانے دو۔ آؤ ذرا بستی تک چلتے ہیں۔"

وہ ایک تنگ سے راستے پر ہو لئے۔ اس تنگ سے راستے پر تو وہ ایک قطار میں چلتے رہے تھی لیکن کھلی جگہ پر آتے ہی پھیل گئے۔ بستی اب ان سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ ابھی تک انہیں بستی کا ایک بھی فرد نظر نہیں آیا تھا لیکن پھر اچانک ہی بستی کے بچے اور عورتیں خیموں سے نکل کر بستی کے سامنے جمع ہو گئیں۔ گل رحمٰن نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود چند گز آگے بڑھ کر ان عورتوں اور بچوں کے سامنے گھوڑا روک لیا۔

"کیا اس بستی میں کوئی مرد باقی نہیں رہا جو عورتوں اور بچوں کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔" گل رحمٰن نے چیخ کر کہا۔

"گل رحمٰن۔" ایک ادھیڑ عمر عورت نے چیخ کر جواب دیا۔ "ہمارے مردوں نے بہت برا کیا۔ لالچ میں آ کر ان دو آدمیوں نے پورے قبیلے کو دوسروں کی نظروں میں رسوا کر دیا۔ انہیں طور خان نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اگر ہمیں طور خان کی نیت کا پتہ چل جاتا تو ہم ایسا کبھی نہ ہونے دیتے۔ ان دونوں نے ہمارے چہروں پر کالک مل دی ہے۔ معاف کر دو انہیں۔"

"ان میں سے ایک تو معافی کی حد سے بہت آگے جا چکا ہے۔" گل رحمٰن نے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ دوسرے کو بھی ہمارے حوالے کر دو۔"

"دوسرا یہاں آیا تھا لیکن طور خان سے کچھ بات کرنے کے بعد چلا گیا اور اب طور خان بھی تم لوگوں کو دیکھ کر بھاگ گیا ہے۔" اس عورت نے جواب دیا۔

"ایسی صورت میں میرا فیصلہ یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تم لوگ یہاں سے اپنا پڑاؤ اٹھا دو۔ کل شام سے پہلے پہلے تم لوگ اس علاقے سے نکل جاؤ۔ کل شام کو اگر یہ خیمے یہاں نظر آئے تو انہیں آگ لگا دی جائے گی۔ اب جاؤ اور گھروں میں چھپے ہوئے مردوں سے کہو کہ وہ باہر نکلیں اور اپنے ہاتھوں سے خیمے اکھاڑنا شروع کر دیں۔"

گل رحمٰن نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔ شارق وغیرہ نے بھی اپنے گھوڑے موڑ لئے۔

جب وہ اپنی بستی میں داخل ہوئے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ گل رحمٰن اب بھی غصے میں بھنایا ہوا تھا۔ وہ بازت خان پر برس پڑا۔

"تم نے طور خان کو ایسا کرنے سے کیوں نہیں روکا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کی خدمت اور حفاظت ہمارا فرض ہے۔ کیا تم مہمان نوازی کی روایات کو بھول گئے ہو بازت خان۔ تم نے طور خان کو ایسی باتوں سے منع کیوں نہیں کیا جس سے ہماری عزت پر حرف آتا ہو۔"

"خان گل رحمٰن۔" بازت خان نے مدہم اور پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میں اس سفر میں طور خان کے ساتھ ضرور تھا۔ لیکن اس نے میرے سامنے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے اس پر کسی قسم کا شبہ ہوتا۔ اور خان..... کسی کے دل کی بات میں کیسے جان سکتا ہوں۔ اگر مجھے اس پر معمولی سا بھی شبہ ہوتا تو میں اسے صرف روکتا نہیں سرزنش بھی کرتا۔"

"ہاں..... یہ تم ٹھیک کہتے ہو کہ کوئی کسی کے دل کی بات نہیں جان سکتا۔ لیکن میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہو گی۔ جب تک میں طور خان کو اپنے ہاتھوں

سے سزا نہیں دے لوں گا۔ میری نظریں مہمانوں کے سامنے جھکی رہیں گی۔" گل رحمٰن نے کہا۔

"گل رحمٰن" شارق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بدہم لہجے میں کہا۔ "تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان بدمعاشوں نے دو لڑکیوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں ان لڑکیوں ہی کے ہاتھوں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور جہاں تک طور خان کا سوال ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی اس سے سامنا ہو گا میری ساتھی اس سے اپنی توہین کا بدلہ لے لے گی۔"

"یہ ہماری روایات کے خلاف ہے شارق بھائی۔" گل رحمٰن نے کہا۔ "توہین ہماری ہوئی ہے۔ ہماری مہمان نوازی کی روایات کو پامال کیا گیا ہے۔ اس بدمعاش نے ہماری پیشانی پر دھبہ لگایا دیا ہے اور یہ دھبہ اس کے خون سے ہی صاف ہو گا۔"

شارق خاموش رہا۔ وہ مزید کچھ کہہ کر گل رحمٰن کے غصے کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح بات مزید بگڑ سکتی تھی۔ وہ ان قبائلیوں کی فطرت کو سمجھ چکا تھا۔ یہ جب تک اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔ اور مہمانوں کی عزت اور جان و مال بچانے کے لئے تو یہ لوگ اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد گل رحمٰن پرسکون ہو سکا تھا۔ موقع مناسب سمجھتے ہوئے شارق نے دوسری بات شروع کر دی۔

"سرحد کے اس پار سے کوئی اطلاع ملی یا نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"سرحد کے اس پار حالات کچھ بہتر ہو گئے ہیں۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "ملک فرید خان کی طرف سے کل کسی بھی وقت سگنل مل سکتا ہے۔ ہمیں بہرحال تیار رہنا ہے۔ سگنل ملتے ہی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ آج کل سرحد پر بھی کچھ نگرانی سخت کر دی گئی ہے۔ مہاجرین کو اس سرحد پر آنے سے روکنا اگرچہ بہت مشکل ہے۔ لیکن ملیشیا کی پارٹیاں گشت کرتی رہتی ہیں۔ اس لئے ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہو گی۔ سرحد کی نگرانی بھی دراصل ہم جیسے لوگوں کے لئے کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں جس طرح اسلحہ اور ہیروئن کی ریل پیل ہو گئی ہے اس سے حکومت پاکستان بھی پریشان ہو رہی ہے۔ پاکستانی حکومت پر عالمی دباؤ بڑھ رہا ہے کہ اسلحہ اور خاص طور پر ہیروئن کی اسمگلنگ کو روکا جائے۔ تم جانتے ہو کہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی پوست کاشت ہوتا ہے جس سے افیون، چرس، مارفین اور ہیروئن تیار ہوتی ہے۔ حکومت پاکستان نہ صرف پوست کی فصلیں تباہ کر رہی ہے بلکہ ہیروئن تیار کرنے والی فیکٹریوں کو بھی تباہ کیا جا رہا ہے۔ ہیروئن کی ایک بڑی مقدار افغانستان ہی سے اسمگل ہو کر آتی ہے اس لئے مشکلات ہونے کے

باوجود سرحد کی نگرانی بھی سخت کر دی گئی ہے۔ اس لئے سرحد پار کرتے ہوئے ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہو گی۔

"ابھی ابھی میرے دل میں ایک اور خیال آیا ہے۔" شارق نے کہا۔ "طور خان ہم سے باغی ہو گیا ہے۔ وہ کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا سکتا ہے۔ وہ ہمارے پروگرام سے واقف ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ سرحد پر ملیشیا کی گشتی پارٹیوں کو ہمارے بارے میں آگاہ کر دے؟"

"اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "لیکن ہم بھی تو کچی گولیاں نہیں کھیلتے نا۔ وہ ہمارے سرحد پار کرنے والے معمول کے دو تین راستوں سے واقف ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایسے راستے بھی ہیں جن کے بارے میں اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے۔ ہمارے پروگرام سے واقف ہونے کے باوجود وہ بدبخت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"مجھے یہی اندیشہ تھا۔ اس کی وضاحت ہو گئی۔ اب مجھے کوئی پریشانی نہیں رہی۔" شارق نے جواب دیا۔

وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ محراب خان کا بیٹا پلاسٹک کا ایک تسلہ اور پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے کر آ گیا۔ اس نے پہلے سب کے ہاتھ دھلائے پھر کمرے میں دری پر دسترخوان بچھا دیا۔ اس دوران محراب خان اپنے مکان میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کھانا لے آیا اور کھانا دسترخوان پر چن دیا گیا۔

کھانے کے دوران گل رحمٰن اور دیگر لوگ پشتو میں باتیں کرتے رہے۔ شارق اور نولکھا خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ ان کی باتوں کا ایک لفظ بھی ان کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ شارق نے نولکھا کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات بھی صاف طور پر محسوس کر لئے تھے۔

کھانے کے بعد شارق اور نولکھا اٹھ کر مکان سے باہر آ گئے۔ وہ ٹہلنے کے لئے جانا چاہتے تھے لیکن کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر واپس آ گئے اور مکان کے اس کمرے میں گھس گئے جو اب ان دونوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

ایک پتھر پر مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ دھواں کمرے کی فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ اس دھویں کی وجہ سے ان کے حلق تک سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ تھوکتے بھی تو ان کے حلق سے کالک ہی نکلتی۔

"شارق باؤ۔" نولکھا اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ ہم لوگ کہاں آ کر پھنس گئے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں یہ..... یہاں سے تو واپسی کا راستہ بھی نہیں ہے۔"

"واپسی کا راستہ تو واقعی نہیں ہے۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کل رات تک ملک فرید خان کی طرف سے آگے بڑھنے کا سگنل نہ ملا تو میں گل

رحمٰن سے بات کروں گا کہ ہماری واپسی کا بندوبست کر دیا جائے۔"

"بات کرنی ہی پڑے گی۔" نولکھا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہاں پڑے پڑے تو ہمیں زنگ لگ جائے گا۔ مجھے تو لاہور بڑا یاد آ رہا ہے شارق باؤ..... لکشمی چوک اور بھاٹی گیٹ کی رونق میری نظروں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ اس وقت تو وہاں شام جوان ہو گی اور ہم یہاں بیٹھے مٹی کے تیل کی کالک سے اپنی آنتیں بھی کالی کر رہے ہیں۔"

"یہ تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔" شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے کیا تمہارا نظریہ بدل گیا ہے!"

"کیسا نظریہ؟" نولکھا نے اسے گھورا۔

"دو تین دن پہلے تم ثمینہ سے کہہ رہے تھی کہ یہاں ہر طرف قدرت کا حسن بکھرا ہوا ہے اور دل چاہتا ہے کہ ساری زندگی یہیں رہ کر گزار دی جائے۔" شارق نے کہا۔

"وہ نظریہ تو اپنی جگہ پر ہے شارق باؤ! مگر یہاں کچھ کرنے کو تو ہو۔" نولکھا نے کہا۔ "دن کے وقت تو سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے لیکن شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ اب دیکھو نا یہ کالا دھواں....." وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا تھا۔ اس کالے دھویں کی وجہ سے اس کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"یہ باری کھول دے یار شارق باؤ!" اس نے کھانستے ہوئے بمشکل کہا۔ "کمرے میں تازہ ہوا آئے اور یہ دھواں باہر نکلے۔"

شارق نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ تازہ ہوا کا جھونکا اندر آیا اور کچھ دیر بعد کمرے کی فضا کسی حد تک صاف ہو گئی مگر نولکھا وقفے وقفے سے کھانستا رہا۔

○

صبح ناشتے کے بعد شارق اور نولکھا ٹہلتے ہوئے بستی سے کچھ دور آ کر شہتوت کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ثمینہ بھی پہنچ گئی۔ اس وقت اس نے قبائلی لباس پہن رکھا تھا اور یہ لباس اسے زینب نے دیا تھا۔

"کیا پروگرام ہے بھئی۔ زندگی بھر یہیں پڑے رہنا ہے کیا؟" ثمینہ نے ان کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج شام کو میں گل رحمٰن سے بات کروں گا کہ اگر حالات موافق نہیں ہیں تو یہ مشن ملتوی کر دیا جائے اور ہماری واپسی کا بندوبست کر دیا جائے۔ کچھ عرصے بعد جب حالات موافق ہوں تو اس مشن پر عمل کیا جائے۔" شارق نے جواب دیا۔

"ہاں۔ یہ بات کرنی ہی پڑے گی۔" ثمینہ بولی۔ "یہاں بیکار بیٹھے بیٹھے تو اب اکتاہٹ سی ہونے لگی ہے۔"

"میں تو زندگی ہی سے بیزار ہو گیا ہوں ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے کہا۔

"اور اس بستی کے بارے میں جانتے ہو یہ کیا ہے؟" ثمینہ بولی۔

"ایک چھوٹی سی بستی ہے اور یہاں کیا ہو سکتا ہے۔" شارق نے کہا۔

"یہ چھوٹی سی بستی دراصل دونوں ملکوں کی سرحد پر ملک فرید کی غیر قانونی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔" ثمینہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "اس بستی کے کچے مکانوں کے نیچے بہت وسیع و عریض تہہ خانے ہیں جہاں افغانستان سے آنے والا مال' ہیروئن اور اسلحہ ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ مال تھوڑا تھوڑا کر کے آگے پہنچا دیا جاتا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" شارق نے اسے گھورا۔

"محراب خان کی بیٹی زینب نے بتایا تھا۔" ثمینہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "ملک فرید خان سرحد کے دونوں طرف آباد قبائل کا سردار ہے۔ وہ ان علاقوں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ روسیوں کے خلاف جنگ میں اس نے افغان مجاہدین کی مدد کی تھی اب اس کا معاوضہ وصول کر رہا ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی اور چند لمحوں بعد اسے فرید خان کے بارے میں بتانے لگی۔

"ثمینہ بی بی! بات یہ ہے کہ جب تک آدمی کے اوپر تک تعلقات نہ ہوں اس قسم کے غیر قانونی کاموں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہاں ملک فرید ہے تو لاہور میں حاجی عبداللہ ہے۔ حاجی عبداللہ کو تو تم نے دیکھ لیا ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے تعلقات ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بہت بڑے فنکار سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم تو چھوٹی مچھلیاں ہیں۔ بہت چھوٹی۔ ہم تو شطرنج کے مہرے ہیں۔ جو دوسروں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اگر ہم پولیس کے معمولی سے انسپکٹر کو رشوت دے کر اپنے قابو میں کر لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت تیر مارا ہے۔ لیکن پھر بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ پولیس انسپکٹر ہمارے قابو میں ہے۔ اوپر سے کہنے پر وہی پولیس انسپکٹر ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال سکتا ہے۔ حاجی عبداللہ کو دیکھ لو..... یہ ملک فرید خان ہے جس کے بارے میں نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ بظاہر منشیات اسمگلر ہیں لیکن اپنے اندر حکومت کا تختہ الٹ دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس دولت ہے کہ اپنی حکومت کا دس سال تک کا بجٹ چلا سکتے ہیں۔ کولمبیا والوں کی بات تو تم اخباروں میں پڑھی ہو گی۔ وہاں کے منشیات کے اسمگلر تو اپنے خلاف فیصلہ دینے والے ججوں

کو بھی عدالتوں میں گولی سے اڑا دیتے ہیں۔ کولمبیا کی حکومت مقروض ہے۔ اس کا کاروبار بھی قرضوں پر چل رہا ہے۔ اور ایک تجزیہ یہ ہے کہ وہ آئندہ پچاس برس تک بھی قرضے نہیں اتار سکتے بلکہ ان قرضوں میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اس ملک کے منشیات کے اسمگلروں کے پاس بڑی دولت ہے۔ انہوں نے تو اپنی حکومت کو یہ پیشکش بھی کی ہے کہ اگر وہ انہیں منشیات کا آزادانہ کاروبار کرنے کی اجازت دے دے تو وہ نہ صرف چند روز میں حکومت کے تمام قرضے چکا دیں گے بلکہ حکومت کو آئندہ دس سال کے بجٹ کی پریشانیوں سے بھی نجات دلا دیں گے۔"

"نولکھا بھائی۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔ "میرا خیال ہے کہ کھلی فضا اور تازہ ہوا تمہارے لئے مفید ثابت ہو رہی ہے۔ تمہارا دماغ روشن ہو رہا ہے اور تم ایسی باتیں کرنے لگے ہو جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔"

"یہ باتیں عام آدمیوں کے کرنے کی بھی نہیں ہیں ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے کہا۔

نولکھا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس کی نظریں اس پہاڑی راستے پر مرکوز تھیں جو خانہ بدوشوں کی بستی کی طرف سے آتا تھا۔ ثمینہ اور شارق بھی اس طرف دیکھنے لگے۔

وہ تین عورتیں تھیں جو ایک گھوڑے کے ساتھ ساتھ پیدل آ رہی تھیں۔ گھوڑے پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ایک عورت نے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی اور دو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

شارق وغیرہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب وہ قدرے قریب پہنچے تو شارق نے اس عورت کو پہچان لیا جس نے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔ یہ خانہ بدوش قبیلے کی وہی عورت تھی جس نے کل قبیلے کی بستی کے سامنے گل رحمٰن سے بات کی تھی۔

گھوڑے پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ لیکن جب وہ مزید قریب پہنچے تو ثمینہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ..... یہ تو وہی ہے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"وہی کون؟" شارق بولا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"باسم گل کا ساتھی۔ جس نے کل مجھے اور زینب کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔" ثمینہ نے بتایا۔

اس دوران بستی والوں کو بھی پتہ چل گیا تھا۔ محراب خان اور دوسرے لوگ گھروں سے نکل

آئے۔ ان کے پیچھے گل رحمٰن بھی تھا۔ وہ خانہ بدوش عورتیں ان کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ شارق وغیرہ بھی وہاں آ گئے تھے۔ گل رحمٰن دوسرے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے آ گیا۔ خانہ بدوش عورت نے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے شخص کو کھینچ کر گھوڑے سے گرا دیا۔ اس شخص کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ نیچے گرتے ہوئے اپنا بچاؤ نہیں کر سکا تھا۔ اسے گرنے سے اچھی خاصی چوٹ لگی تھی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

"خان گل رحمٰن۔" وہی خانہ بدوش عورت گل رحمٰن کے سامنے آتے ہوئے بولی۔ "ہم تمہارے مجرم کو لے آئے ہیں۔ اسے ہم نے قبیلے سے خارج کر دیا ہے۔ اب اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس نے جو حرکت کی تھی اس سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس سے تم جو بھی سلوک کرو گے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن خدارا.... ہمیں اس علاقے سے بے دخل مت کرو۔ ہم ملک فرید خان کے وفادار ہیں اور تم جانتے ہو کہ ہم نے ہمیشہ اس کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے۔"

"تم نے میری زبان بند کر دی ہے زرمینہ بی بی۔" گل رحمٰن نے اس عورت کے خاموش ہونے پر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم لوگ ملک فرید خان کے وفادار ہو اور کبھی اس کے مفاد کے خلاف کام نہیں کیا۔ اس نے ایک بہت بڑا جرم کیا تھا اور اس جرم کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ تم لوگ چونکہ بے قصور ہو اور اسے میرے سامنے پیش کر کے تم لوگوں نے بڑے خان سے اپنی وفاداری کا ثبوت دے دیا ہے۔ اس لئے میں اپنا کل والا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔" اس نے خاموش ہو کر دو آدمیوں کو اشارہ کیا کہ قیدی کو وہاں سے لے جائیں۔ پھر محراب خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "محراب خان! مہمانوں کو گھر میں لے جاؤ اور ان کی خاطر تواضع کا بندوبست کرو۔"

محراب خان ان تینوں خانہ بدوش عورتوں کو اپنے گھر لے گیا۔ ثمینہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ چونکہ قبائلی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس لئے زرمینہ وغیرہ اسے بھی قبائلی ہی سمجھ رہی تھیں۔

"وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔" زرمینہ نے زینب کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

زینب کی ماں نے ثمینہ اور زینب کی طرف اشارہ کر دیا۔ زرمینہ نے باری باری ان دونوں کو گلے لگا کر پیار کیا۔ پھر اپنی ایک ساتھی سے ایک پوٹلی لے کر کھولی۔ اس میں دو خوبصورت کڑھائی والی شالیں تھیں۔ ایک شال اس نے ثمینہ کی سر پر ڈال دی اور دوسری زینب کے سر پر اور ان دونوں کو ایک بار پھر گلے سے لگا کر پیار کیا۔ دوسری دونوں عورتوں نے بھی ثمینہ اور زینب کو گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

وہ خانہ بدوش عورتیں تقریباً دو گھنٹے وہیں رہیں۔ اور جب وہ واپس جانے لگیں تو گل رحمٰن نے ان کے گھوڑے پر آٹے کی تین بوریاں لدوا دی تھیں۔ آٹے کے علاوہ انہیں اور بھی کچھ چیزیں دی گئی تھیں۔ خانہ بدوشوں کے لئے آٹا ہی سب سے بڑی نعمت تھی۔

اور پھر اس رات کھانے کی تھوڑی دیر بعد شارق اور نولکھا' گل رحمٰن کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ملک فرید خان کی طرف سے ابھی تک کوئی پیغام نہیں ملا تھا اس لئے شارق نے گل رحمٰن سے واپسی کے لئے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گل رحمٰن نے بڑے سکون سے ان کی بات سنی پھر بولا۔

"میں تمہاری تمام باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن سرحد پار کی صورت حال ہماری نظروں میں نہیں ہے۔ ہمیں کم از کم آج رات انتظار کر لینا چاہئے۔ اگر ملک فرید خان کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملا تو کل صبح میں خود ٹرانسمیٹر پر اس سے بات کروں گا۔ اور مشن کو ملتوی کر دینے والی تمہاری تجویز اس کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

"اگر صورت حال موافق نہ ہو تو کوئی بڑا خطرہ مول لینے کے بجائے مشن ملتوی کر دینا ہی مناسب ہو گا۔" شارق نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"سرحد پار کی سیاسی صورت حال خاصی دگرگوں ہے۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "اور تم نہیں جانتے ہمارا یہ کاروبار وہاں کی سیاسی صورت حال سے مشروط ہے۔ وہاں کئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو برسر اقتدار آنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ بہرحال' ہمیں آج کی رات انتظار کر لینا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آج کی رات انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی بات بنتی ہوئی نظر نہ آئے تو ہماری واپسی کا بندوبست کر دینا۔" شارق نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ان کی یہ محفل برخاست ہو گئی۔

اس وقت رات کے تقریباً دس بجے تھے۔ نولکھا کمرے میں اپنے بستر پر بیٹھا کھانس رہا تھا کہ آنگن میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے دو سیکنڈ بعد ہی محراب خان اندر داخل ہوا۔

"تم کو خان بلاتا ہے۔" اس نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شارق کمرے سے نکل کر محراب خان کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا جہاں گل رحمٰن بیٹھا ہوا تھا۔ دو آدمی اور بھی تھے۔ گل رحمٰن کے سامنے ٹرانسمیٹر رکھا ہوا تھا۔ شارق جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا گل رحمٰن اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

"بیکاری ختم ہو گئی۔ اب ایکشن کا وقت آ گیا ہے شارق بھائی!" گل رحمٰن بولا۔

"گڈ۔" شارق بھی مسکرا دیا۔ "ہمیں کس وقت روانہ ہونا ہے؟"

"ایک گھنٹے بعد۔" گل رحمٰن نے جواب دیا۔ "ٹھیک گیارہ بجے ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ تم لوگ اپنی تیاری کر لو۔"

"ہم تو تیار ہی بیٹھے ہیں۔ کپڑے جو بکھرے ہوئے ہیں انہیں بیگز میں سمیٹنا ہے اور چل پڑنا ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" تم لوگ تیاری کرو۔ اس دوران میرے آدمی بھی تیار ہو جائیں گے۔" گل رحمٰن نے کہا۔

شارق اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے نولکھا کو بتایا تو وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ثمینہ کو بھی اطلاع بھجوا دی گئی۔

اور پھر ٹھیک گیارہ بجے وہ لوگ بستی سے رخصت ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ تین تو شارق وغیرہ تھے۔ اور گل رحمٰن کے ساتھ دو آدمی تھے۔ بازت خان اور نجیب اللہ۔

شارق' ثمینہ اور نولکھا خچروں پر سوار تھے جبکہ گل رحمٰن اور اس کے ساتھیوں کے پاس گھوڑے تھے۔ گل رحمٰن نے شارق کو بتایا تھا کہ سرحد پار کرنے سے پہلے انہیں بھی گھوڑے مل جائیں گے۔

یہ قافلہ بستی سے نکل کر بلند پہاڑوں کی طرف چلتا رہا۔ ان کے بائیں طرف تقریباً چھ میل کے فاصلے پر علی مینگل قصبہ تھا اور سرحد وہاں سے چند میل آگے تھی۔

چھ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب رک گئے درختوں کے اس جھنڈ کے دوسری طرف شاید کوئی مکان تھا جہاں سے مدہم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ گل رحمٰن نے پشتو زبان میں بازت خان سے کچھ کہا اور بازت خان گھوڑے سے اتر کر پیدل ہی درختوں کے جھنڈ میں سے ہوتا ہوا مکان کی طرف چلنے لگا۔

بازت خان کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جنہوں نے تین گھوڑوں کی لگامیں تھام رکھی تھیں۔ انہوں نے قریب پہنچ کر گل رحمٰن کو سلام کیا۔

"اب تک کی کیا رپورٹ ہے ضیغم۔" گل رحمٰن نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے خان۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "سمندر خان پوائنٹ پر موجود ہے۔ تازہ ترین صورت حال وہی بتا سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ لوگ زیادہ دیر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم لوگ روانہ ہو رہے ہیں۔" گل رحمٰن نے کہا۔

وہ تینوں گھوڑے شارق' ثمینہ اور نولکھا کو دے دیئے گئے۔ اور اس کے تقریباً دس منٹ بعد

وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک تنگ سی دراڑ میں داخل ہو گئے۔ یہ دراڑ آگے جا کر ایک سرنگ میں بدل گئی تھی۔ گل رحمٰن سب سے آگے تھا اور اس کے پیچھے شارق۔ گل رحمٰن نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ ٹارچیں حالانکہ دوسروں کے پاس بھی تھیں مگر کسی اور نے ٹارچ نہیں جلائی تھی۔ سرنگ میں ایک ٹارچ کی روشنی ان سب کو راستہ دکھانے کے لئے کافی تھی۔ اور یوں بھی شاید گھوڑے اس راستے سے اچھی طرح واقف تھے۔

"طور خان کے بارے میں مجھے بھی شبہ تھا کہ وہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے گا۔" گل رحمٰن نے پیچھے گردن گھما کر شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ اس راستے کے بارے میں طور خان کے فرشتوں کو بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔"

شارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے تاریک سرنگ میں چلتے رہے۔ اس سرنگ میں دو تین موڑ آئے تھے۔ اور بالآخر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ سرنگ سے نکل کر کھلی فضا میں آ گئے۔

سرنگ سے باہر آتے ہی ثمینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی سانس رک جائے گی۔ سرنگ کا دہانہ تقریباً دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس کے سامنے تقریباً پندرہ فٹ چوڑی پٹی تھی جو چٹان کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ آگے گہرا کھڈ تھا۔ اگر گھوڑا بدک کر اس کھڈ میں جا گرے تو گھوڑے اور اس کے اتنے ٹکڑے ہو جائیں گے کہ انہیں سمیٹنا بھی ممکن نہیں ہو گا۔

ثمینہ نے اپنا گھوڑا چٹان کی طرف کر لیا۔ اس مرتبہ بازت کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ کچھ دور تک، تو راستہ چٹان کے گرد گھومتا رہا پھر وہ ایک کشادہ جگہ پر پہنچ کر رک گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی کسی چٹان کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ سمندر خان تھا۔

"سمندر خان! کیا صورت حال ہے؟" گل رحمٰن نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے خان! تم لوگ نکل جاؤ۔" سمندر خان نے جواب دیا۔

اسی وقت چاند نکل آیا اور فضا میں پھیکی سی چاندنی پھیل گئی۔ سمندر خان واپس چلا گیا تھا۔ گل رحمٰن کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر اس نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ وہ مسلسل ڈھلان سے اتر رہے تھے اور بالآخر ایک جگہ رک گئے۔ وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ ان کے سامنے وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی۔ تقریباً سو گز آگے وہ چھوٹی سی چٹان دیکھ رہے ہو؟ گل رحمٰن نے شارق کو مخاطب کرتے ہوئے سامنے اشارہ کیا۔ "وہ سرحد ہے۔ اس چٹان کے دوسری طرف افغان علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس چٹان سے دوسری طرف ہمیں بڑی تیز رفتاری سے

گھوڑے دوڑانے ہوں گے تاکہ ہم کم سے کم وقت میں سرحد سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جائیں۔"

وہ لوگ چند منٹ وہاں کھڑے رہے پھر گل رحمٰن نے اشارہ کیا اور ان سب لوگوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔

گھوڑے تیزی سے دوڑتے ہوئے سرحدی چٹان سے آگے نکل گئے۔ ٹاپوں کی آواز سے فضا گونجنے لگی تھی۔ ثمینہ کا گھوڑا بازت خان کے گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اب تک اس گھوڑے پر سواری کرتے ہوئے اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن پھر اچانک ہی گھوڑا بدک گیا۔ گھوڑے کے بدکنے کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

بھیڑیوں کے ایک غول نے اچانک ہی ان پر حملہ کر دیا تھا۔ گل رحمٰن نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس علاقے میں خونخوار بھیڑیوں کے غول پھرتے رہتے ہیں جو اگر تعاقب میں لگ جائیں تو دور تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔

بھیڑیوں کے اس اچانک حملے سے سب ہی گھوڑے بدک گئے تھے۔ ثمینہ کا گھوڑا تو بدک کر راستے سے بھی ہٹ گیا تھا۔ پانچ چھ بھیڑیئے غراتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ثمینہ بری طرح بدحواس ہو گئی تھی۔ وہ گھوڑے پر تقریباً لیٹ گئی تھی۔ خوفزدہ گھوڑا طوفانی رفتار سے دوڑ رہا تھا اور ثمینہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ گر گئی تو گھوڑے کے پیروں تلے کچلی جائے گی۔ اور اگر کچلی جانے سے بچ گئی تو خونخوار بھیڑیئے اس کا تیا پانچا کر ڈالیں گے۔

بھیڑیوں کی غراہٹ اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ گردن گھما کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بھیڑیا بہت قریب تھا اور وہ بار بار گھوڑے کی ٹانگ پر دانت گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ثمینہ بار بار اپنے پیر گھوڑے کے پیٹ پر مارنے لگی۔ گھوڑا خود بھی خوفزدہ تھا۔ اسے اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ وہ جان توڑ کر دوڑ رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد بھیڑیوں نے پیچھا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کئی منٹ تک ثمینہ گھوڑے کو دوڑاتی رہی اور بالآخر اس نے گھوڑا روک لیا اور سیدھی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے چاروں طرف سناٹا اور ویرانہ تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر کس طرف اور کتنی دور نکل آئی تھی۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اس ویرانے میں خونخوار بھیڑیئے دوبارہ بھی اس پر حملہ کر سکتے تھے۔

اس نے گھوڑے کا رخ دائیں طرف کر دیا۔ اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ نولکھا کی تو بہت بری حالت

تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اس وقت کو گالیاں بک رہا تھا جب اس نے اس مشن پر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ پہاڑی سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔ گل رحمٰن ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور پھر ایک طرف رخ کر کے کسی کا نام لے کر پکارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دو گھوڑ سوار ایک چٹان کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ان دونوں کے چہرے پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔

"خوش آمدید گل رحمٰن۔" ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔ "تم سب لوگ ہمارے پیچھے آ جاؤ۔"

وہ پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ ان پہاڑوں میں انہیں ایک مختصر چوڑائی والا دریا بھی پار کرنا پڑا تھا۔ دریا کے دوسری طرف ایک چٹان پر قلعہ نما مکان بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف درخت تھے۔

اس وقت دن کا بہت ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ وہ لوگ اس قلعہ نما مکان میں داخل ہو گئے۔ لیکن وہ ابھی گھوڑوں پر سوار ہی تھی کہ ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اسے دیکھ کر سب ہی چونک گئے۔

وہ طور خان تھا۔

گل رحمٰن کا ہاتھ اپنی رائفل پر پہنچ گیا۔ لیکن اس نے رائفل ابھی کندھے سے بھی نہیں اتاری تھی کہ طور خان کی آواز سنائی دی۔

"خان گل رحمٰن! رائفل کندھے سے اتارنے سے پہلے اپنے چاروں طرف دیکھ لو۔"

گل رحمٰن نے تو شاید بعد میں دیکھا ہو گا لیکن ثمینہ کی گردن فوراً ہی گھوم گئی تھی' اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ان کے چاروں طرف دس بارہ آدمی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ وہ لوگ چوہے دان میں پھنس گئے تھے اور چاروں طرف سے رائفلوں کی زد میں تھے۔

○

ثمینہ کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اسے اپنی گردن پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ صبح صادق کا وقت تھا۔ موسم میں اگرچہ خنکی تھی لیکن ثمینہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یکایک کسی سرد خانے میں آن کھڑی ہوئی ہو۔ یخ بستگی کی لہریں اس کی ہڈیوں کے گودے تک میں اترتی جا رہی تھیں۔ اس نے گردن گھما کر شارق اور پھر نولکھا کی طرف دیکھا' نولکھا کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ لڑائی بھڑائی کا آدمی تھا لیکن یہاں کی صورتحال مختلف تھی۔ وہ چاروں طرف سے رائفلوں کی زد میں تھے۔ اور ان میں سے کسی کی معمولی سی حرکت اس کا جسم چھلنی کر سکتی تھی۔ ثمینہ نے ایک بار پھر گل رحمان کی طرف دیکھا' اس کا ہاتھ ابھی تک رائفل پر تھا لیکن چہرے پر شدید الجھن کے تاثرات تھے۔

"گل رحمان!" طور خان کی آواز خاموش فضا میں گونجتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ "رائفل پھینک دو اور اپنے ساتھیوں سے بھی کہو کہ اپنی اپنی رائفلیں نیچے پھینک دیں۔ اگر کسی نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

گل رحمان نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا' وہ طور خان سے اچھی طرح واقف تھا' اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اس کے ایک اشارے پر چاروں طرف سے رائفلوں کے دہانے کھل سکتے تھے۔ گل رحمان کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے رائفل کندھے سے اتار کر نیچے پھینک دی اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

"سب لوگ رائفلیں پھینک دیں۔"

نجیب اللہ اور بازت خان کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ شاید اس طرح آسانی سے ہتھیار نہیں پھینکنا چاہتے تھے لیکن انہیں گل رحمان کے حکم کی تعمیل تو کرنی ہی پڑی تھی۔ ان دونوں نے اپنی رائفلیں نیچے پھینک دیں۔ شارق وغیرہ نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔

"تم لوگ گھوڑوں سے اتر کر دس قدم دور گھاس پر کھڑے ہو جاؤ اور یہ خیال رہے کہ تم میں ہر ایک کے درمیان دو فٹ سے زیادہ فاصلہ نہ ہو۔" طور خان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

وہ سب لوگ گھوڑوں سے اتر کر دس قدم دور گھاس پر کھڑے ہو گئے۔ اس میں شبہ نہیں

کہ اس صورت حال نے سب ہی کو پریشان کر دیا تھا لیکن ثمینہ کی کیفیت سب سے مختلف تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ جب وہ لوگ پارا چنار میں تھے تو اسی وقت طور خان نے اس کے کمرے میں تاک جھانک شروع کی تھی۔ اس کی نیت میں شروع ہی سے فتور تھا۔ وہ اس وقت بھی موقع کی تلاش میں تھا لیکن اسے ثمینہ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں ملا تھا اور پھر علی مینگل کے قریب سرحدی گاؤں میں محراب خان کی بیٹی اور اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ان دونوں کی ہمت اور دلیری کے باعث طور خان اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اور گل رحمٰن کی سزا کے خوف سے گاؤں سے بھاگ گیا تھا۔

گل رحمان کو یہ اندازہ تو تھا کہ طور خان خاموش نہیں بیٹھے گا لیکن اسے شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلد سامنے آ جائے گا۔ اس نئی صورت حال نے ثمینہ کو بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اور اب طور خان انتقام لینے کے لئے نہ صرف اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنائے گا بلکہ دوسرے طریقوں سے بھی اذیت پہنچانے کی کوشش کرے گا اور اس کے ساتھی شاید اس کی کوئی مدد نہ کر سکیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ طور خان اور اس کے آدمی رائفلیں سنبھالے اپنی اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے ان سب کو رائفلوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ طور خان آگے بڑھ آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ گل رحمان سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

"گل رحمان!" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم پرانے دوست ہیں اور دوست رہنا چاہتے ہیں' سارا جھگڑا اس لڑکی کا ہے۔ یہ مجھے پسند آ گئی تھی۔ میں نے اسے حاصل کرنا چاہا تو تم میرے خلاف ہو گئے۔ اب یہ لڑکی میرے قبضے میں آ گئی ہے۔ اس وقت تم میرے راستے کی رکاوٹ تو نہیں بن سکو گے لیکن میری خواہش ہے کہ تم سے میری دوستی برقرار رہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ان کی حمایت کرنے کی بجائے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ یہ لوگ اجنبی ہیں۔ واپس چلے جائیں گے۔ ہم ان کی وجہ سے آپس میں دشمنی کیوں پیدا کریں۔"

"تم شاید بھول گئے ہو کہ ہم پٹھان ہیں اور پٹھانوں کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔" گل رحمان نے جواب دیا۔ "مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہم مہمان کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن شاید تمہاری غیرت مر چکی ہے۔ تمہارا ایمان ختم ہو چکا ہے۔ اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو اس مہمان لڑکی کی طرف بری نگاہ سے نہ دیکھتے۔ میری ایک بات یاد

رکھو طور خان!" گل رحمان ایک لمحہ کو خاموش ہوا اور پھر خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایک بات یاد رکھو طور خان! یہ لڑکی ہماری مہمان ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ تم ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی اس تک پہنچ سکو گے۔"

"میں جانتا ہوں تم بہت بہادر ہو گل رحمان۔" طور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت تم بے بس ہو چکے ہو۔ میرے آدمی تمہارا لحاظ بالکل نہیں کریں گے۔ بہادری دکھانے کی کوشش کرو گے تو مفت میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ البتہ میں تمہیں ایک پیشکش کر رہا ہوں۔ میں تمہیں دوپہر بارہ بجے تک کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم میرے حق میں فیصلہ کر لو تو ہماری دوستی برقرار رہے گی اور میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت تک اس ظالم کی بچی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"میں فیصلہ کر چکا ہوں۔" گل رحمان نے جواب دیا۔ "تم اس مہمان لڑکی سے معافی مانگ لو تو میں اب بھی تمہیں اپنا دوست سمجھوں گا بصورت دیگر....."

"میں تمہیں دوپہر بارہ بجے تک کی مہلت دے چکا ہوں۔" طور خان نے اس کی بات کاٹ دی اور اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان لوگوں کو عزت کے ساتھ ایک کمرے میں بند کر دو۔"

طور خان کے آدمی رائفلیں تانے ہوئے آگے بڑھے اور گل رحمان اور شارق وغیرہ کو دھکیلتے ہوئے مکان کی طرف لے جانے لگے۔ ثمینہ نے ان کے ساتھ جانا چاہا تو طور خان نے رائفل آگے کر کے اس کا راستہ روک لیا۔

"تم نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم ان کے ساتھ نہیں' الگ کمرے میں رہو گی۔"

ثمینہ جزبز سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ مگر طور خان کے آدمی انہیں دھکیلتے ہوئے آگے لے جا چکے تھے۔

ثمینہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ طور خان نے اگرچہ گل رحمان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوپہر بارہ بجے تک ثمینہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن اس شخص کی زبان پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ انتہائی نچلے درجے کا اور گھٹیا انسان ثابت ہوا تھا۔

ثمینہ اپنی جگہ پر کھڑی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ قلعہ نما یہ مکان بہت بڑا تھا۔ اس کی دیواریں بھی قلعے کی فصیل کی طرح اونچی اور مضبوط تھیں۔ سامنے والے رخ پر گیٹ کے دائیں بائیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر دو برجیاں نظر آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے یہ برجیاں محافظوں کے لئے

بنائی گئی تھیں۔ اور یقیناً اس مکان کے پچھلی طرف کی فصیل پر بھی ایسی ہی برجیاں ہوں گی۔

مکان کا صحن بہت وسیع و عریض تھا۔ دائیں طرف آخر میں فصیل کے قریب چھوٹے چھوٹے کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ اصطبل تھے۔ ایک دو کمروں میں گھوڑے بھی نظر آ رہے تھے۔

اس وقت سورج نکل رہا تھا اور سنہری دھوپ چمکنے لگی تھی۔ اس قلعہ نما مکان کے پچھلی طرف عمودی چٹان تھی۔ ثمینہ کے خیال میں یہ قلعہ ہر لحاظ سے محفوظ تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس قلعے میں اس کی حفاظت ہو سکے گی؟

"چلو..... یہاں کیوں کھڑی ہو۔" طور خان کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس کے ساتھی مکان کے اندر داخل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ طور خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ثمینہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں خود چل رہی ہوں۔" وہ ہولے سے غرائی۔ طور خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"میں نے گل رحمان کو بارہ بجے تک کا وقت دیا ہے لیکن مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں کہ بارہ بجے تک صبر کر سکوں گا یا نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

ثمینہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ وہ مکان میں داخل ہو گئے اور پھر کئی راہداریوں سے گزرنے کے بعد ایک کمرے میں آ گئے۔ خاصا وسیع و عریض کمرہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ریشمی غلاف والے گاؤ تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی مشرق کے رخ پر تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دھوپ اس کھڑکی کے راستے کمرے کے وسط تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جائے گا کمرے سے دھوپ ختم ہوتی جائے گی۔

"تم ادھر آرام کرو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو بھیجتا ہوں۔" طور خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

ثمینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دیا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑی کمرے میں چاروں طرف دیکھتی رہی۔ پتھر کی دیواریں اور چھت خاصی اونچی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے شہر سے نکلتے ہی اسے دور ایک اجنبی دیس میں اس طرح قیدی بن کر کسی قلعے میں رہنا پڑے گا۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے شارق کے ساتھ اس مہم پر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

دفعتاً ثمینہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ کی پتلون کا پائنچہ اٹھا دیا۔ پنڈلی پر چرمی فیتے سے ایک خنجر بندھا ہوا تھا۔ یہ خنجر بستی سے روانہ ہونے سے پہلے محراب خان کی بیٹی نے اسے دیا تھا۔ اور اب اس خنجر سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔ یہ فیصلہ تو اس نے پہلے ہی کر لیا تھا کہ وہ اپنی جان دے دے گی لیکن طور خان کو اپنے قریب نہیں آنے دے گی۔ اس نے خنجر کو ہولے سے تھپتھپایا اور پائنچہ نیچے کر دیا اور کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے وسیع و عریض لان تھا۔ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے گھاس بے ترتیب تھی اور کئی جگہوں سے سوکھی ہوئی تھی۔ لان کے دوسری طرف طور خان کا ایک آدمی کندھے پر رائفل اٹھائے ٹہل رہا تھا۔

ثمینہ کو اس کمرے میں بند ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور طور خان اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایلومینیم کی چھوٹی کیتلی تھی جو دھویں سے کالی ہو رہی تھی۔ ایک مگا تھا جس کا کنڈا ٹوٹا ہوا تھا اور ایک پلیٹ میں تلا ہوا خشک گوشت تھا اور ایک تلا ہوا نان تھا۔

طور خان نے وہ چیزیں قالین پر رکھ دیں اور ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ثمینہ کو اس کی نظریں اپنے جسم پر چبھتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم یہ ناشتہ کر لو اور پھر آرام کرو۔ بارہ بجے کے بعد تم سے بات کرے گا۔" طور خان نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

ثمینہ کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر قالین پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔ تلے ہوئے گوشت میں ہلکی سی باس تھی لیکن ذائقہ برا نہیں تھا۔ کیتلی میں قہوہ بھی خوش ذائقہ تھا جس میں الائچی کی خوشبو تھی۔ اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ کچھ سوچنے سمجھنے اور مقابلہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ جسم میں طاقت ہو اور طاقت کھائے پیئے بغیر نہیں آ سکتی تھی۔

ناشتہ کے کچھ ہی دیر بعد اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پہلے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید کھانے میں کچھ ملا دیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ رات بھر جاگی تھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کیا تھا۔ تھکن اور نیند کا غلبہ فطری بات تھی۔

ثمینہ نے اٹھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے اوپر والے حصے میں زنجیر نما کنڈا موجود تھا لیکن وہ کسی بھی طرح سے قابل اعتماد نہیں تھا۔ اس نے دل کی تسلی کے لئے کنڈا لگا دیا اور ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جاگتے رہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نیند کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور بالآخر وہ قالین پر لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر بعد نیند کی آغوش میں پہنچ

چکی تھی۔

وہ گہری نیند میں تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ یہ شاید اس کا لاشعور تھا جو نیند میں بھی اسے بے چین کئے ہوئے تھا اور پھر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے جسم کو ٹٹول رہا ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ طور خان اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر طور خان کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

ثمینہ نے طور خان کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا اور خود بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ طور خان بھی اٹھ گیا۔ اس کے بھدے ہونٹوں پر بدستور مکروہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ثمینہ کے دماغ میں اب بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی اور وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی کمرے کا دروازہ تین چار انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ناشتہ کرنے کی بعد اس نے دروازے کو اندر سے زنجیر والا کنڈا لگا دیا تھا۔ لیکن باہر سے یہ کنڈا کس طرح کھول لیا گیا تھا.... پھر اسے یاد آ گیا کہ زنجیر کی وجہ سے دروازے کے پٹ ذرا ڈھیلے رہ جاتے تھے' باہر سے دھکیلنے سے ان میں ذرا سا خلا پیدا ہو جاتا تھا اور طور خان جیسے شخص کے لئے دروازہ کھولنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

طور خان بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ثمینہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دوپہر ہو چکی ہے اور طور خان اور گل رحمان کے مذاکرات کامیاب نہیں ہو سکے اور طور خان موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے کمرے میں آ گیا ہے۔

"میرے قریب مت آنا۔" ثمینہ بدستور پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "اگر تم نے مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو...."

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔" طور خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے تو ہم کو پاگل کر دیا ہے۔ ہم نے گل رحمان کو بارہ بجے تک کا مہلت دیا تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ مگر ہم صبر نہیں کر سکتا۔ ہم کو معلوم ہے کہ گل رحمان ہمارا بات نہیں مانے گا۔ اس لئے ہم انتظار نہیں کرے گا۔ تم انکار مت کرو' ہم تم کو بہت کچھ دے گا۔"

"بند کرو بکواس۔" ثمینہ چیخی۔ اس کا خیال درست نکلا تھا۔ طور خان واقعی قابل اعتماد آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی دی ہوئی مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی وعدہ خلافی کر رہا تھا۔

ثمینہ پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ طور خان اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا اور دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلاتے ہوئے بولا۔

"ضد مت کرو..... ہم تم کو زبردستی بھی پکڑ لے گا۔ ضد کیوں کرتا ہے۔"

ثمینہ کچھ کہنے کے بجائے دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف سرکنے لگی۔ طور خان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ ثمینہ تیزی سے ایک طرف ہٹی اور چھلانگ لگا کر کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ایک لمحہ کو باہر دیکھا۔ تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔

"شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' آرام سے میرے پاس آ جاؤ۔" طور خان بولا اور پھر اس نے اچانک ہی ثمینہ پر چھلانگ لگا دی۔ ثمینہ جھکائی دے کر نکل گئی لیکن طور خان نے اپنا پیر آگے کر دیا۔ ثمینہ کی ٹانگ اس کے پیر میں الجھی اور وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

طور خان نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ثمینہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بری طرح مچلنے لگی۔ وہ چیخ بھی رہی تھی لیکن طور خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ثمینہ ایک مرتبہ اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر دیوار سے جا لگی۔ طور خان اس کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک نمایاں تھی۔ ثمینہ نے جھکائی دے کر نکلنا چاہا مگر طور خان کے قابو میں آ گئی۔ ثمینہ بے بسی سے پھڑپھڑانے لگی۔ دائیں ٹانگ کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی اور بالآخر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے پائنچہ اوپر سمیٹ کر پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ دستے پر مضبوطی سے ہاتھ جمانے کے بعد اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ سامنے لا کر طور خان پر وار کر دیا۔

عین آخری لمحہ طور خان کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے پیچھے ہٹا۔ خنجر اس کے کندھے پر لگا۔ اس کے منہ سے کراہ سی نکلی اور پھر وہ پشتو میں ماں بہن کی گالیاں بکنے لگا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ثمینہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر طور خان کی رائفل کی طرف چھلانگ لگا دی۔ طور خان نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ رائفل ثمینہ کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے خنجر کمرے کے ایک کونے میں اچھال دیا اور رائفل کو دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیا۔

رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ طور خان گالیاں بکتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ثمینہ نے رائفل کا رخ نیچے کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک زور دار دھماکہ ہوا اور گولی طور خان کے پیروں کے قریب

قالین پر لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی گالیوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

"اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو دوسری گولی تمہاری سینے میں لگے گی۔" ثمینہ غرائی۔

طور خان وہیں رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بھیڑیئے کی طرح غرایا۔

"تمہارا خیال ہے کہ تم ایک رائفل کے آسرے پر یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاؤ گی..... اس کمرے سے نکلتے ہی تمہارا جسم چھلنی ہو جائے گا۔ اس قلعے کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی قیدی آج تک یہاں سے زندہ نہیں نکلا۔"

"لیکن آج قلعے کی یہ تاریخی روایت ٹوٹ جائے گی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "آج نہ صرف میں یہاں سے زندہ نکلوں گی بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔"

طور خان نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے منہ سے کراہ سی نکل کر رہ گئی۔ کندھے پر ثمینہ کے خنجر سے لگنے والا زخم اگرچہ زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اس سے خون رس رہا تھا اور تکلیف ہو رہی تھی۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ یہاں سے نکل سکو گی۔" طور خان بولا۔

اسی لمحہ راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ راہداری میں دوڑنے والے کم از کم دو آدمی تھے اور وہ یقیناً فائر کی آواز سن آئے تھے۔ ثمینہ نے بڑی پھرتی اپنا خنجر اٹھا لیا اور طور خان کے پیچھے پہنچ کر رائفل کی نال اس کی پشت سے لگا دی۔

"اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارے جسم میں سوراخ کر دوں گی۔" وہ غرائی۔

ٹھیک اسی لمحہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ دونوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔

"کیا ہوا خان۔ یہ فائر کی آواز....."

وہ آدمی اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا تھا۔ طور خان کو رائفل کی زد پر دیکھ کر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے تو شاید سوچا بھی نہیں ہو گا کہ ایک عورت اس کے خان کو اس طرح بے بس کر دے گی۔ ان دونوں آدمیوں نے رائفلیں تان لیں لیکن ثمینہ طور خان کے پیچھے تھی اور وہ اس کا نشانہ نہیں لے سکتے تھے۔

"ان دونوں سے کہو کہ رائفلیں دروازے کے باہر راہداری میں پھینک کر کمرے کے اندر

جائیں۔" ثمینہ نے طور خان کی پشت پر رائفل کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم بچ کر نہیں جا سکو گی۔" طور خان غرایا۔

"میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔" ثمینہ بھی غرائی۔ "ورنہ ٹریگر دبا دوں گی۔"

طور خان نے پشتو زبان میں اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ ان کے چہروں پر حیرت بڑھ گئی تھی۔ انہیں شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ان سے کہو رائفلیں پھینک دیں۔" ثمینہ پھر غرائی۔ اس نے رائفل کا دباؤ کچھ بڑھا دیا تھا۔

اس مرتبہ طور خان نے اپنے آدمیوں سے بات کی تو اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ ان دونوں نے رائفلیں دروازے کے باہر راہداری میں پھینک دیں اور کمرے میں آ گئے۔

"ان سے کہو دیوار کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ دیوار سے لگا کر کھڑے ہو جائیں۔" ثمینہ نے طور خان کو حکم دیا۔

طور خان نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ثمینہ کا یہ حکم دہرا دیا۔ وہ دونوں خونخوار نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے سامنے والی دیوار کے قریب پہنچ گئے اور دونوں ہاتھ سر سے ذرا اوپر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"تم بھی ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو اور کمرے سے باہر نکلو۔" ثمینہ نے طور خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بلا دریغ گولی چلا دوں گی۔"

طور خان دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ راہداری میں پہنچ کر وہ بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا۔ وہ راہداری میں پڑی ہوئی رائفل اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس قسم کی کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لئے وہ تیار تھی۔ اسے پہلے ہی امید تھی کہ طور خان ایسی کوئی حرکت کرے گا۔ طور خان جیسے ہی جھکا ثمینہ نے بڑی پھرتی اس کے کولہوں پر زور دار لات رسید کر دی۔ طور خان کراہتا ہوا آگے گرا۔ لیکن اس کا ہاتھ ایک رائفل پر پڑ گیا تھا۔ ثمینہ نے ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ اس نے اگرچہ بے تکا فائر کیا تھا لیکن گولی طور خان کے ہاتھ پر لگی اور ہاتھ میں سوراخ کرتی ہوئی فرش سے ٹکرا کر سامنے والی دیوار پر لگی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی طور خان کی چیخ بھی فضا میں گونجی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور بڑی احتیاط سے جھک کر اس نے زمین پر پڑی ہوئی دونوں رائفلیں اٹھا کر کندھے پر لٹکا لیں اور اپنی رائفل تانتے ہوئے بولی۔

"اب تم اس کمرے تک میری رہنمائی کرو گے جہاں گل رحمان اور میرے ساتھی قید ہیں۔"

طور خان گالیاں بک رہا تھا لیکن اس نے ثمینہ کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ابھی دو قدم آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی رائفل سنبھالے راہداری میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل سیدھی کرتا ثمینہ نے گول چلا دی' گولی نے اس شخص کی کھوپڑی اڑا دی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ طور خان کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ ثمینہ کی طرف جھپٹا مگر ثمینہ نے بلا توقف فائر کر دیا۔ اس مرتبہ گولی طور خان کے دائیں بازو پر لگی اور قمیض کی آستین چھیدتی ہوئی نکل گئی۔ گولی چلانے کے ساتھ ہی ثمینہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا کہ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔" ثمینہ نے کہا۔ "اب تم خاموشی سے مجھے اس کمرے میں لے چلو جہاں میرے ساتھی قید ہیں۔"

اس مرتبہ واقعی طور خان نے کوئی غلط حرکت نہیں کی اور ثمینہ کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا اور کندھے کے زخم سے بھی خون رس رہا تھا جس سے کندھے کے قریب اس کی قمیض سرخ ہو رہی تھی۔

ایک راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تو طور خان نے چیخ کر کہا کہ جو جہاں ہے وہیں کھڑا رہے۔

"نہیں۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ مکان سے نکل کر باہر گھاس پر کھڑے ہو جائیں اور اپنی رائفلیں مکان کی اندر ہی چھوڑ دیں۔" ثمینہ نے طور خان سے کہا۔

طور خان نے چیخ کر اس کا یہ حکم اپنے آدمیوں تک پہنچا دیا۔

"طور خان!" دائیں طرف سے راہداری سے ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "تم کہاں ہو۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔" طور خان نے جواب دیا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"چلو.... آگے بڑھو۔" ثمینہ نے رائفل سے طور خان کو ٹھوکا دیا۔

طور خان مختلف راہداریوں سے ہوتا ہوا ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ یہ کمرہ غالباً باقاعدہ قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کے دروازے کے اوپر والے حصے پر ایک چھوٹا سا روشندان بنا ہوا تھا جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ خاصا بھاری تھا۔ باہر کی طرف سے ایک مضبوط اور موٹا کنڈا لگا ہوا تھا۔ اس کنڈے میں تالہ نہیں تھا۔

"وہ لوگ اس کمرے میں ہیں۔" طور خان نے اشارہ کیا۔

"دروازہ کھولو۔" ثمینہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

طور خان جیسے ہی دروازے کی طرف بڑھا ثمینہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اسے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت وہ ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار تھی۔

طور خان نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں سامنے ہی اس کے ساتھی موجود تھے۔ ثمینہ کی قمیض سامنے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر پہلے تو گل رحمان وغیرہ پریشان ہو گئے لیکن اس کے ہاتھ میں رائفل اور زخمی طور خان کو دیکھ کر انہیں صورتحال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

گل رحمان دوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا' اس نے ادھر ادھر دیکھا' راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ طور خان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ثمینہ کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"بے غیرت۔ نمک حرام۔" گل رحمان نے چیختے ہوئے طور خان کے منہ پر زور دار گھونسہ جڑ دیا۔ "تم نے مہمانوں کی توہین کی ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں زندہ چھوڑا جائے۔" اس نے جھپٹ کر ثمینہ سے رائفل چھین لی۔

طور خان کے چہرے پر پہلی مرتبہ خوف کی تاثرات ابھرے تھے۔ جبڑے پر گھونسہ کھا کر وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن گل رحمان نے رائفل کی نال اس کی طرف اٹھا کر ٹریگر دبا دیا اور کئی گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔

شارق وغیرہ بھی دوڑ کر کمرے سے نکل آئے تھے۔ ثمینہ نے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل اتار کر ایک بازت خان اور دوسری شارق کی جانب بڑھا دی۔

"یہ رائفل تم اپنے پاس رکھو۔ مجھے معلوم ہے انہوں نے ہماری رائفلیں کہاں رکھی تھیں۔"

شارق نے وہ رائفل ثمینہ کو لوٹا دی اور دوڑ کر ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے کے دروازے کا بھی باہر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔ وہ کنڈا کھول کر اندر داخل ہو گیا اور رائفلیں اٹھا کر باہر لے آیا۔ سب نے اپنی اپنی رائفلیں لے لیں۔ اب ان کے پاس تین رائفلیں فالتو ہو گئی تھیں۔

گل رحمان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ طور خان کو قتل کر دینے کے بعد بھی اسے سکون نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ثمینہ کی طرف دیکھا اور اپنی واسکٹ اتار کر اس کی طرف اچھال دی۔

"ابھی تو تم یہ پہن لو..... پھر تمہارے لئے کپڑوں کا بندوبست کرتے ہیں۔"

ثمینہ نے واسکٹ پہن کر سامنے کے بٹن بند کر لئے۔ ٹھیک اس وقت مکان میں کسی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ طور خان کے ساتھی تھے جو فائرنگ کرتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔

"اس طرف..... تم لوگ اس طرف سے نکل جاؤ۔" گل رحمان نے دائیں راہداری کی طرف اشارہ کیا۔ "بازت خان تم ان لوگوں کو لے کر پہاڑی والے راستے پر پہنچو اور نجیب اللہ' شارق تم دونوں میرے ساتھ رہو۔"

بازت خان' نولکھا اور ثمینہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں اڑ گئے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔

"میں تم دونوں کو بازت خان کے ساتھ اس لئے بھیج رہا ہوں کہ طور خان کے آدمیوں کو پچھلی طرف سے بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔ تم لوگ انہیں روکو گے بھی اور یاد رکھو کسی کو زندہ بچ کر نکلنے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔" گل رحمان نے کہا۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ دونوں بازت خان کے ساتھ راہداری میں دوڑنے لگے۔ دوسری راہداری کے اختتام پر ایک دیوار نے ان کا راستہ روک لیا۔ یہ پتھر کی دیوار تھی اور غالباً کسی چٹان کا ایک حصہ تھی جس میں لوہے کا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ بازت خان نے کنڈا کھول دیا۔

دوسری طرف چٹان میں ایک تنگ سی دراڑ تھی جس میں پتھر کاٹ کر سیڑھیاں سی بنا دی گئی تھیں۔ یہ دراڑ مسلسل اوپر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ دراڑ میں داخل ہو گئے۔ بازت خان آگے تھا۔ اس کے پیچھے نولکھا اور آخر میں ثمینہ۔ چٹانی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نولکھا بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ ثمینہ اسے مسلسل دھکیل رہی تھی۔

بالآخر وہ دراڑ سے نکل کر ایک کشادہ جگہ پر پہنچ گئے۔ ثمینہ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اس مکان سے تقریباً پچاس فٹ اوپر چٹان پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے قلعہ نما وہ مکان اور اس کا وسیع و عریض صحن اور سامنے کا گیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔

"نولکھا بھائی۔ تم ادھر رک جاؤ۔ اگر کوئی سامنے والے گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دو اور ثمینہ بی بی تم میرے ساتھ آؤ۔" بازت خان نے کہا۔

نولکھا وہیں چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ثمینہ' بازت خان کے ساتھ چلنے لگی۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ رک گئے۔ یہاں سے وہ چھوٹا گیٹ صاف نظر آ رہا تھا جو مکان کے عقب میں واقع ایک چٹانی دیوار میں بنا ہوا تھا۔ اس گیٹ کے دوسری طرف تقریباً عمودی ڈھلان تھی اور

ایک تنگ سا راستہ نشیب میں دریا کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دونوں چٹان پر مختلف جگہوں پر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

"طور خان کے آدمیوں میں سے اگر کوئی زندہ بچ گیا تو اس راستے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔" بازت خان نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو..... اگر کوئی اس طرف آیا تو زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نیچے مکان میں فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جو تقریباً نصف گھنٹے تک جاری رہیں اور بالآخر خاموشی چھا گئی۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی پوزیشن نہیں چھوڑی۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے اور پھر نجیب اللہ کی آواز سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ ثمینہ نے مڑ کر دیکھا۔ نجیب اللہ نولکھا کے قریب کھڑا تھا اور انہیں واپس آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی جگہوں سے اٹھ کر واپس آ گئے۔

ثمینہ نے واسکٹ کے بٹن اوپر تک بند کر رکھے تھے اور وہ کچھ عجیب سی الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کبھی تنگ گریبان کی قمیض نہیں پہنی تھی اور واسکٹ کے بٹن گلے تک لگے ہوئے تھے۔

وہ اسی دراڑ والے راستے سے ہوتے ہوئے مکان میں واپس آ گئے۔ طور خان کی لاش اسی جگہ پڑی تھی۔ جہاں گل رحمان نے اسے گولیوں سے چھلنی کیا تھا۔ ایک لاش اس سے اگلی راہداری میں پڑی تھی اور پھر ثمینہ نے گھوم پھر کر دیکھ لیا کہ طور خان کا کوئی بھی آدمی زندہ نہیں بچا تھا۔ ان سب کی لاشیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔

گل رحمان' ثمینہ کو ایک کمرے میں لے گیا۔ یہاں بھی قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار میں دو الماریاں بنی ہوئی تھیں۔

"اس الماری میں کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔" گل رحمان ایک الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم کپڑے بدل لو..... ہم اتنی دیر میں لاشیں ٹھکانے لگا دیتے ہیں اس کے بعد کھانے کا بندوبست کریں گے اور پھر باتیں بھی ہوں گی۔"

شارق بھی ساتھ تھا۔ وہ بھی گل رحمان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ثمینہ نے دروازہ بند کر لیا اور الماری کھول لی۔ اور اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس الماری میں کئی روسی فوجی وردیاں ہینگروں پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ ایک شرٹ پر کرنل کے عہدے کے نشان لگے ہوئے تھے اور وہ قمیض ثمینہ کو بالکل فٹ آئی تھی۔ اس نے وہی وردی پہن لی۔ پتلون بھی بالکل ٹھیک آئی تھی۔ ثمینہ

نے روسی فوج اور افغان مجاہدین کی جنگ کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھا تھا اور اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی افغانستان جائے گی اور روسی فوج کے کسی کرنل کی وردی پہنے گی۔ اس نے اپنا خنجر بھی صاف کر کے پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا تھا۔

چند منٹ بعد جب وہ کمرے سے نکلی تو ادھر ادھر بکھری ہوئی تمام لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ وہ مکان سے باہر آ گئی۔ صحن میں دائیں طرف دیوار کے قریب لوگ جمع تھے۔ ثمینہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ نجیب اللہ اور بازت خان گڑھا کھود رہے تھے۔ قریب ہی ایک طرف طور خان اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔ گڑھا خاصا بڑا اور گہرا تھا۔ لاشوں کو گڑھے میں ڈال کر مٹی ڈال دی گئی۔

وہ لوگ مکان میں واپس آ گئے۔ گل رحمان اپنے آدمیوں کو لے کر کچن میں چلا گیا اور ثمینہ، شارق اور نولکھا کو لے کر اسی کمرے میں آ گئی جہاں اس نے کپڑے بدلے تھے۔

"اس وردی میں تو تم واقعی روسی فوج کی کرنل لگتی ہو۔" شارق نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کسی کرنل سے کم تو نہیں ہوں۔" ثمینہ مسکرائی۔

"تم واقعی کسی فوجی کی طرح بہادر ہو۔" شارق نے کہا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ واقعہ کیا ہوا تھا۔ طور خان جیسا آدمی تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟"

"وہ بہت ہی گھٹیا آدمی تھا۔" ثمینہ نے کہا۔ چند لمحے خاموش رہی پھر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ اگر محراب خان کی بیٹی کا دیا ہوا یہ خنجر میرے پاس نہ ہوتا تو آج میں اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی تھی۔" اس نے پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال کر دکھایا۔

ثمینہ اور شارق باتیں کر رہے تھے اور نولکھا گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ تقریباً تین بجے گل رحمان نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ نولکھا کو جگا دیا گیا۔ اور وہ لوگ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں قالین پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا لگا ہوا تھا۔ تلا ہوا بکرے کا خشک گوشت، موٹی موٹی روٹیاں اور ایک دو اور چیزیں تھیں جو گوشت ہی سے تیار کی گئی تھیں۔

ثمینہ کو اس وقت کھانا پہلے سے زیادہ لذیذ لگا۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ دوسروں نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ کھانے کے بعد قہوہ کا دور چلا۔ ثمینہ کو گل رحمان کے سامنے بھی اپنی کہانی دہرانی پڑی تھی۔

"طور خان اور اس کی آدمیوں کے قتل سے ان کے قبیلے سے تمہاری دشمنی نہیں شروع ہو

جائے گی۔" نولکھا نے گل رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری دشمنیاں تو نسل در نسل چلتی ہیں لیکن....." گل رحمان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن جب طور خان کے قبیلے والوں کو معلوم ہو گا کہ وہ کس وجہ سے مارا گیا ہے تو وہ لوگ بھی اس سے نفرت کریں گے۔ ہم پٹھانوں میں مہمانوں کو بہت عزت دی جاتی ہے۔ اگر کوئی میرا جانی دشمن میرے مکان پر حملہ کر دے اور اسے پتہ چل جائے کہ میرے گھر میں کوئی مہمان ٹھہرا ہوا ہے تو وہ مہمان کو کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ لیکن یہ طور خان..... بہت بے غیرت تھا' اس نے جو کچھ بھی کیا اس پر میں شرمندہ ہوں اور ثمینہ بی بی سے معافی مانگتا ہوں۔"

"اس نے جو کچھ بھی کیا اس کی سزا اسے مل گئی ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"بہرحال!" شارق نے کہا۔ "اب یہ قصہ بھی تمام ہوا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اب کیا پروگرام ہے؟"

"کل کسی وقت ملک فیروز یہاں آئے گا۔" گل رحمان نے جواب دیا۔ "یہ تو اچھا ہوا کہ طور خان کا معاملہ ختم ہو گیا۔ اگر کل فیروز کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوتا تو اس پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔"

"ملک فیروز کون ہے؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ پلندر خان کا خاص آدمی ہے جو ہمیں پلندر خان کے پاس لے جائے گا۔ مال ہمیں پلندر خان ہی سے وصول کرنا ہو گا۔" گل رحمان نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اور آگے جانا ہو گا۔" ثمینہ بولی۔ "ہمارا یہ سفر ختم بھی ہو گا یا نہیں؟"

"شاید تم پچھلے واقعات کی وجہ سے اس سفر سے اکتا گئی ہو۔" گل رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب وہ صورت حال نہیں رہی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب تم اس سفر سے پوری طرح لطف اندوز ہو گی۔"

"لیکن جانا کہاں ہے؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہماری منزل صوبہ لوگر میں کابل غزنی شاہراہ پر واقع سید آباد نامی وہ چھوٹا سا شہر ہے جہاں پلندر خان ہمارا منتظر ہے۔ دریائے لوگر کی وادی کو افغانستان کی حسین ترین وادی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں سرسبز پہاڑ بھی ہیں' میلوں تک پھیلی ہوئی زرخیز وادیاں بھی اور گنگناتی ہوئی ندیاں' نالے اور دریا بھی۔ تمہیں اس سفر میں بوریت نہیں ہو گی۔"

"کتنے گھنٹے کا سفر ہو گا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"گھنٹے نہیں دن۔" گل رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گھوڑوں پر سفر کرتے ہوئے دو یا تین دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"دو تین دن۔" ثمینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

نولکھا اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ دو تین دن کا سن کر وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

"او بھائی گل رحمان!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے تم ہمیں سفر میں ہی خرچ کر دو گے۔"

"یہی تو زندگی ہے نولکھا بھائی!" گل رحمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آؤ..... میں تم لوگوں کو اس قلعے کی سیر کراؤں۔ روسیوں کے خلاف جنگ میں یہ قلعہ مجاہدین کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ تم اس کی تاریخ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"یہ قلعہ تم نے بنوایا ہے؟" نولکھا کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"یہ قلعہ میں نے تو نہیں بنایا لیکن اس کے نقشے سے اس طرح واقف ہوں جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے۔ آؤ..... میں تم لوگوں کو دکھاؤں۔" گل رحمان کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ لوگ بھی اس کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے اور گل رحمان انہیں مختلف راہداریوں اور کمروں میں گھماتا ہوا اس قلعے کی تاریخ کے بارے میں بتانے لگا۔

○

باہر سے وہ مکان بظاہر چھوٹا لگتا تھا لیکن گھوم پھر کر دیکھنے سے پتہ چلا کہ واقعی قلعے کی طرح وسیع و عریض تھا۔ اس کا صحن اتنا بڑا تھا کہ اس میں تین چار سو افراد کی رہائش کا بندوبست ہو سکتا تھا۔ مکان کے پچھلی طرف پہاڑی کے دامن میں بھی کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں گل رحمان نے بتایا کہ ان کمروں کو اناج کے گوداموں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

اس مکان کے نیچے ایک بہت بڑا تہہ خانہ بھی تھا۔ گل رحمان نے انہیں وہ تہہ خانہ بھی دکھایا۔ گل رحمان کے کہنے کے مطابق روسی فوج سے لڑائی کے دوران یہ قلعہ افغان مجاہدین کی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز رہا تھا۔ یہاں سے کابل کی طرف مجاہدین کو گولہ بارود اور کھانے پینے کی اشیاء فراہم کی جاتی تھیں۔ پاکستان آنے والے افغان مہاجرین کے بیشتر قافلے یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ اور روسی فوج کے گن شپ ہیلی کاپٹران کا تعاقب کرتے ہوئے بعض اوقات پاکستان کی سرحد میں بھی داخل ہو جاتے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ پاکستانی بستیوں پر میزائل بھی پھینکے تھے جن سے جانی و مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ اس قلعے میں مقیم مجاہدین روسی گن شپ ہیلی کاپٹروں کی

مزاحمت بھی کرتے تھے۔

ثمینہ نے اپنے کمرے کی اس الماری میں بہت سی روسی فوجی وردیاں دیکھی تھیں۔ ان کے بارے میں گل رحمان نے بتایا کہ اس قلعے میں مقیم افغان مجاہدین روسی فوجیوں کے کیمپوں پر حملے کرتے اور مال غنیمت اس قلعے میں جمع کیا جاتا جن میں خوراک کے ذخیرے، گولہ بارود کے علاوہ فوجی وردیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ بعد میں یہ چیزیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔

جب وہ قلعے کی سیر کر کے گھاس کے میدان میں آئے تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ وہ لوگ گھاس پر ہی بیٹھ گئے۔ نجیب اللہ ان سب کے لئے قہوہ بنا کر لے آیا اور قہوہ کی چسکیوں کے دوران بھی گل رحمان انہیں افغان مجاہدین کے کارناموں کے بارے میں بتاتا رہا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ لوگ ایک کمرے میں آ گئے۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔ روشنی کے لئے مشعلیں استعمال کی جا رہی تھیں جن میں جانوروں کی چربی استعمال ہوتی تھی۔

کمروں کی دیواروں میں مشعلوں کے لئے باقاعدہ اسٹینڈ بنے ہوئے تھے جن کے اوپر چمنی نما پائپ لگے ہوئے تھے۔ دھواں ان چمنیوں کے ذریعے باہر نکل جاتا تھا۔ اس طرح کمروں میں نہ تو چربی کے جلنے کی بو پھیلتی تھی اور نہ ہی دھواں۔

رات کا کھانا آٹھ بجے سے پہلے ہی کھا لیا گیا۔ طور خان اور اس کے ساتھیوں کا قصہ تمام ہو جانے کے بعد اگرچہ کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن گل رحمان نے اپنے ایک آدمی کی ڈیوٹی قلعے کے گیٹ پر لگا دی۔

ثمینہ، شارق اور نولکھا ایک کمرے میں تھے اور گل رحمان بازت خان کے ساتھ دوسرے کمرے میں۔ نجیب اللہ گیٹ پر جا چکا تھا۔

وہ تینوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نولکھا جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے تھے۔ شارق اپنی جگہ سے اٹھ کر ثمینہ کے قریب آ گیا اور وہ دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور بالآخر وہ بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

رات کے آخری پہر ثمینہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں مشعل کی روشنی تھی۔ شارق اور نولکھا گہری نیند میں تھے۔ نولکھا کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ ثمینہ کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی آنکھ کیوں کھل گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ بہت ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی۔ اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں اللہ اکبر کی صدا سنائی دینے لگی۔ وہ نجیب اللہ تھا جو باہر کسی جگہ پر کھڑا اذان دے رہا تھا۔ ثمینہ کو ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے اور یہ بات اس نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ یہ لوگ نماز کی

بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔

ثمینہ کھڑکی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے تین آدمیوں کو گھاس پر کھڑے دیکھا۔ وہ گل رحمان اور اس کے دونوں ساتھی تھے۔ جو فجر کی نماز کے لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔ بازت خان جماعت کروا رہا تھا۔

جب وہ لوگ نماز پڑھ چکے تو ثمینہ بھی کمرے سے نکل آئی۔ باہر آتے ہی اسے پھریری سی آ گئی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا نے اس کے پورے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ وہ دیر تک تازہ اور ٹھنڈی ہوا میں ٹہلتی رہی۔

سات بجے تک نولکھا اور شارق بھی اٹھ گئے۔ ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ وہ سب لوگ ایک کمرے میں جمع ہو گئے۔ ناشتہ کے بعد باقی لوگ تو اسی کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے البتہ ثمینہ کمرے سے باہر آ گئی اور قلعے کے وسیع و عریض صحن میں گھومنے لگی۔ گیٹ کے قریب ہی دائیں طرف فصیل کے ساتھ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں جہاں فصیل پر ایک چھوٹا سا واچ ٹاور بنا ہوا تھا۔ ثمینہ سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

واچ ٹاور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چار بائی چار فٹ کا کمرہ تھا جس کی اونچائی بھی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ پتھر کی دیواروں میں چاروں طرف بڑے بڑے سوراخ بنے ہوئے تھے جن سے اطراف میں دیکھا جا سکتا تھا اور انہی سوراخوں سے رائفلوں سے فائرنگ بھی کی جا سکتی تھی۔

ثمینہ سامنے والے سوراخ سے باہر جھانکنے لگی۔ یہ سوراخ چار انچ چوڑا اور چھ انچ لمبا تھا۔ اس سے قلعے کے گیٹ سے لے کر نشیب میں دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ ثمینہ کو اس سوراخ سے باہر جھانکتے ہوئے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے وقت سے صدیوں پیچھے چلی گئی ہو۔ نشیب میں بہت دور دریا کا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دریا کے دوسری طرف پہاڑیاں تھیں۔ انہی پہاڑیوں میں وہ تنگ سا درہ بھی دکھائی دے رہا تھا جس سے گزر کر وہ لوگ یہاں آئے تھے۔

ثمینہ واچ ٹاور میں کھڑی ان سوراخوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت دائیں طرف والے سوراخ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس طرف دریا بہت آگے جا کر پہاڑیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ ثمینہ وہاں سے ہٹنا چاہتی تھی کہ دریا کے دوسری طرف کوئی متحرک چیز دیکھ کر چونک سی گئی۔ وہ غور سے اس طرف دیکھنے لگی۔ وہ کوئی گھوڑا سوار تھا جو دریا کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ اسی طرف آ رہا تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے گھڑ سوار کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل کی نالی دھوپ میں بار بار چمک رہی تھی۔ ثمینہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

گھوڑا سوار ایک جگہ رک گیا۔ گھوڑے کا رخ اب دریا کی طرف تھا۔ گھوڑا سوار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید دریا پار کرنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ پھر چند گز آگے بڑھ کر اس نے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ اس جگہ دریا میں جگہ جگہ پتھر بھی ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہ تو ثمینہ کل ہی دیکھ چکی تھی کہ دریا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ کل انہوں نے بھی اسی طرح دریا پار کیا تھا۔

گھوڑا آہستہ آہستہ پانی میں چلتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ کئی جگہ سوار کو گھوڑے کا رخ بدلنا پڑا تھا اور بالآخر وہ کنارے پر پہنچ گیا۔ اب گھوڑے کا رخ اس قلعے کی طرف تھا۔

گھڑ سوار کا چہرہ دھوپ کے رخ پر تھا اور ثمینہ اس کا چہرہ بھی دیکھ سکتی تھی۔ وہ کوئی لمبا تڑنگا افغان تھا۔ چھوٹی داڑھی بھی تھی۔ ثمینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر واچ ٹاور کی سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئی اور مکان کی طرف دوڑنے لگی۔ گل رحمان وغیرہ ابھی تک اسی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے' بڑی بدحواس ہو رہی ہو؟" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک گھوڑا سوار اس طرف آ رہا ہے۔ وہ زیادہ دور نہیں ہے۔" ثمینہ نے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" گل رحمان ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ یقیناً ملک فیروز ہو گا۔" اس نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی رائفل اٹھا لی۔

نجیب اللہ خان' بازت خان اور شارق بھی اپنی رائفلیں اٹھا کر اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئے تھے۔ نولکھا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا تھا۔ ثمینہ نے بھی باہر جانا چاہا تو نولکھا نے اسے روک لیا۔

"بیٹھو ثمینہ بی بی۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" نولکھا نے کہا۔

ثمینہ اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات کرنا چاہتے ہو نولکھا؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لاہور میں حاجی سے ایگری منٹ کر کے تو ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" نولکھا بولا۔

"گھبرا گئے؟" ثمینہ مسکرائی۔ "میں عورت ہو کر نہیں گھبرائی اور تم مرد ہو کر گھبرا رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے ثمینہ بی بی۔" نولکھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "گل رحمان بتا رہا تھا کہ ہمیں گھوڑوں پر دو تین دن کی مسافت اور طے کرنی ہے۔

اس ملک کے حالات کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ تم تو ناشتہ کر کے گھومنے پھرنے چلی گئی تھیں اور ہم یہی باتیں کر رہے تھے۔ گل رحمان بتا رہا تھا کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے کئی دھڑے بن گئے ہیں۔ دو بڑی پارٹیاں ہیں جو حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں۔ چھوٹی پارٹیاں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ کابل کو تو انہوں نے کھنڈر بنا دیا ہے۔ خود گل رحمان بتا رہا تھا کہ افغانستان کو روسیوں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا افغان لیڈر پہنچا چکے ہیں یا پہنچا رہے ہیں۔"

"لیکن ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق؟" ثمینہ نے کہا۔

"تعلق ہے۔" نولکھا نے کہا۔ "جس علاقے میں ہم سفر کریں گے یا جہاں تک ہمیں جانا ہے وہاں بھی افغان باشندے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہم اگر اس لڑائی میں پھنس گئے تو زندہ بچنا مشکل ہو گا۔"

"ہم ان کی لڑائی میں کیوں الجھنے لگے۔" ثمینہ نے کہا۔

"ہمارا آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے ثمینہ بی بی! وہ سارا علاقہ لڑائی کی زد میں ہے۔ ہم بھی نہ چاہنے کے باوجود اس زد میں آ سکتے ہیں۔" نولکھا نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولا۔ "مجھے تو اب حاجی کی نیت پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔"

"کیسا شبہ؟" ثمینہ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لاہور اور اس کے نواح میں منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ پر حاجی کی اجارہ داری تھی۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی پارٹیاں تھیں جن سے حاجی کو خطرہ نہیں تھا لیکن شارق باؤ' حاجی کے لئے بہت بڑ خطرہ بن کر سامنے آ گیا۔ کسی خطرے سے نمٹنے کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا جواب طاقت ہ سے دیا جائے۔ سیاست بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ حاجی نے شارق کے خطرے سے نمٹنے کے لئے ب طریقہ اختیار کیا۔ اس نے کمیشن کا لالچ دے کر شارق کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسے کراچی کا مشن سونپا گیا اور اب افغانستان کا یہ مشن!" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس خطرناک مشن پر بھیج کر وہ شارق باؤ اور ہم سے نجات حاصل کرنا چاہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر خطرات ہیں۔ افغانوں کی لڑائی میں ہمارا تیا پانچا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے خطرے ہیں۔ جن سے اگر ہم بچ گئے تو ہم بہت ہی خوش قسمت ہوں گے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ حاجی نے ہماری موت کا پورا بندوبست کر کے ہمیں یہاں بھیجا ہے کل کا واقعہ تمہارے سامنے ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ سب کچھ بھی ہمارے خلاف سازش کا ایک حصہ تھا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے ذہن میں یہ بدگمانیاں کیوں پیدا ہو رہی ہیں۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل جو کچھ بھی ہوا اس کی وجہ میں تھی۔ یہ بات تو میں نے پارہ چنار ہی میں محسوس کر لی تھی کہ میرے بارے میں طور خان کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ محراب خان والی بستی میں اس نے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور اسے بھاگنا پڑا۔ وہ ہم سے پہلے اس قلعے میں پہنچ گیا اور اسے ہم پر قابو پانے کا موقع مل گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ تم بھی دیکھ چکے ہو۔ اگر یہ ہمارے خلاف کوئی سازش ہوتی تو گل رحمان' طور خان اور اس کے چھ سات آدمیوں کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیتا۔ نہیں نولکھا میں تم سے اتفاق نہیں کروں گی۔ بالفرض' اگر حاجی نے ہمیں کسی سازش کے تحت یہاں بھیجا ہوتا تو افغانستان کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ہمیں بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی۔" ثمینہ اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ "حاجی اور گل رحمان کے بارے میں شبہات ذہن سے نکال دو۔ اگر ہم اس مشن میں کامیاب ہوئے تو یقین کرو حاجی ہمارے قدموں میں ہو گا۔ شارق بھی بیوقوف نہیں ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر حاجی کی یہ پیشکش قبول کی تھی۔ وہ اس گینگ کے مرکزی آدمیوں سے رابطے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر شارق اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو چند ہفتوں بعد لوگ حاجی کا نام بھول جائیں گے۔" وہ بات کرتے کرتے رک گئی اور کھڑکی سے قلعے کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر نولکھا کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "جس گھوڑا سوار کو میں نے دریا کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا وہ قلعے کے گیٹ پر پہنچ گیا ہے۔ گل رحمان اور اس کے ساتھی بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ آؤ دیکھتے ہیں وہ کون ہے؟"

وہ کھڑکی سے ہٹ کر دراوزے کی طرف بڑھ گئی۔ نولکھا بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں راہداریوں سے نکل کر برآمدے کے سامنے رک گئے۔ بازت خان مہمان کا گھوڑا لے کر اصطبل کی طرف جا رہا تھا۔ اور مہمان گل رحمان وغیرہ کے ساتھ مکان کی طرف آ رہا تھا۔ ثمینہ اور نولکھا بھی چند قدم آگے بڑھ گئے۔ مہمان نے گرم جوشی سے نولکھا سے معانقہ کیا۔ پھر دونوں بانہیں پھیلا کر ثمینہ کی طرف بڑھا۔ ثمینہ بدحواس سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے روسی فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی اور بادی النظر میں وہ کوئی مرد ہی لگتی تھی۔ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر مہمان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ لیکن جب گل رحمان نے اپنی زبان میں بتایا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے تو مہمان کے چہرے پر الجھن کے سے تاثرات ابھرے پھر جھینپ مٹانے کے لئے قہقہہ لگا دیا۔ دوسرے بھی اس قہقہہ میں شامل ہو گئے۔ ثمینہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ

رہی تھی۔ وہ ملک فیروز تھا۔ ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' سرخ و سفید رنگت اور چھوٹی سیاہ داڑھی اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ثمینہ کے اندازے کی مطابق اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

وہ لوگ اسی کمرے میں آ گئے جہاں ناشتہ کیا گیا تھا۔ ملک فیروز طویل سفر کر کے آیا تھا۔ وہ نہ صرف تھکا ہوا تھا بلکہ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے اس کے لئے ناشتے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بازت خان پندرہ منٹ کے اندر اندر اس کے لئے ناشتہ اور سب کے لئے قہوہ تیار کر کے لے آیا۔

ناشتے کے بعد وہ تو باتیں کرنے لگے اور ثمینہ اور نولکھا کمرے سے باہر نکل آئے اور برآمدے میں بیٹھ گئے۔

دوپہر کے کھانے پر وہ سب جمع تھے۔ اس وقت ثمینہ کو بتایا گیا کہ وہ لوگ کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ثمینہ تو خوش تھی لیکن نولکھا کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود حاجی کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات کو ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ملک فیروز سو گیا۔ ثمینہ' نولکھا اور شارق دوسرے کمرے میں آ گئے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر وہ لوگ بھی اونگھنے لگے۔

رات کا کھانا بھی حسب معمول جلد ہی کھا لیا گیا۔ اس رات نولکھا نے شارق کے سامنے بھی اپنے خدشات کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے بھی ثمینہ کی طرح نولکھا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب ان کے لئے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے گل رحمان وغیرہ کو ان کی واپسی پر کوئی اعتراض نہ ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی رہنمائی کے بغیر وہ واپس کیسے جا سکیں گے۔ وہ ان پہاڑوں میں بھٹک کر بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر جائیں گے۔

نولکھا نے بحث نہیں کی۔ ثمینہ اور شارق کی باتوں سے اسے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے اس کے خیال میں شارق کا یہ کہنا درست ہی تھا کہ اگر گل رحمان ان کی واپسی پر آمادہ ہو بھی گیا تو وہ کسی رہنمائی کے بغیر ان پہاڑوں میں بھٹک کر بڑی اذیت ناک موت مریں گے۔

شارق اور ثمینہ تو سو گئے لیکن نولکھا دیر تک جاگتا اور یہی سب کچھ سوچتا رہا اور بالآخر اسے بھی نیند آ ہی گئی۔

وہ لوگ صبح پانچ بجے اٹھ گئے۔ حسب معمولی بازت خان نے ان سب کے لئے ناشتہ تیار کیا۔ راستے کے لئے بھی کچھ روٹیاں تیار کر لی گئیں۔ بکرے کا خشک گوشت وافر مقدار میں موجود تھا۔

بازت خان نے تمام چیزیں پیک کر کے گھوڑے پر لاد دیں۔ اور پھر طلوع آفتاب سے پہلے ہی وہ لوگ اس قلعے سے رخصت ہو گئے۔

سردی اچھی خاصی تھی۔ ان سب نے روسی فوجی جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ فوجی وردیوں کی طرح جیکٹیں بھی وافر مقدار میں قلعے میں موجود تھیں۔ ثمینہ نے تو تین فالتو جیکٹیں بھی اپنے گھوڑے کی خرجی میں ٹھونس لی تھیں۔

دریا اسی جگہ سے پار کیا گیا جہاں سے گزشتہ روز ثمینہ نے ملک فیروز کو پار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دریا پار کرنے کے بعد وہ کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ملک فیروز اور گل رحمان کے گھوڑے آگے تھے۔ ان کے پیچھے ثمینہ' شارق اور نولکھا اور سب سے آخر میں نجیب اللہ اور بازت خان تھے۔

دریا کے دونوں طرف اونچے پہاڑ تھے۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر تو درخت نظر آ رہے تھے مگر ان کے دامن بنجر تھے۔ کہیں کہیں جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ تنگ سی وادی میں چلتے رہے۔ ایک جگہ دریا دائیں طرف پہاڑوں میں غائب ہو گیا لیکن وہ اس تنگ سی وادی میں چلتے رہے اور بالآخر ایک تنگ سے درے میں سے گزر کر ایک وسیع و عریض وادی میں پہنچ گئے۔ دریا پہاڑوں میں گھومتا ہوا پھر سامنے آ گیا۔ ثمینہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ درے سے پہلے جس تنگ سی وادی سے وہ گزر کر آئے تھے وہ بنجر اور ویران تھی لیکن دوسری طرف سرسبز و شاداب وادی ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔

دھوپ تیز ہونے کے باوجود یہاں سردی تھی۔ وہ کہیں رکے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ دریا کبھی سامنے آ جاتا اور کبھی وادی میں کہیں غائب ہو جاتا۔ دو بجے کے لگ بھگ وہ ایک چٹان کے قریب رک گئے۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ دریا دائیں طرف تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور بائیں طرف وہ چٹان تھی جس کے قریب وہ رکے تھے۔ اس چٹان سے تقریباً ساٹھ فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ آبشار سے گرنے والا پانی ایک ندی کی صورت میں بہتا ہوا نشیب میں دریا سے جا ملتا تھا۔

ندی کافی چوڑی اور گہری تھی۔ گھوڑے اسے پار نہیں کر سکتے تھے۔ جس جگہ آبشار کا پانی گر رہا تھا وہاں بھی ایک بہت چوڑا اور گہرا تالاب سا بن گیا تھا۔ اس کے پیچھے چٹان کے نیچے ایک کھوہ بنی ہوئی تھی۔ پتھروں کی ایک تقریباً چار فٹ چوڑی پٹی سی تھی جو اس کھوہ میں سے ہوتی ہوئی تالاب کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف چلی گئی تھی۔ اس ندی کے دوسری طرف پہنچنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ نولکھا کو جب پتہ چلا کہ اس پل صراط پر سے گزرنا پڑے گا تو اس کی جان نکل

گئی۔ ملک فیروز کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ وہ تالاب کے کنارے کھڑا چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے گھوڑا اس کھوہ میں ڈال دیا۔ صرف دو منٹ بعد وہ آبشار کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ گل رحمان اور شارق وغیرہ بھی دوسری طرف پہنچ چکے تھے۔ اب ثمینہ کی باری تھی۔ اس نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

کھوہ میں تاریکی تھی۔ سامنے پانی کی چادر گر رہی تھی اور پیچھے غار سا تھا جو چٹان کے اندر بہت دور تک چلا گیا تھا۔ اس غار کے دہانے اور تالاب کے درمیان تقریباً چار فٹ چوڑی جگہ تھی جہاں پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اوپر سے گرنے والے پانی کی پھوار اندر آ رہی تھی۔ ثمینہ بہت محتاط ہو کر گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پتھروں پر اگر گھوڑا لڑکھڑا گیا تو وہ سیدھی تالاب میں جا گرے گی۔ تالاب بہت گہرا تھا۔ اس میں گرنے کے بعد صرف وہی شخص باہر آ سکتا تھا جو تیرنا جانتا ہو لیکن اس طرح حادثاتی طور پر گرنے سے انسان بدحواس ضرور ہو جاتا ہے۔

ثمینہ خیریت سے دوسری طرف پہنچ گئی۔ اس نے کلمہ شکر ادا کیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' نولکھا گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ لیکن بہرحال' اسے آگے تو بڑھنا ہی پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ ثمینہ کو اس کے ساتھ رہتے ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ وہ اسے اچھی طرح جان چکی تھی۔ وہ ایک بہادر اور نڈر آدمی تھا۔ کراچی کی مہم کے دوران سمندر میں سفر کرتے ہوئے بدترین حالات میں بھی ثمینہ نے اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔ پھر مسقط میں جو حالات پیش آئے تھے انہیں بھی نولکھا نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ بلکہ وہ تو دوسروں کا حوصلہ بڑھاتا رہا تھا لیکن اب بات ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ نولکھا اس قدر خوفزدہ کیوں تھا۔

نولکھا کا گھوڑا تقریباً نصف راستہ طے کر چکا تھا۔ دفعتاً" گھوڑے کا اگلا پیر کسی پتھر پر پڑا گیا۔ گھوڑا ہنہناتا ہوا آگے کو جھکا اور اس کے ساتھ ہی نولکھا نے گھوڑے سے چھلانگ لگا دی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس نے بدحواس ہو کر خود چھلانگ لگائی تھی یا وہ گھوڑے کے لڑکھڑانے سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔ بہرحال وہ اچھل کر تالاب میں گرا تھا اور اس کے منہ سے ایک خوفزدہ چیخ بھی نکل گئی تھی۔

نولکھا کو گرتے دیکھ کر ثمینہ کے منہ سے بھی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں پناہ وحشت ابھر آئی تھی۔ نولکھا تالاب میں گرنے کے بعد پانی میں بیٹھتا چلا گیا تھا اور پھر وہ نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

گل رحمان اور اس کے ساتھی اس صورت حال سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ گل رحمان تو گھوڑے سے اتر آیا تھا۔ شارق بھی گھوڑے سے چھلانگ لگا کر دوڑتا ہوا تالاب کے کنارے پر پہنچ گیا' تقریباً تیس سیکنڈ بعد نولکھا پانی کی سطح پر ابھر آیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ شارق نے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ اور تیرتا ہوا نولکھا کے قریب پہنچ گیا۔ نولکھا بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے شارق سے لپٹنے کی کوشش کی مگر شارق نے اپنے آپ کو اس کی گرفت میں نہیں آنے دیا اور اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کر کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔ نولکھا چونکہ ہاتھ پیر مار رہا تھا اس لئے اسے کنارے تک لے جانے میں شارق کو خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ گل رحمان اور نجیب اللہ کنارے پر جھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے نولکھا کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ ثمینہ نے بھی شارق کو سہارا دے کر تالاب سے نکال لیا۔

نولکھا کو زمین پر لٹا دیا گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کے پیٹ میں زیادہ پانی نہیں گیا تھا۔ گل رحمان اسے اوندھا لٹا کر ٹریٹ منٹ دے رہا تھا۔ چند منٹ بعد نولکھا کو اٹھا کر بٹھا دیا گیا۔ اب وہ پہلے سے بہتر تھا اور اس کی بدحواسی بھی ختم ہو رہی تھی۔

"نولکھا بھائی۔" ثمینہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر نہانے کا شوق تھا تو پہلے بتا دیتے۔ ہم سب اس طرح خوفزدہ تو نہ ہوتے۔"

"بس بی بی ثمینہ! اچانک ہی نہانے کو دل چاہنے لگا تھا۔" نولکھا نے جواب دیا۔ وہ لوگ کچھ دیر وہاں بیٹھے اور پھر تقریباً بیس گز آگے جا کر درختوں کے نیچے پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ نولکھا نے ایک طرف جا کر کپڑے بدل لئے اور بھیگے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لئے جھاڑیوں پر پھیلا دیئے۔ تالاب کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ کپڑے بدل لینے کے باوجود نولکھا پر کپکپی سی طاری تھی۔ وہ دھوپ میں جا کر بیٹھ گیا۔

نجیب اللہ اور بازت خان ادھر ادھر سے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ لوگ طور خان اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے بھی ساتھ لے آئے تھے۔ ایک گھوڑے پر سامان لدا ہوا تھا جس میں آٹے کا تھیلا بھی تھا۔ بازت خان نے تھیلا اتارا تو ثمینہ آگے آ گئی۔

"تم گوشت وغیرہ تیار کر لو۔ روٹیاں میں پکاؤں گی۔" ثمینہ نے کہا۔

"نہیں بی بی۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ہم پکائے گا۔" بازت خان نے کہا۔

"نہیں۔ روٹیاں تو میں ہی پکاؤں گی۔" ثمینہ بولی اور آٹے والا تھیلا اس سے لے لیا۔

ان کے پاس ایلومینیم کے برتن بھی تھے۔ ثمینہ ایک برتن میں ندی سے پانی لے آئی اور تسلے میں آٹا گوندھنے لگی۔ اس دوران نجیب اللہ پتھروں کا چولہا بنا کر آگ جلا چکا تھا۔ ثمینہ نے توا چولہے پر رکھ دیا اور روٹیاں پکانے لگی۔ بازت خان نے دوسرا چولہا تیار کر کے آگ جلا لی اور

ایلومینیم کی ایک پتیلی میں خشک گوشت کے ٹکڑے تلنے لگا۔

کھانا کھانے کے بعد ثمینہ ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ بڑا حسین منظر تھا۔ ایسے مناظر اس نے فلموں ہی میں دیکھے تھے۔ لیکن اس وقت وہ خود ایک حسین ترین منظر کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد انہوں نے پڑاؤ اٹھا دیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ ان کی رفتار تیز تھی۔ دریا دائیں طرف رہ گیا تھا اور وہ مسلسل بائیں طرف چل رہے تھے۔ وادی بھی بتدریج تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ہریالی اور سبزے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور ان کے سائے بڑھ رہے تھے۔ انہیں ایک بار پھر ایک تنگ سے درے میں سے گزرنا پڑا۔ اس درے کے دوسری طرف ایک اور وادی تھی جو مسلسل نشیب کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ تنگ سے راستے پر اترتے رہے اور بالآخر ایک ندی نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ سب لوگ گھوڑوں سے اتر آئے اور ندی سے پانی پینے لگے۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی ان کے سینوں میں ٹھنڈک سی پیدا کرتا چلا گیا۔

"اور کتنا چلنا ہو گا؟" ثمینہ نے گل رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا پڑاؤ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ رات وہاں گزارنے کے بعد صبح آگے روانہ ہوں گے۔" گل رحمان نے جواب دیا۔

ندی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اسے پار کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس طرح ان کا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ دن کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ شام کا ملگجا سا اندھیرا بتدریج گہرا ہونے لگا۔ وہ چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سے راستے سے گزر کر رک گئے۔ سامنے نشیب میں ایک مکان نظر آ رہا تھا۔ دو آدمی اس مکان سے باہر آ گئے اور پھر وہ تیزی سے اس طرف آنے لگے۔ ملک فیروز نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

دس منٹ بعد وہ لوگ اس مکان میں موجود تھے۔ ثمینہ اور نولکھا جس کمرے میں آئے تھے وہاں فرش پر موٹا نمدہ بچھا ہوا تھا۔ ثمینہ کمرے میں آتے ہی نمدے پر گر گئی۔ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سفر کرنے سے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ نمدے پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

وہ رات بڑے سکون سے گزری اور پھر صبح ہوتے ہی ان کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ سفر پہلے سے زیادہ دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ سرسبز وادیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب ان کے چاروں طرف بنجر خشک پہاڑ تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے لیکن درختوں کے وہ جھنڈ

ان کے راستے سے بہت ہٹ کر تھے۔ تیز دھوپ سے چٹانیں تپ رہی تھیں۔ انہوں نے اگرچہ جیکٹیں اتار لی تھیں لیکن گرمی سے نڈھال ہو رہے تھے۔ جسم پسینے میں شرابور تھے اور راستے میں کوئی سایہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جہاں رک کر کچھ دیر آرام کر لیا جاتا۔

دوپہر دو بجے تک وہ کہیں رکے بغیر چلتے رہے اور بالآخر ایک چٹان کے دامن میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب رک گئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا چشمہ بھی تھا۔ وہ سب گھوڑوں سے اترتے ہی چشمے کی طرف لپکے تھے۔

ثمینہ' جو نولکھا کو اب تک تسلیاں دیتی رہی تھی' اس کی اپنی حالت سب سے ابتر تھی' وہ بری طرح نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے سیر ہو کر پانی پیا اور پھر چشمے کے قریب ہی ایک درخت کے سائے میں لیٹ گئی۔ مسلسل گھوڑے پر بیٹھے رہنے سے اس کی ٹانگوں میں بڑی شدت کا درد ہو رہا تھا اور وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

آرام کے لئے صرف ایک گھنٹہ ملا تھا۔ اس کے بعد ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ شام سے ذرا پہلے وہ دریائے لوگر کے کنارے پر پہنچ گئے اور کئی میل تک کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کے بعد انہوں نے ایک جگہ پر دریا عبور کیا اور سفر جاری رکھا۔

یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ ان کے چاروں طرف باغات تھے لیکن اجڑے ہوئے۔ انہی باغات میں سے ہوتے ہوئے وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ چند گھروں پر مشتمل یہ بستی کھنڈروں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گل رحمان نے بتایا کہ افغانستان پر روسی فوج کے تسلط کے دوران اس بستی میں کئی مرتبہ روسی فوجی آئے تھے۔ ان کے گن شپ ہیلی کاپٹر بھی فضا میں پرواز کرتے رہتے تھے۔ روسی فوجی افغان مجاہدین کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ وہ بستی کے باشندوں کو ڈراتے دھمکاتے بھی تھے لیکن انہوں نے بستی کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہ چھوٹی سی بستی تو خود افغانوں نے تباہ کی تھی۔ ایک دھڑے کے کچھ جنگجو یہاں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے کہ مخالف دھڑے نے حملہ کر دیا۔ انہوں نے اس بستی پر اتنے گولے برسائے تھے کہ ایک بھی مکان سلامت نہیں رہا تھا۔

انہوں نے اس بستی کے کھنڈروں پر پڑاؤ ڈال دیا۔ ثمینہ اور شارق وغیرہ گھوم پھر کر بستی دیکھنے لگے۔ بیس بائیس گھر تھے اور کسی گھر کی کوئی دیوار سلامت نہیں تھی۔ اس بستی سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ندی تھی۔ ثمینہ ندی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ لیکن اسے بڑا سکون مل رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کی ساری تھکن پیروں کے راستے اتر رہی ہو۔

"شارق... وہ دیکھو۔ ادھر کوئی آ رہا ہے۔" ثمینہ نے ندی کے دوسری طرف بہت دور

درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

شارق اسی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اسے ایک گھوڑا سوار دکھائی دیا۔ جو کبھی درختوں میں چھپ جاتا اور کبھی سامنے آ جاتا۔

"چلو گل رحمان کو اطلاع کر دیں۔" شارق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کھنڈروں میں آ گئے۔ گھوڑا سوار کے بارے میں اطلاع ملتے ہی گل رحمان اور اس کے ساتھی رائفلیں اٹھا کر ندی کی طرف دوڑ پڑے۔ شارق بھی اپنی رائفل سنبھالے ان کے پیچھے لپکا تھا۔ ثمینہ اور نولکھا آگ کے الاؤ کے قریب بیٹھے رہے۔ لیکن ان دونوں نے بھی اپنی رائفلیں اپنے قریب رکھ لی تھیں۔

گل رحمان اور اس کے ساتھی درختوں اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ گل رحمان بہت دور تک دیکھ رہا تھا لیکن اس گھڑ سوار کے پیچھے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ چند منٹ بعد وہ گھڑ سوار قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس نے شاید کسی قسم کا خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے چہرے سے ڈھاٹا اتار دیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دری زبان میں چیخ کر بولا۔

"کوئی ہے.... یہاں کوئی ہے؟"

گل رحمان شارق کے قریب تھا۔ اس نے شارق کو وہیں دبکے رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی رائفل سنبھالے پتھر کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟" گل رحمان نے اسے رائفل کی زد پر لیتے ہوئے پوچھا۔

اپنے آپ کو رائفل کی زد پر دیکھ کر اس شخص کے چہرے کے تاثرات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ اس کے کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی لیکن اس نے رائفل کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"میرا نام امان اللہ ہے اور میں سید آباد سے آیا ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "تم کون ہو؟ کیا تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔ لیکن سید آباد تو یہاں سے بہت دور ہے کیا تم اکیلے ہو؟" گل رحمان نے پوچھا۔

"[illegible]

"اگر تمہارے ساتھ ملک فیروز بھی ہے تو میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میرے پاس پلندر خان کا پیغام ہے۔"

ملک فیروز اور پلندر خان کا نام سن کر گل رحمان چونک گیا۔ اس نے گہری نظروں سے امان اللہ کی طرف دیکھا۔ وہ پلندر خان کے بہت سے ساتھیوں کو جانتا تھا۔ لیکن یہ چہرہ اس کے لئے اجنبی تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر ملک فیروز کو آواز دی..... ملک فیروز خاصا پیچھے تھا۔ وہ درختوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ امان اللہ اسے دیکھ کر گھوڑے سے اتر آیا۔ ملک فیروز نے بھی امان اللہ کو پہچان لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے امان اللہ سے مصافحہ کیا اور پھر شارق اور گل رحمان کے دوسرے ساتھی بھی کمین گاہوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔

ملک فیروز نے سب سے امان اللہ کا تعارف کرایا۔ وہ پلندر خان کا آدمی تھا۔ وہ لوگ اسے لے کر کھنڈروں میں آ گئے۔ جہاں ثمینہ اور نولکھا بھی موجود تھے۔ ثمینہ قہوہ بنا رہی تھی۔ اس نے کیتلی چولہے سے اتار لی اور پیالیوں میں قہوہ انڈیلنے لگی۔ نولکھا ایک ایک پیالی اٹھا کر دوسروں کی طرف بڑھاتا جا رہا تھا۔

اس وقت شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ کھنڈروں سے باہر کی طرف تاریکی تھی۔ وہ لوگ ایک مکان کے کھنڈر میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ دیواروں کی وجہ سے وہ تیز ہوا سے بچے ہوئے تھے اور آگ کی روشنی بھی باہر سے نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔

"ہاں۔ اب بتاؤ تم پلندر خان کا کیا پیغام لے کر آئے ہو۔ حالانکہ اسے معلوم ہے کہ ہم کل دوپہر کے بعد کسی وقت وہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر اسے پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کوئی بہت خاص بات ہے؟" ملک فیروز نے قہوہ کی چسکی لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے امان اللہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ خاص بات ہی ہے تو مجھے بھیجا ہے۔" امان اللہ نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اسے یقین تھا کہ تم لوگ اسی راستے سے آؤ گے۔ ویسے دو آدمی اور بھی دوسرے راستے پر بھیجے گئے ہیں۔"

"پیغام کیا ہے؟" ملک فیروز نے پوچھا۔

"پیغام یہ ہے کہ تم لوگ یہاں سے سید آباد جانے کے بجائے براکی کی طرف مڑ جاؤ گے اور خانزادہ کی بستی میں رک کر اگلے پیغام کا انتظار کرو گے۔" امان اللہ نے جواب دیا۔

"راستے میں اس تبدیلی کی کوئی خاص وجہ؟" ملک فیروز نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" امان اللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "حکومت کی مخالف فوج نے سید آباد پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگرچہ براکی کے آس پاس بھی لڑائی ہو رہی ہے لیکن وہ جگہ نسبتاً محفوظ ہے۔ اس لئے تم لوگوں کو اس طرف جانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔"

"اوہ!" ملک فیروز بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مہمانوں کو کئی روز تک براکی میں رکنا پڑے گا۔"

"دو چار روز کی بات ہے۔" امان اللہ نے جواب دیا۔ "سرکاری فوج سید آباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ امید ہے کہ مخالف دھڑا ایک دو روز میں یہ شہر خالی کر دے گا اور اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس پروگرام پر عمل کرنا پڑے گا۔" ملک فیروز بولا۔

ان میں یہ ساری گفتگو دری زبان میں ہو رہی تھی اور اس زبان کا ایک لفظ بھی شارق وغیرہ کے پلے نہیں پڑ رہا تھا اور اب گل رحمان اردو میں انہیں اس گفتگو کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

"سید آباد' کابل غزنی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہ شہر گو کہ بہت بڑا نہیں ہے لیکن کابل کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے اور براکی کابل سے گردیز جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اہمیت اس شہر کی بھی کم نہیں ہے لیکن یہاں حکمران پارٹی کے قدم بہت مضبوط ہیں۔ یہ شہر بھی دریائے لوگر کے کنارے پر آباد ہے' اس لئے وہاں پہنچنے کے لئے ہمیں تھوڑا اوپر جا کر راستہ تبدیل کرنا پڑے گا۔"

"اور پھر سید آباد جانے کے لئے ہمیں دوبارہ اس طرف آنا پڑے گا۔" شارق نے پوچھا۔

"نہیں" گل رحمان نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم دریائے لوگر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سید آباد پہنچ سکتے ہیں۔"

"اس علاقے میں تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"یوں تو اصل لڑائی کابل اور اس کے آس پاس ہو رہی ہے لیکن افغانستان میں کسی بھی علاقے کو خطرے سے پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لوگ بڑے شہروں سے نکل کر چھوٹی بستیوں' جنگلوں اور پہاڑوں کا رخ کر رہے ہیں لیکن وہ کسی بھی جگہ محفوظ نہیں ہیں۔ یہ بستی تمہارے سامنے ہے۔ اس کا جو حشر ہوا ہے وہ تم دیکھ رہے ہو۔ چھوٹے علاقوں میں کبھی کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوتی بلکہ چھاپہ مار جنگ ہوتی ہے جس کا داؤ چل جاتا ہے مخالف فریق کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقصان عام لوگوں کا ہوتا ہے۔ عوام مارے جاتے ہیں اور ان کی املاک تباہ ہو

جاتی ہیں۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے یہ ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اور اب پتہ نہیں اس کی قسمت میں اور کیا لکھا ہے؟"

"گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کسی وقت ہم پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔" ثمینہ بولی۔ "ایسا ممکن ہے۔" گل رحمان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"براکی یہاں سے کتنی دور ہے۔ اگر وہ محفوظ جگہ ہے تو ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔" ثمینہ نے کہا۔

"ہم صبح نماز کے بعد یہاں سے روانہ ہوں گے تو دوپہر بارہ ایک بجے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔" گل رحمان نے جواب دیا۔

"صبح ہونے کا انتظار کیوں کیا جائے۔" ثمینہ بولی۔ "کیوں نہ ابھی کھانا کھانے کے فوراً بعد روانہ ہو جائیں۔"

"ان علاقوں میں رات کو سفر کرنا زیادہ خطرناک ہے۔" گل رحمان نے کہا۔ "رات کو سفر کے دوران کسی پارٹی کی طرف سے ہم پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اگر حملہ نہ بھی ہو تو راستہ اس قدر دشوار گزار ہے کہ ہم کسی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ صبح ہونے کا انتظار کیا جائے۔"

ثمینہ نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ گل رحمان دوبارہ ملک فیروز اور امان اللہ کی باتوں میں شریک ہو گیا اور ثمینہ' شارق اور نوکھا سے سرگوشیاں کرنے لگی۔

ان کے چاروں طرف سناٹا تھا' سب لوگ سو چکے تھے۔ بازت خان کھنڈروں کے باہر کسی جگہ بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ ثمینہ کھنڈر کی ایک شکستہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی پتھروں کے بیچ میں ان کوئلوں کو گھور رہی تھی جو الاؤ ختم ہو جانے کے بعد سلگ رہے تھے۔ اس کے ہر طرف خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ اور اس سناٹے میں کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے دشمن کی فوج مارچ کرتے ہوئے بڑی تیزی سے اس طرف آ رہی ہو۔ بھاری فوجی بوٹوں کی دھمک اسے اپنے سینے پر محسوس ہونے لگتی۔ اور کبھی یوں لگتا جیسے ٹینک دھرتی کا سینہ کوٹتے اور اپنے دہانوں سے آگ اگلتے ہوئے چلے آ رہے ہوں اور کبھی گولوں کی گھن گرج سنائی دینے لگتی۔ وہ بار بار اپنا سر جھٹک کر ان خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن یہ خوفناک خیالات اس کے دماغ سے گویا چپک کر رہ گئے تھے۔ اس نے نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ کوئی بہت بڑا کمرہ تھا جس کی چھت غائب ہو چکی تھی اور دیواریں بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ ایک دروازے کی جلی ہوئی لکڑی دیوار میں پھنسی رہ گئی تھی۔ وہ سب اسی کمرے میں سو رہے تھے۔ سامنے والی دیوار کے

ساتھ گل رحمان' امان اللہ' ملک فیروز اور نجیب اللہ سوئے ہوئے تھے۔ بازت خان کھنڈر کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ آدھی رات کے بعد نجیب اللہ کو اس کی جگہ لینی تھی۔ اس شکستہ چار دیواری کے اندر ثمینہ واحد ہستی تھی جو جاگ رہی تھی۔ اس کے ذہن پر ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔ اس ملک میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ تباہی کی ایک چھوٹی سی مثال اس بستی کے ان کھنڈروں کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔ کبھی یہاں بھی زندگی سے بھرپور قہقہے گونجتے ہوں گے لیکن سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اب یہاں ویرانہ تھا۔ ثمینہ اس بات سے خوفزدہ تھی کہ اگر جنگجو افغانوں کی کوئی ٹولی اس طرف نکل آئی تو یہ لوگ زندہ نہیں بچیں گے۔

اب وہ بھی نولکھا کے ذہن سے سوچ رہی تھی کہ حاجی نے ان کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کی تھی۔ انہیں مال کی ایک کھیپ لانے کے لئے افغانستان بھیجا گیا تھا۔ اسمگلروں کی سرگرمیاں عام طور پر سرحد کے آس پاس کے علاقوں تک محدود رہتی ہیں تاکہ مال لے کر فوری طور پر سرحد کے دوسری طرف پہنچا جائے' لیکن یہ لوگ پانچ دن سے سفر کر رہے تھے اور ابھی تک اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ آخر یہ لوگ مال لے کر واپس کیسے جائیں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حاجی نے واقعی کسی سازش کے تحت انہیں یہاں بھیجا ہو' وہ خود ان کے خون سے ہاتھ نہ رنگنا چاہتا ہو اور اس طرح اس پر کوئی حرف بھی نہیں آئے گا۔ نولکھا نے بھی شاید ٹھیک ہی سوچا تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے بالآخر ثمینہ کی آنکھ لگ گئی اور وہ دیوار کے قریب ہی زمین پر لیٹ کر سو گئی۔

دفعتاً" اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھنڈر کے باہر کسی جگہ پر بندھے ہوئے گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی چیز سے ڈر گئے ہوں اور رسے تڑوا کر بھاگنا چاہتے ہو۔ پتھریلی زمین پر ان کے سم مارنے کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

ثمینہ بدحواس سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ گل رحمان اور شارق بھی جاگ گئے تھے۔ جبکہ دوسرے لوگ اب بھی گہری نیند میں تھے۔

"کیا ہوا..... یہ گھوڑے کیوں بدک گئے ہیں؟" گل رحمان نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ..... پتہ نہیں۔" ثمینہ ہکلائی۔ "میری آنکھ بھی انہی کے شور سے کھلی تھی۔ شاید کسی چیز سے ڈر گئے ہیں۔"

ٹھیک اسی لمحہ بازت خان دوڑتا ہوا کھنڈر میں داخل ہوا۔

"غضب ہو گیا خان۔" وہ گل رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہا

تھا۔

"کیا ہوا؟" گل رحمان ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کچھ لوگوں نے اس کھنڈر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔" بازت خان نے بتایا۔ "پتہ نہیں وہ حکومت کے آدمی ہیں یا کسی مخالف پارٹی کے۔"

"ان کی تعداد کیا ہے؟" گل رحمان نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے تیس پینتیس تو ہو گی۔" بازت خان نے جواب دیا۔ دوسرے آدمی بھی ان کی آواز سن کر بیدار ہو گئے تھے۔ نولکھا بھی جاگ گیا تھا۔ ان سب نے اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔

"خبردار تم میں سے کوئی بھی گولی نہیں چلائے گا۔" گل رحمان چیخا۔ "ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہے اور ان کے پاس ایمونیشن بھی وافر مقدار میں ہو گا۔ اگر ہم نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو وہ لوگ ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔"

"تو کیا ہم اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں۔" شارق بولا۔

"ہاں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" گل رحمان نے کہا۔ "ایسی صورت میں ہمارے لئے بچت کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔ وہ حکومت کے آدمی ہوں یا مخالف پارٹی کے۔ ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ہم تو مسافر ہیں' مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک نہیں کریں گے۔"

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ نولکھا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ثمینہ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بے بس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کی تاریکی چھٹ رہی تھی اور بہت ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔

"ہم نے تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔" باہر سے کوئی آدمی چیخ کر دری زبان میں کہہ رہا تھا۔ "اپنے ہتھیار پھینک کر ایک ایک کر کے باہر آ جاؤ۔ اگر مزاحمت کی کوشش کی تو تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔"

وہ سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر گل رحمان نے اپنی رائفل زمین پر پھینک دی اور دونوں ہاتھ بلند کر کے کھنڈر کی شکستہ چار دیواری سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے جانے والا ملک فیروز تھا۔ شارق نے ثمینہ اور نولکھا کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اپنی اپنی رائفلیں پھینک کر کھنڈر سے باہر نکل آئے۔

ثمینہ' شارق کے پیچھے تھی..... اس نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا رکھے تھے۔ کھنڈر سے باہر آتے ہی اس نے دائیں بائیں درختوں کی آڑ میں کھڑے ہوئے دو افغانوں کو دیکھ لیا تھا۔ ان

دونوں کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ دو آدمی کھنڈر کی دیوار کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی سب مشین گنیں تھیں۔ ثمینہ رک کر پیچھے دیکھنا چاہتی تھی لیکن دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی نے دری زبان میں چیخ کر کچھ کہا اور ثمینہ آگے بڑھ گئی۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

○

وہ لوگ ایک دوسرے سے پشت ملائے ایک چھوٹے سے میدان میں ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کی ٹانگیں آگے کو پھیلی ہوئی تھیں اور ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے چاروں طرف پانچ چھ آدمی کھڑے تھے جنہوں نے ان سب کو مشین گنوں کی زد پر لے رکھا تھا۔

ان کی تعداد بائیس تھی۔ ان کے پاس سب مشین گنوں کے علاوہ لائٹ مشین گنیں اور مارٹر گنز بھی تھیں۔ ایک آدمی کے پاس راکٹ لانچر بھی تھا جسے کندھے پر رکھ کر چلایا جا سکتا تھا۔ راکٹ صرف دو تھے البتہ ایمونیشن ان کے پاس بہت تھا۔ مختلف کیلیبر کے کارتوسوں کے کئی کئی ہار ہر ایک کے گلے میں پڑے ہوئے تھے۔

ان میں سے پانچ تو گل رحمان اور اس کے ساتھیوں پر پہرہ دے رہے تھے اور باقی ان سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تو انہیں دیکھنے کے فوراً ہی بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا تعلق حکمران پارٹی سے نہیں تھا۔ وہ حکومت کی کسی مخالف پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا لیڈر ایک ایسا شخص تھا جس کی داڑھی دو بالشت سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور اس نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر بھی سیاہ عمامہ بندھا ہوا تھا۔

اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا اور دھوپ پھیل رہی تھی۔ شارق نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر گل رحمان کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے کوئی بات کرنا چاہی تھی مگر ایک پہرے دار نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا کہ وہ خاموش بیٹھے رہیں۔

"ہم لوگ خاموش نہیں بیٹھے رہ سکتے۔" گل رحمان نے گردن گھما کر پہریدار کی طرف دیکھا۔ "تم لوگ کون ہو' ہمیں اس طرح پکڑ کر کیوں بٹھا رکھا ہے۔ ہم تو مسافر ہیں۔ ہمارا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

کالے لباس والے نے گل رحمان کی بات سن لی تھی۔ اس نے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے تم لوگ پوزیشن بدل کر آرام سے بیٹھ سکتے ہو۔ لیکن کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش

مت کرنا۔"

گل رحمان اور اس کے ساتھیوں نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ اس نے شارق وغیرہ کو بھی بتا دیا وہ بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اس پوزیشن میں بیٹھے رہے تھے جس سے ان کی ٹانگیں اکڑ کر تختہ ہو گئی تھیں۔ اب وہ رخ بدل کر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کیوں بٹھا رکھا ہے؟" شارق بولا۔ اس سے پہلے کہ گل رحمان کوئی جواب دیتا سیاہ لباس اور لمبی داڑھی والا اپنے گروپ میں سے اٹھ کر ان کے قریب آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی دو آدمی اور بھی تھے۔ ایک تو اس کی طرح داڑھی والا تھا اور دوسرا بالکل نوعمر تھا۔ اس کی تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ اس نے کندھے پر سب مشین گن لٹکا رکھی تھی۔

کالے لباس والا گل رحمان اور ملک فیروز سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی وہ بہت غصے میں آ جاتا اور کبھی اس کے لہجے میں نرمی آ جاتی....

"ہم جانتے ہیں کہ تم لوگوں کا حکمران پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ تین غیر ملکی جاسوسوں کی موجودگی تم لوگوں کو مشتبہ بنا رہی ہے۔" سیاہ لباس والے نے کہا۔

"یہ غیر ملکی جاسوس نہیں ہیں۔" گل رحمان نے کہا۔ "یہ اخبار نویس ہیں اور ان کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یہ لوگ یہاں سے واپس جا کر اخبارات میں لکھیں گے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجاہدین کس طرح ظالم حکمرانوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

"لیکن ان کے پاس تو کیمرے وغیرہ نہیں ہیں۔" سیاہ لباس والے نے باری باری شارق' ثمینہ اور نوکھا کو گھورا۔

"تین روز پہلے ایک گروہ نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ وہ انکے قیمتی کیمرے اور دوسرا سامان لوٹ کر لے گئے۔ اتفاق سے کل شام یہ لوگ ہمیں مل گئے۔ ہم انہیں اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔"

"اگر یہ لوگ ہمیں نہ ملتے تو ویرانوں میں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔ یہ لوگ کابل کی طرف جانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔" گل رحمان نے جواب دیا۔

"لیکن یہ کابل کا راستہ تو نہیں ہے۔" داڑھی والے نے کہا۔

"ہم انہیں براکی تک اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ وہاں سے انہیں کابل کے لئے کوئی بس وغیرہ مل جائے گی۔" گل رحمان نے جواب دیا۔

"تم لوگ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو؟" داڑھی والے نے پوچھا۔

"ہم لوگ پلندر خان کے آدمی ہیں اور براکی جا رہے ہیں۔" اس مرتبہ گل رحمان کے بجائے ملک فیروز خان نے جواب دیا۔

"پلندر خان تو سید آباد میں ہے۔ تم لوگ براکی کیوں جا رہے ہو؟" داڑھی والے نے اسے گھورا۔

"ہم لوگ دراصل کئی روز پہلے ایک کام سے سرخاب کی طرف گئے تھے۔ واپسی پر راستے میں پتہ چل گیا کہ سید آباد میں جنگ ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم کل شام کو یہاں رک گئے تھے۔ اب ہمارا ارادہ براکی جانے کا ہے۔ ایک دو روز وہاں رکنے کے بعد سید آباد کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔" ملک فیروز نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ آرام سے بیٹھے رہو۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں اس کے بعد تم لوگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔" داڑھی والے نے جواب دیا اور وہاں سے ہٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔

دس بج گئے۔ ان لوگوں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ اس کے برعکس انہیں اپنا قیدی بنانے والے قہوہ بنا کر پی چکے تھے اور ان کے سامان میں رکھا خشک گوشت بھی تل کر چٹ کر گئے تھے۔ اور ان سے پوچھا تک نہیں تھا۔

"کیا ان کا تعلق کسی پارٹی سے ہے؟" شارق نے گل رحمان سے پوچھا۔

"ان کا تعلق کسی بھی پارٹی سے نہیں ہے۔" ملک فیروز نے جواب دیا۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو اس قسم کے ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومت کمزور ہوتی ہے تو ہر شخص اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں تو سرگرم ہوتی ہی ہیں۔ اس قسم کے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ افغانوں میں اس وقت کوئی قانون نہیں ہے۔ جس کا جو دل چاہتا ہے کر رہا ہے۔ یہاں لاتعداد گروہ بن چکے ہیں جو اپنے آپ کو اس ملک کے محافظ اور مجاہدین کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ لٹیرے ہیں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔ بستیوں کے نہتے لوگ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ ان سے ڈرتے ہیں لیکن جب کوئی بڑا گروہ مقابلے پر آتا ہے تو یہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔"

"لیکن ان کے پاس تو جدید ترین ہتھیار ہیں۔" شارق نے کہا۔ "راکٹ لانچر' لائٹ مشین گنیں' مارٹر گنیں' سب مشین گنیں' ہینڈ گرنیڈ اور میزائل۔ یہ اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آ گیا۔"

"افغانستان جیسے ملک میں اسلحہ کا حصول کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب روسی فوجیں یہاں سے

واپس گئی تھیں تو وہ اپنے پیچھے جگہ جگہ اسلحہ اور بارود کا انبار چھوڑ گئی تھیں۔ لوگوں نے یہ اسلحہ اپنے گھروں میں چھپا لیا۔ بہت سا اسلحہ پاکستان کی طرف اسمگل ہو رہا ہے اور بہت سا یہاں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔ حکومت کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہاں عام لوگوں کے پاس کتنی کثیر مقدار میں گولہ بارود موجود ہے اور یہ لوگ" اس نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں بھی کہیں سے یہ گولہ بارود مل گیا ہے اور یہ لوگ اپنے آپ کو مجاہدین سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صرف یہی لوگ افغانستان کو غاصبوں سے نجات دلا سکتے ہیں جبکہ درحقیقت یہ لٹیرے ہیں۔"

"ہمارے ساتھ یہ لوگ کیا سلوک کریں گے؟" شارق نے پوچھا۔

"ہم نے انہیں بتایا ہے کہ تم تینوں پاکستانی اخبار نویس ہو۔ تین دن پہلے کسی گروہ نے تم لوگوں کو لوٹ لیا تھا اور کیمرے وغیرہ چھین کر لے گئے تھے۔ تم لوگ حالات کا جائزہ لینے کے لئے کابل جانا چاہتے ہو۔ کل تم لوگ ہمیں مل گئے تھے اور ہم نے تمہیں براکی تک لے جانے کی پیشکش کی تھی۔ جہاں سے تم لوگ کابل چلے جاؤ گے۔" اس مرتبہ گل رحمان نے جواب دیا۔

"لیکن اگر انہوں نے ہمیں نہ چھوڑا تو؟" شارق بولا۔

"خود تو یہ لوگ لوٹ مار پر گزارہ کر رہے ہیں۔ ان کے پاس اپنے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ تم لوگوں کو قیدی بنا کر کہاں سے کھلائیں گے؟" ملک فیروز نے کہا۔ "یہ لوگ آپس میں مشورہ کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم سب کو چھوڑ دیں گے۔"

"ہو سکتا ہے تم لوگوں کے بارے میں ان کی رائے مختلف ہو۔ لیکن اگر انہوں نے ہم تینوں کو نہ چھوڑا تو....؟" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انہیں شاید ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم میں ایک عورت بھی موجود ہے۔" گل رحمان نے کہا۔ "اگر پتہ چل گیا ہوتا تو وہ ثمینہ کو ہم سے الگ کر چکے ہوتے۔ میں ثمینہ بی بی کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے کو ان کی نگاہوں سے بچانے کی کوشش کرے۔"

گل رحمان نے جن نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھا تھا وہ جھینپ سی گئی۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو نمایاں نہ ہونے دے۔

گیارہ بج گئے۔ ان نام نہاد مجاہدین کی طویل میٹنگ ختم ہو گئی۔ لمبی داڑھی والے نے اعلان کیا کہ مجاہدین نے ان کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ وہ لوگ چاہیں تو اپنی منزل کی طرف جا سکتے ہیں۔

ان سب کے منہ سے بے اختیار گہرے سانس نکل گئے۔ ان کی رائفلیں واپس کر دی گئیں

البتہ فالتو گھوڑے واپس نہیں کیے گئے۔ راشن ختم ہو چکا تھا۔ یہ مجاہدین سب کچھ چٹ کر گئے تھے۔ ان لوگوں سے نجات ملتے ہی وہ لوگ گھوڑوں پر بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ثمینہ نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ وہ عورت ہے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

وہ لوگ رکے بغیر سفر کرتے رہے۔ گھوڑوں کی رفتار بھی تیز تھی۔ وہ لوگ ان نام نہاد مجاہدین سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتے تھے۔

تین بج رہے تھے۔ گرمی اور بھوک پیاس سے ان سب کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ گھوڑوں کے جسم بھی پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ وہ دریا سے ہٹ کر دسری طرف نکل گئے تھے۔ چٹانوں کے درمیان تنگ سے راستے تھے جن سے وہ گزر رہے تھے۔

ایک جگہ انہیں گھوڑوں سے اتر جانا پڑا۔ ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرا کھڈ.... عمودی چٹان کے ساتھ تقریباً پانچ فٹ چوڑی کارنس سی بنی ہوئی تھی۔ انہیں اسی راستے سے گزر کر جانا تھا۔ یہ کارنس تقریباً اسی فٹ لمبی تھی۔ اس کے بعد کشادہ راستہ تھا۔ لیکن اسی فٹ کا یہ فاصلہ پل صراط سے کم نہیں تھا۔

پہلے امان اللہ اور ملک فیروز آگے بڑھے۔ وہ اپنے گھوڑوں کی لگامیں پکڑ کر پیدل اس تنگ سی پٹی پر چل رہے تھے۔ ان کے بعد شارق اپنے گھوڑے کو لے کر آگے بڑھ گیا اور اس سے تقریباً دس فٹ کا فاصلہ دے کر ثمینہ گھوڑے کی لگام تھامے اس کارنس پر چلنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے چٹان کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک بار نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ چٹان کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

اس سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر گل رحمان آ رہا تھا۔ ثمینہ نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر آگے چلنے لگی۔ اس نے بیس فٹ کا فاصلہ اور طے کر لیا۔ چٹان پر چند فٹ اوپر جھاڑیوں میں کسی پرندے نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ پرندہ اچانک ہی پھڑپھڑاتا ہوا گھونسلے سے اڑا تو ثمینہ کا گھوڑا بدک گیا۔ ثمینہ بھی بدحواس سی ہو گئی۔ گھوڑا ہنہناتا ہوا پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ لگام ثمینہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن گھوڑا بری طرح بدک گیا تھا۔ وہ چلتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ اس کا پچھلا ایک پیر کنارے کے ایک پتھر پر پڑا۔ پتھر نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ گھوڑا کھڈ کے کنارے پر نیچے کی طرف پھسلنے لگا۔ اس کی لگام اب بھی ثمینہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور لگام کے ساتھ وہ بھی کھڈ کی طرف کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔

"لگام چھوڑ دو..... ثمینہ لگام چھوڑ دو۔"

یہ گل رحمان کے چیخنے کی آواز تھی جو ثمینہ کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ غیر ارادی طور پر ثمینہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور لگام اس کے ہاتھ سے پھسلتی چلی گئی۔ گھوڑا ہنہناتا ہوا کھڈ میں غائب ہو گیا۔ ثمینہ کھڈ کے کنارے سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ بلند پہاڑ اس کے چاروں طرف بڑی تیزی سے گھوم رہے ہوں۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور پھر وہ نیچے جھکتی چلی گئی۔

گل رحمان سب سے قریب تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھامے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے ثمینہ کو پکڑ کر کنارے سے پیچھے کھینچ لیا۔ ثمینہ کا چہرہ خوف کی شدت سے بالکل سفید پڑ گیا تھا اور اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں' سب ٹھیک ہے' اپنے آپ پر قابو پاؤ ثمینہ بی بی۔" گل رحمان نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

ثمینہ کو اپنی کیفیت پر قابو پانے میں تقریباً دو منٹ لگ گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ گل رحمان نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اور اسے چٹان کی طرف رکھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ شارق ان سے چند گز آگے تھا۔ یہ حادثہ پیش آنے پر وہ بھی رک گیا تھا۔ اب وہ بھی آگے چل پڑا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ سب لوگ ایک کشادہ جگہ پر جمع تھے۔ ثمینہ کے چہرے پر اب بھی خوف تھا۔ تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ نشیب میں اترنے لگے۔ ثمینہ شارق کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک چشمے پر پہنچ گئے۔ یہاں چند سایہ دار درخت بھی تھے۔ گھوڑوں سے اترتے ہی انہوں نے پانی پیا اور درختوں کے سائے میں گر گئے۔

ایک گھنٹے سے پہلے کسی کے حواس بحال نہیں ہو سکے تھے۔ چند گھنٹوں کے اس سفر نے ان سب کو بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ اور پھر ملک فیروز کا یہ انکشاف بھی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ وہ لوگ اصل راستہ سے بھٹک گئے تھے۔ وہ راستہ بھٹک کر ہی ان دشوار گزار پہاڑوں کی طرف نکل گئے تھے جہاں ایک حادثے میں انہیں ایک گھوڑے سے بھی محروم ہونا پڑا تھا۔ لیکن بہرحال' اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ دریائے لوگر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا' وہ لوگ دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تین گھنٹوں میں برکی پہنچ جائیں گے۔

اور جب وہ دریا کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت بھی وہ زیادہ بہتر حالت میں نہیں تھے۔ بھوک سے ان سب کے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ انہوں نے کل شام کو کھانا کھایا تھا' صبح یہ لوگ ان نام نہاد مجاہدین کے قیدی بن گئے تھے جو کہ ان کا سارا راشن چٹ کر گئے تھے اور یہ لوگ بھوکے رہ گئے تھے۔ اس پڑاؤ پر بار بار چشمے کا پانی پینے سے متلی سی ہو رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی انہوں نے پانی پیا۔ خالی پیٹ پانی پینے سے نولکھا کو قے ہو گئی تھی۔ وہ سب سے زیادہ نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں رکنا پڑا۔

ثمینہ اور شارق ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑا بھی بہت بری طرح تھک گیا تھا۔ اس کے چلنے کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی تھی۔

دو گھنٹے مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر دریا سے دور ہٹتے چلے گئے۔ اس وقت اگرچہ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اب ان کے بھٹکنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ایک باقاعدہ راستے پر چل رہے تھے اور یہ پتھریلا راستہ ظاہر ہے کسی نہ کسی بستی کی طرف ہی جاتا ہو گا۔ یہ راستہ مسلسل بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ اور بالآخر وہ ایک جگہ رک گئے۔ سامنے نشیب میں بہت دور چند مدہم سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ کرم باد ہے۔" امان اللہ انہیں بتا رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ گاؤں تقریباً دو سو گھروں پر مشتمل تھا۔ اس سے تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت پر براکی نامی قصبہ ہے جہاں انہیں جانا ہے۔ ایک پکی سڑک کرم آباد سے براکی تک چلی گئی ہے۔ انہیں آگے سفر کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

وہ نشیب میں پتھریلے راستے پر اترتے رہے اور بالآخر تقریباً آدھے گھنٹے بعد کرم آباد نامی بستی میں پہنچ گئے۔ شارق وغیرہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس بستی میں آبادی بہت کم تھی۔ بیشتر مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گلیوں میں بھی اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔

امان اللہ کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ وہ لوگ مختلف گلیوں میں چلتے ہوئے ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے رک گئے۔ دکان بھی اجڑی پڑی تھی۔ دکاندار کے علاوہ دو آدمی اور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مشتبہ نظروں سے ان گھڑ سواروں کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا تم ملا نصیرالدین کے گھر تک ہماری راہنمائی کر سکتے ہو؟" امان اللہ نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ آدمی اٹھ کر گلی میں ایک طرف چل پڑا۔

دو گلیاں گھومنے کے بعد وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا' مکان کا دروازہ حویلی کے پھاٹک کی طرح تھا۔ امان اللہ نے اس شخص کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کر دیا اور گھوڑے سے اتر کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ سناٹے میں لوہے کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز دور تک گونج گئی تھی۔ شارق وغیرہ بھی گھوڑوں سے اتر آئے تھے۔ ثمینہ مکان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی کمر تختے کی طرح اکڑ گئی تھی اور اس کے لئے ٹیک لگائے بغیر بیٹھنا یا کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ ملا نصیرالدین ہی تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہی ہو گی۔ سفید داڑھی اور سر پر سفید پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے لالٹین کی مدہم سی روشنی میں امان اللہ کو پہچان لیا۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔

"مجھے تم لوگوں کے بارے میں آج صبح بلندر خان کا پیغام مل گیا تھا۔ آؤ اندر آ جاؤ تم لوگ۔" ملا نصیرالدین نے کہا اور پھر اندر کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی۔

دو لمبے تڑنگے آدمی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ وہ دونوں ملا نصیرالدین کے بیٹے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کے گھوڑے لے لئے....گیٹ کے اندر بہت وسیع و عریض صحن تھا۔ ایک طرف اصطبل بھی تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں کو لے کر اصطبل کی طرف چلے گئے اور ملا نصیرالدین مہمانوں کے ساتھ مہمان خانے میں آ گیا۔

مہمان خانہ بڑا وسیع و عریض تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں دو ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں۔ اس بستی کی بجلی براکی کے بجلی گھر سے سپلائی کی جاتی تھی۔ لیکن بجلی کی یہ سپلائی رات دس بجے منقطع ہو جاتی تھی۔ رات دس بجے سے صبح پانچ بجے تک لوگ اپنے گھروں میں لالٹینیں یا پیٹرومیکس استعمال کرتے تھے۔

ملا نصیرالدین باری باری ان سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ کو دیکھ کر وہ چونک سا گیا تھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

"مجھے یقین تھا کہ تم لوگ شام تک یہاں پہنچ جاؤ گے۔ میں نے کھانا تیار کروا رکھا ہے۔ تم ہاتھ دھو لو تو کھانا لگوا دیتا ہوں۔" ملا نصیرالدین نے کہا۔ اسی وقت اس کے دونوں بیٹے بھی اندر داخل ہوئے۔ ملا نصیرالدین نے دری زبان میں ان سے کچھ کہا۔ ایک تو اندرونی دروازے میں چلا گیا اور دوسرا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں تولیہ تھا۔

"میں نے برآمدے میں پانی رکھ دیا ہے۔ آپ لوگ منہ ہاتھ دھو لیں۔" اس نے باری باری

ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ برآمدے میں آ گئے۔ ایک بڑی بالٹی پانی سے بھری رکھی تھی۔ اس میں مگا بھی تھا۔ وہ لمبا تڑنگا نوجوان مگے سے پانی ڈالنے لگا اور وہ لوگ باری باری منہ ہاتھ دھونے لگے۔

اس دوران، ملا نصیرالدین کے دوسرے بیٹے نے قالین پر دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا تھا۔ وہ لوگ آداب محفل کو نظرانداز کرتے ہوئے بے تکلفی سے کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ قہوہ پیتے ہوئے ملا نصیرالدین انہیں بتا رہا تھا کہ تین دن پہلے اس بستی پر حکومت کی مخالف پارٹی کے ایک دستے نے حملہ کر دیا تھا جس میں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ بہت سے مکانوں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اور اگلے ہی روز اس بستی کی آدھی سے زیادہ آبادی براکی منتقل ہو گئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ حملہ پھر بھی کسی وقت ہو سکتا ہے۔" یہ بات شارق نے پوچھی تھی۔

"کوئی بھروسہ نہیں ہے۔" ملا نصیرالدین نے کہا۔ "یہاں تو بہت ہی عجیب و غریب قسم کی صورت حال ہے۔ ہر شخص مجاہد بنا ہوا ہے۔ اسلحہ کی کمی نہیں ہے۔ جس کا دل چاہتا ہے گولے داغنا شروع کر دیتا ہے۔ جب اس ملک پر روسی فوجوں کا تسلط تھا تو اس وقت بھی یہ علاقہ زیر عتاب تھا۔ اکثر گن شپ ہیلی کاپٹر مجاہدین کے تعاقب میں اس طرف آ جاتے تھے۔ ہم نے بستی کے باہر ایک گن شپ ہیلی کاپٹر گرایا بھی تھا۔ اس کا ڈھانچہ اب بھی پڑا ہوا ہے۔ ان روسی ہیلی کاپٹروں نے ہمیں کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا یہ مجاہدین پہنچا چکے ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی اور خانہ جنگی بند نہ ہوئی تو اس ملک میں کچھ نہیں بچے گا۔"

"بچا تو اب بھی کچھ نہیں ہے۔" ملک فیروز نے کہا۔ "رہ ہی کیا گیا ہے یہاں۔ افغانستان کی آدھی سے زیادہ آبادی تو یہاں سے بھاگ کر پڑوسی ملکوں میں پناہ لے چکی ہے۔ بہرحال، ہمیں آج کی رات محتاط رہنا پڑے گا۔ ہم صبح سویرے ہی یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔"

"ہاں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تم لوگ صبح سویرے ہی یہاں سے نکل جاؤ تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو تم لوگ محفوظ رہو۔" ملا نصیرالدین نے جواب دیا۔

ان کی گفتگو زیادہ دیر جاری نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ بہت تھکے ہوئے تھے۔ جلد ہی سو گئے۔ ثمینہ ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر سو گئی تھی۔ اس کے ایک طرف نولکھا تھا اور دوسری طرف شارق۔

آدھی رات کے بعد اچانک ہی ثمینہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کسی دھماکے کی خوفناک آواز تھی۔ جیسے قریب ہی کوئی بم پھٹا ہو۔ پہلے تو وہ اسے واہمہ یا خواب سمجھی لیکن اسی لمحہ دوسرے لوگ بھی

گڑبڑا کر اٹھ گئے۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور وہ سب سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس لمحہ ایک اور دھماکہ ہوا، اس مکان کے قریب ہی کوئی گولہ پھٹا تھا۔

"یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟" نولکھا چیخا۔

"شاید مجاہدین کی کسی پارٹی نے حملہ کر دیا ہے۔" امان اللہ نے جواب دیا۔

دھماکوں کے ساتھ اب مشین گنوں یا لائٹ مشین گنوں کی مسلسل فائرنگ کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ حملہ بستی کے باہر سے ہوا تھا اور بستی سے بھی جوابی کارروائی کی جا رہی تھی۔

ایک منٹ بعد ملا نصیرالدین بدحواس سا کمرے میں داخل ہوا۔

"جلدی سے باہر نکلو۔" وہ چیخا۔ "وہ لوگ بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہمیں ان سے پہلے ہی اس بستی سی نکل جانا ہو گا۔"

وہ لوگ بدحواسی کے عالم میں باہر کی طرف دوڑے۔ دوسرے دروازے سے ملا نصیرالدین کے گھر والے بھی باہر نکل چکے تھے۔ ان میں ایک اس کی بیوی تھی، ایک دس گیارہ سال کا لڑکا اور ایک جوان لڑکی، جس کی عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کے بیٹے پہلے ہی اصطبل کی طرف دوڑ پڑے تھے۔

"امان اللہ!" ملا نصیرالدین نے چیخ کر کہا۔ "تم اپنے آدمیوں کو لے کر براکی کی طرف نکل جاؤ۔ میں بھی اپنے گھر والوں کو لے کر تم لوگوں کے پیچھے آ رہا ہوں۔"

ان لوگوں نے گھوڑے کھول لئے تھے۔ ملا نصیرالدین کے اصطبل میں اتفاق سے ایک گھوڑا اور تھا جو ثمینہ کو مل گیا۔ چھوٹے لڑکے کو ملا نصیرالدین کے بڑے بیٹے نے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اس کی بیوی اور بیٹی الگ الگ گھوڑوں پر سوار ہوئی تھیں۔

پوری بستی میں دھماکے ہو رہے تھے اور لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ لوگ گھروں سے نکل کر بدحواسی کے عالم میں مختلف سمتوں میں دوڑ رہے تھے۔ بستی کے شمال کی طرف سے بلند پہاڑی سے مارٹر گنوں سے گولے برسائے جا رہے تھے اور مشین گنوں سے مسلسل فائرنگ کی جا رہی تھی، ثمینہ نے دو آدمیوں کو زخمی ہو کر یا مر کر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مارٹر گن کا ایک گولہ ملا نصیرالدین کے مکان سے تیسرے مکان پر گرا تھا۔ چیخم دھاڑ اور دھماکوں کی آوازوں سے گھوڑے بدکنے لگے۔

"نکل چلو یہاں سے۔" ملا نصیرالدین نے چیخ کر کہا۔

بستی کی گلیوں میں گھوڑے دوڑنے لگے۔ وہ ایک گلی کا موڑ مڑ رہے تھے کہ مشین گن کی

ایک گولی بازت خان کو لگی اور وہ چیختا ہوا گھوڑے سے الٹ گیا۔ امان اللہ نے دیوار کی آڑ میں گھوڑا روک لیا جبکہ دوسرے اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے بستی سے نکل گئے۔

ثمینہ بہت بری طرح دہشت زدہ تھی۔ وہ اپنا گھوڑا دوسروں کے پیچھے دوڑاتی رہی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک رکے بغیر گھوڑے دوڑتے رہے۔ آگے ایک چھوٹی سی چٹان تھی۔ آگے والے گھوڑے چٹان کے بائیں طرف سے نکل گئے' ثمینہ نے اپنا گھوڑا چٹان کے دائیں طرف موڑ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس چٹان سے آگے نکل کر وہ اپنے ساتھیوں سے مل جائے گی۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا اور جب اسے اپنے غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے گھوڑا روک لیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان تنہا کھڑی تھی اور اس کے سامنے وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی۔ سنسنی کی ایک لہر ثمینہ کے پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی اور وہ گھوڑے پر بیٹھی وحشت زدہ سی نظروں سے چاروں طرف تاریکی میں گھورنے لگی۔

○

اس کے چاروں طرف ویرانہ تھا اور تاریکی تھی۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے چاروں طرف دیکھتی رہی پھر ایک ایک کا نام لے کر پکارنے لگی۔ اس کی آواز چٹانوں میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔ لیکن جواب میں کوئی اور آواز سنائی نہیں دی۔

دفعتاً" اسے خیال آیا کہ اسے واپس جانا چاہئے۔ وہ اس چٹان کے پاس سے راستہ بھٹکی تھی۔ اگر وہ دوبارہ اس چٹان کے پاس پہنچ جائے تو اسے راستہ مل سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے شارق وغیرہ بھی اس کی تلاش میں ہوں اور راستے میں ہی ملاقات ہو جائے۔ یہی سوچ کر اس نے گھوڑے کا رخ موڑ کر لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

گھوڑا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ لیکن وہ اس راستے پر نہیں جا سکا جس سے آیا تھا۔ وہ راستے سے مزید ہٹتا چلا گیا۔ اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ثمینہ نے گھوڑا روک لیا اور تاریکی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے شارق اور گل رحمان وغیرہ کو آوازیں دینے لگی لیکن اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

ثمینہ گھوڑے سے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ خوف سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ دل کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں سے نہ مل سکی یا اسے واپسی کا راستہ نہ مل سکا تو وہ ان پہاڑوں میں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔

تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد وہ ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے گھوڑے کو اس

کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ گھوڑا گردن جھکائے آہستہ آہستہ ایک طرف چلتا رہا اور ثمینہ وحشت زدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی رہی اور بالآخر گھوڑا ایک جگہ رک گیا۔

ایک طرف سے ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ثمینہ ادھر دیکھنے لگی۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے پتھروں میں ہلکی رفتار سے پانی بہہ رہا ہو۔ وہ گھوڑے سے اتر کر آواز کی سمت میں بڑھنے لگی۔ اس نے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی اور گھوڑا بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

بالآخر وہ ایک جگہ رک گئی۔ وہ تقریباً تین فٹ چوڑی ندی تھی جس میں ہلکی رفتار سے پانی بہہ رہا تھا۔ گھوڑا بھی شاید پیاسا تھا۔ اس نے ثمینہ سے پہلے ہی پانی میں منہ ڈال دیا۔ ثمینہ بھی چلو سے پانی پینے لگی۔ ثمینہ نے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی تھی گھوڑا پانی پینے کی بعد ندی کے کنارے جھاڑیوں میں منہ مارنے لگا اور ثمینہ ندی کے کنارے پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔

رات کی تاریکی چھٹ رہی تھی۔ بہت ہی مدھم اجالے میں چٹانوں کے ہیولے اب واضح ہونے لگے تھے..... ثمینہ کو امید تھی کہ دن کی روشنی میں اسے واپسی کا کوئی نہ کوئی راستہ مل جائے گا۔ لیکن وہ یہ سوچ کر بھی کانپ اٹھی تھی کہ سورج نکلنے کے بعد یہ چٹانیں تپ جائیں گی۔ اسے گزشتہ کئی روز کے سفر کے دوران تجربہ ہو چکا تھا۔ تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانیں جہنم کا منظر پیش کرنے لگتی تھیں۔ اور اگر وہ اس جہنم میں بھٹکتی رہی تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔

اسے وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دفعتاً" وہ چونک گئی۔ گھوڑا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید جھاڑیوں میں چرتے ہوئے کسی طرف نکل گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لیکن وہ گھوڑا کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔

وہ ایک دم بدحواس ہو گئی۔ گھوڑے کے بغیر تو وہ ان چٹانوں میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی تھی۔ وہ گھوڑے کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں جن پر خود رو جھاڑیاں بکثرت لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان چٹانوں میں دوڑتی رہی لیکن گھوڑا اسے کہیں بھی نہیں ملا۔ وہ یا تو چرتا ہوا چٹانوں میں بہت دور نکل گیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے وہ کسی قریبی چٹان کے پیچھے موجود ہو اور وہ اسے تلاش نہ کر پا رہی ہو۔ چھوٹی چھوٹی یہ لاتعداد چٹانیں بھول بھلیوں کی طرح تھیں ان میں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ وہ خود گھوڑے کی تلاش میں چلتی ہوئی ندی سے بہت دور نکل آئی تھی۔

اس وقت بھی وہ ایک چٹان پر کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ خوف سے اس کا دل کانپ رہا

تھا۔ اسے اپنا انجام سامنے نظر آنے لگا۔ کئی سال پہلے دیکھی ہوئی ایک انگلش فلم کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ایک آدمی صحرا میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح گھوڑے پر سوار تھا لیکن اس کا گھوڑا بھی موقع پا کر بھاگ گیا تھا۔ اور اس آدمی نے تپتے ہوئے صحرا میں ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑ دیا تھا اور اس کی لاش کو گدھ نوچنے لگے تھے۔

ثمینہ بے اختیار اوپر دیکھنے لگی۔ لیکن اسے کوئی گدھ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ اور یہ خوف آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکنے لگا۔ وہ چٹان سے اتر کر ایک طرف چلنے لگی۔ وہ رو رہی تھی اور اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے شارق کے ساتھ اس مہم پر آنے کا فیصلہ کیا تھا..... وہ چٹانوں میں ایک بار پھر ایک ندی پر پہنچ گئی۔ یہ غالباً وہی ندی تھی جو چٹانوں میں گھومتی ہوئی چل رہی تھی۔ یہاں ندی کا پاٹ تقریباً چھ فٹ چوڑا تھا' لیکن پانی پنڈلی سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔ دھوپ میں چمکتے ہوئے شفاف پانی کے نیچے پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ ندی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے پانی پیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

ثمینہ کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان پہاڑوں ہی میں کہیں ختم ہو جائے گی اور اس کی لاش یا تو جانوروں کی خوراک بن جائے گی یا گل سڑ جائے گی اور اس کا ڈھانچہ شاید صدیوں تک کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں پڑا رہے۔

اس کا ذہن ماضی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اپنوں کے چہرے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ باپ کا چہرہ' ماں اور بھائی کا چہرہ..... اس نے اپنے ماں باپ کو بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ انہیں ذلیل و رسوا کیا تھا۔ انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور یہ سب کچھ شارق کی وجہ سے ہوا تھا۔ لاہور سے فیصل آباد جاتے ہوئے نہ بس میں شارق سے ملاقات ہوتی اور نہ اس کی زندگی یوں برباد ہوتی۔ شارق نے اسے تباہ کر دیا تھا۔ کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ثمینہ کا خیال تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور شادی کر لے گا لیکن شادی کے نام پر وہ ہمیشہ ٹال جاتا' وہ داشتہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اگر بات داشتہ تک ہی رہتی تو معاملہ کچھ اور ہوتا لیکن وہ تو اس کے ساتھ جرائم کی دلدل میں دھنس گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کئی قتل بھی ہو چکے تھے۔ اور پھر حاجی نے انہیں افغانستان بھیج دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ افغانستان سے ہیروئن کی ایک بڑے کھیپ لانی ہے۔ وہ کئی روز سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ گزشتہ رات تو ان کی قسمت ہی اچھی تھی کہ بستی پر اس حملے سے بچ نکلے تھے۔ دوسروں کے بارے میں ثمینہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اپنے بارے میں اسے یقین تھا کہ اب قسمت اس کا ساتھ نہیں دے گی۔ اگر وہ زندہ بچ

کر ان پہاڑوں سے نکل گئی تو یہ ایک معجزہ ہی ہو گا۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ معجزوں کا دور نہیں تھا۔ اس کے اعمال ہی ایسے تھے۔ اسے قدرت سے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔

دفعتاً" گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لیکن اسے نہ تو گھوڑا دکھائی دیا اور نہ ہی دوبارہ اس کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے اپنا واہمہ سمجھنے لگی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر قریبی چٹانوں پر چڑھ گئی کہ شاید آس پاس کی کسی چٹان کی آڑ میں گھوڑا موجود ہو۔ لیکن اسے گھوڑا کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ دوبارہ ندی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

تقریباً دو منٹ بعد وہ ایک بار پھر اچھل پڑی' اس مرتبہ گھوڑے کی آواز صاف اور نسبتاً" قریب سے سنائی دی تھی۔ وہ ندی کے ساتھ ساتھ آواز کی سمت میں دوڑنے لگی۔ ندی چٹانوں میں بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ ثمینہ کو یقین تھا کہ گھوڑا ندی کے قریب ہی کہیں موجود تھا۔

ایک چٹان کی آڑھ سے نکل کر وہ جیسے ہی سامنے آئی ٹھٹک کر رک گئی۔ سفید رنگ کا ایک گھوڑا ندی کے قریب جھاڑیوں میں چر رہا تھا۔ اور اس کا سوار ندی کے کنارے پر آڑھا ترچھا بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پہلے تو ثمینہ نے سوچا کہ وہ بھی اس کی طرح تھکا ہوا ہے اور آرام کر رہا ہے' لیکن وہ دھوپ میں پڑا تھا۔ کوئی بھی ذی ہوش شخص تیز دھوپ میں تپتے ہوئے پتھروں پر اس طرح نہیں لیٹ سکتا۔

ثمینہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔ پہلے اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس ایک گھوڑے اور اس کے سوار کے علاوہ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ مڑ کر زمین پر پڑے ہوئے بے حس و حرکت شخص کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ وہ کوئی آدمی نہیں عورت تھی۔ اس کا اندازہ ثمینہ نے اس کے لباس سے لگایا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا جو ابھی تک ثمینہ کو نظر نہیں آیا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

ثمینہ کا خیال درست نکلا' وہ عورت ہی تھی۔ بلکہ اسے لڑکی ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔

ثمینہ اسے گھسیٹ کر ایک چٹان کے سائے میں لے آئی اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ اپنے اوپر ایک عورت کو جھکے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ک۔۔۔۔کون ہو تم؟" لڑکی نے دری زبان میں پوچھا۔

ثمینہ اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ لیکن اس نے ہاتھ سے انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور آرام سے چلتی ہوئی گھوڑے کے قریب پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر گھوڑا ہنہنانے لگا۔ ثمینہ نے اس کی لگام پکڑ لی اور اسے ایک پتھر سے باندھ دیا۔ لڑکی سے کوئی بات کرنے سے پہلے اس نے ضروری سمجھا تھا کہ گھوڑے کو قابو کر لیا جائے۔ اگر یہ گھوڑا بھی ٹہلتا ہوا کہیں نکل گیا تو ان کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ وہ دوبارہ اس لڑکی کے قریب آ گئی۔

"اردو سمجھتی ہو؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تھوڑا تھوڑا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"اچھا تو پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو' اور ان پہاڑوں میں کیسے بھٹک رہی ہو۔" ثمینہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔

"میں کرم آباد کے ملا نصیرالدین کی بیٹی ہوں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "میرا نام شاہ پری ہے۔ رات کو میرے بابا کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ آدھی رات کے بعد بستی پر حملہ ہو گیا اور ہم سب لوگ جان بچانے کے لئے بستی سے بھاگ نکلے۔ میں سب سے پیچھے تھی۔ اور پھر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر راستہ بھٹک گئی۔ اب تک ان چٹانوں میں بھٹک رہی ہوں۔ پانی پینے کے لئے ندی پر رکی تھی۔ شاید مجھے چکر آ گیا تھا اور میں بیٹھے بیٹھے گر گئی تھی۔ تم کون ہو..... کافر؟"

"نہیں..... میں کافر نہیں ہوں۔" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ افغانستان میں روسی فوجیوں کو کافر کہا جاتا تھا۔ اور اس کے جسم پر روسی فوجی وردی تھی۔ "میں بھی تمہاری طرح مسلمان ہوں اور ان مہمانوں میں سے ایک ہوں جو گذشتہ رات تمہارے گھر پر آ کر ٹھہرے تھے۔ میں بھی تمہاری طرح اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر راستہ بھٹک گئی ہوں' اور میری بدقسمتی تو یہ ہے کہ میرا گھوڑا بھی کہیں بھاگ گیا ہے۔"

"اوہ! تو وہ تمہارا گھوڑا تھا؟"

"گھوڑے کو تم نے دیکھا ہے۔ کہاں ہے وہ؟" ثمینہ نے جلدی سے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل دور جھاڑیوں میں چرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اسے بھول جاؤ اب اسے تلاش کرنا مشکل ہے۔" شاہ پری نے جواب دیا۔

"تمہارے مل جانے سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا ہے۔" ثمینہ بولی۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان پہاڑوں سے نکلیں گے کیسے؟"

"تمہارے مل جانے سے مجھے بھی حوصلہ ہوا ہے۔ انشاء اللہ ہم راستہ تلاش کر لیں گے۔" شاہ پری نے جواب دیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ ثمینہ نے اسے اپنے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ اخبار نویس ہے اور افغانستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے یہاں آئی ہوئی ہے۔ لیکن وہ بھی مسلسل حادثات کا شکار ہو رہی ہے۔

دھوپ تیز ہو رہی تھی' چٹانیں تپ رہی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے وہ یہاں بیٹھی نہیں رہ سکتی تھیں۔ بالآخر انہوں نے وہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو گئیں۔ شاہ پری آگے تھی اور ثمینہ اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔

"براکی' کرم آباد سے مشرق کی طرف واقع ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں مشرق کی طرف ہی چلنا چاہئے۔" شاہ پری نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے کہا۔

اس نے سر اٹھا کر سورج کی طرف دیکھا۔ سمت کا تعین کیا اور گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ گھوڑا ہلکی رفتار سے چٹانوں میں چلتا رہا۔ تیز دھوپ میں سنگلاخ چٹانیں انگاروں کی طرح تپ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے آگ اگل رہی ہوں۔ شاہ پری اور ثمینہ کے جسم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی۔ ثمینہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس پر انگارے برس رہے ہوں۔

دوپہر تک وہ دونوں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی رہیں۔ وہ اگرچہ چھوٹی چٹانوں کی بھول بھلیوں سے نکل آئی تھیں لیکن ان کے چاروں طرف دور دور تک اب بھی بلند پہاڑ تھے اور انہیں ان پہاڑوں سے نکلنے کا کوئی راستہ اب بھی نہیں ملا تھا۔

پیاس سے ان کے حلق خشک ہو رہے تھے۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ دیکھ کر شاہ پری نے گھوڑے کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی ایک چھوٹی سی ندی میں بہتا ہوا چٹانوں ہی میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ انہوں نے گھوڑے سے اتر کر پانی پیا لیکن اس سے بھوک نہیں مٹی۔ زمین پر لیٹے ہوئے ثمینہ کی نظر درختوں کی شاخوں کی طرف اٹھ گئی۔ وہ تمام شہتوت کے درخت تھے۔ شاخیں پھل سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن شہتوت ابھی پوری طرح پکے نہیں تھے۔ اس نے شاہ پری کو اس طرف متوجہ کیا' اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ان درختوں کا پھیلاؤ اگرچہ بہت زیادہ تھا لیکن زیادہ بلند نہیں تھے۔ شہتوت پورے افغانستان میں پایا جاتا ہے اور اس کا پھل بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔ اسے سکھا بھی لیا جاتا ہے جو ہر موسم میں دکانوں پر بھی فروخت ہوتا ہے۔

"اس سے ہمارا پیٹ بھر سکتا ہے۔ شہتوت پوری طرح پکے ہوئے ہوں تو بہت مزیدار ہوتے ہیں۔ آؤ' ہم ان درختوں پر آسانی سے چڑھ سکتی ہیں۔" شاہ پری نے کہا۔

وہ دونوں اٹھ گئیں۔ درخت پر چڑھنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں الگ الگ شاخوں پر بیٹھ کر پکے ہوئے شہتوت توڑ توڑ کر کھانے لگیں۔ شہتوت کھانے میں ثمینہ کو واقعی مزہ آ رہا تھا۔

پیٹ بھرنے کے بعد وہ ایک بار پھر درخت کے نیچے بیٹھی یہ سوچنے لگیں کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو کر منزل کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔ اس مرتبہ ثمینہ آگے بیٹھی تھی اور شاہ پری نے پیچھے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اس کی کمر پر لپیٹ لئے تھے۔

وہ اگرچہ تازہ دم ہو چکی تھیں لیکن دھوپ نے ایک بار پھر پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ ثمینہ کو اپنا دماغ پگھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پیچھے بیٹھی شاہ پری بار بار کہہ رہی تھی کہ کرم آباد سے براکی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ لیکن وہ کل رات سے بھٹک رہی ہے۔ ثمینہ کو شبہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ان پہاڑوں میں بھٹک کر اپنی منزل سے بہت دور نکل گئی ہوں۔

وہ ایک تنگ سے درے میں پہنچ گئیں۔ اور جیسے ہی اس درے سے باہر نکلیں ثمینہ نے گھوڑا روک لیا۔ ان کے سامنے نشیب میں وسیع و عریض سرسبز و شاداب وادی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں وادی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاہ پری اچانک ہی اچھل پڑی اور وہ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخی۔

"وہ.... وہ دیکھو' اس طرف دھواں اٹھ رہا ہے.... وہاں یقیناً کوئی گھر ہو گا۔ گھوڑا اس طرف موڑ دو۔"

ثمینہ نے اس کے اشارہ کی سمت میں دیکھا۔ نشیب میں بہت دور درختوں میں کسی جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ گنجان درختوں کی وجہ سے اگرچہ کوئی مکان دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہاں سے اٹھتا ہوا دھواں اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ ان درختوں میں کوئی چھوٹی سی بستی یا کوئی ایک آدھ مکان موجود ہے۔ ثمینہ نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچی تھیں۔ وہ اخروٹ کا باغ تھا جو چاروں طرف بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس باغ میں ایک کھلی جگہ تھی جہاں ایک دوسرے سے ذرا فاصلہ پر دو کچے مکان بنے ہوئے تھے۔ اور وہ دھواں ایک مکان کے صحن سے اٹھ رہا تھا۔

وہ دونوں گھوڑے سے اتر آئیں۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ شاہ پری' ثمینہ کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت باہر نکلی۔ وہ عورت ان دونوں کو دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

"کیا اس گھر میں ہمیں تھوڑی دیر کو پناہ مل سکتی ہے؟" شاہ پری نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم لوگ' کہاں سے آئی ہو اور تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" اس عورت نے پوچھا اور دور کھڑی ہوئی ثمینہ کی طرف دیکھنے لگی۔ ثمینہ کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اور اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"ہم دونوں اکیلی ہیں۔" شاہ پری نے جواب دیا۔ "میں کرم آباد کی رہنے والی ہوں۔ کل رات ہماری بستی پر حملہ ہو گیا تھا۔ ہم لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ بستی سے نکل کر براکی کی طرف جا رہے تھے کہ ہم ان سے بچھڑ کر راستہ بھٹک گئیں۔ کل رات سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہی ہیں۔ یہاں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا تو اس طرف آ گئیں۔"

"تم کرم آباد کی رہنے والی ہو اور براکی جا رہی تھیں؟" عورت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔" شاہ پری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کرم آباد یہاں سے پچاس کوس اور براکی تقریباً نوے کوس ہے۔ تم لوگ یہاں کیسے آ گئیں؟" عورت نے کہا۔

"میں نے بتایا نا کہ ہم کل رات سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہی ہیں۔" شاہ پری نے جواب دیا۔ "بھوک پیاس اور تھکن نے ہمیں نڈھال کر رکھا ہے۔ ہم تھوڑی دیر یہاں رکنا چاہتی ہیں۔ پھر چلی جائیں گی۔"

"آؤ..... اندر آ جاؤ۔" اس عورت نے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

ثمینہ نے گھوڑے کو ایک درخت کی شاخ سے باندھ دیا اور شاہ پری کے ساتھ اندر آ گئی۔ صحن خاصا وسیع تھا ایک طرف تندور بنا ہوا تھا اور آگ اسی تندور میں جل رہی تھی جس سے اٹھنے والا دھواں انہوں نے دیکھا تھا۔

"آؤ..... آؤ.... تم لوگ ادھر بیٹھ جاؤ۔" وہ عورت انہیں مکان کے برآمدے میں لے گئی۔ جہاں ایک پرانی سی دری بچھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گئیں۔ اس عورت نے پہلے انہیں پانی پلایا پھر جلدی سے قہوہ بنا کر لے آئی اور ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"گھر میں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں ہے؟" شاہ پری نے پوچھا۔

"میرا خاوند ہے اور بیٹا ہے' وہ دونوں کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر میں آنے والے ہوں گے۔" عورت نے جواب دیا۔

"یہ باغ تمہارا ہے؟" شاہ پری نے ایک اور سوال کیا۔

"نہیں' یہ باغات خان عبدالرسول کے ہیں۔ ہم تو یہاں چوکیداری کرتے ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔

"یہاں سے آبادی کتنی دور ہے؟" اس مرتبہ ثمینہ نے پوچھا۔

"اس باغ سے آگے ایک کچا راستہ ہے جو پختہ سڑک تک چلا گیا ہے۔ وہیں پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ وہاں سے بسیں بھی مل جاتی ہیں۔" عورت نے جواب دیا اور چند لمحوں بعد اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم لوگ بیٹھو' میں روٹیاں بنا لوں۔"

شاہ پری اور ثمینہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھیں کہ اس مکان تک پہنچ گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے چلی جائیں گی۔ لیکن روٹیاں پکانے کے بعد عورت نے بتایا کہ وہ آج یہاں سے نہیں جا سکیں گی۔ شام ہونے والی تھی۔ وہ عورت مصر تھی کہ رات یہیں رہیں صبح اس کا خاوند یا بیٹا انہیں پکی سڑک والی بستی تک چھوڑ آئے گا۔

وہ دونوں حالانکہ بہت پریشان تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ دوسرے لوگ ان کے بارے میں پریشان ہو رہے ہوں گے لیکن انہوں نے اس بوڑھی عورت کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر دوبارہ راستے سے بھٹک گئیں تو نجانے کہاں نکل جائیں۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے لالٹین روشن کر دی اور ان کے سامنے دستر خوان بچھا دیا۔ شوربے والا گوشت اور تندوری روٹی۔ ان دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ وہ کھانے سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ ثمینہ چونک گئی۔ اس نے کئی روز بعد کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی تھی۔ اسکے تھوڑی ہی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال رہی ہو گی۔ خوب صحت مند اور لمبے قد کا مالک تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں رخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس بڑھیا کا بیٹا سعد اللہ تھا۔ وہ حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑھیا نے ان کے بارے میں بتایا تو وہ سرہلا کر رہ گیا۔ ثمینہ نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی تھی۔ ثمینہ نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ سعد اللہ' شاہ پری کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بڑھیا کے پوچھنے پر سعد اللہ نے بتایا کہ بابا کسی کام سے بستی میں رہ گیا ہے۔ کل دوپہر کے بعد واپس آئے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ صبح ان دونوں کو بستی میں پہنچا دے گا۔

سعد اللہ اور اس کی ماں نے بھی کھانا کھا لیا۔ اس کے کچھ دیر بعد جب سعد اللہ کی ماں ایک کمرے میں شاہ پری اور ثمینہ کے لئے بستر بچھانے لگی تو سعد اللہ نے اسے روک دیا۔

"کیوں میں تو یہاں ان مہمان لڑکیوں کے لئے بستر بچھا رہی ہوں۔ تم کیوں منع کر رہے ہو؟" ماں نے اسے گھورا۔

"وہ رات کو دوسرے گھر میں رہیں گی۔ میں وہاں ان کے لئے بستر لگا دیتا ہوں۔" سعد اللہ نے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" ماں نے اسے گھورا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو ماں!" سعد اللہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "وہ جو فوجی وردی والی لڑکی ہے نا وہ کافر ہے اور دوسری لڑکی پر بھی مجھے شبہ ہے۔ مجھے شک ہے یہ دونوں لڑکیاں جاسوسی کے لئے اس علاقے میں آئی ہوئی ہیں اور مجاہدین کو ان کی تلاش ہے۔ اگر مجاہدین یہاں آ گئے تو انہیں ہمارے گھر میں پا کر ہمیں بھی پکڑ لیں گے۔ اس لئے انہیں رات کو یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ میں دوسرے مکان میں ان کے لئے بستر لگا دیتا ہوں۔"

"لیکن وہ بھی تو ہمارا ہی مکان ہے۔" بڑھیا نے اسے گھورا۔

"وہاں سے پکڑی جائیں گی تو ہم پر زیادہ ذمے داری نہیں آئے گی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رات کو کسی وقت چوری چھپے وہاں گھس گئی ہوں گی۔" سعد اللہ نے جواب دیا۔

بڑھیا سوچ میں پڑ گئی۔ ثمینہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہے لیکن اس کا بیٹا کہہ رہا تھا کہ وہ کافر "روسی فوجی" ہے۔ اس کے لئے بیٹے کی بات میں زیادہ وزن تھا' اور اس نے بیٹے کی بات مان لی۔

اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب سعد اللہ نے شاہ پری اور ثمینہ کو بتایا کہ رات انہیں دوسرے مکان میں گزارنی پڑے گی تو ثمینہ کی چھٹی حس نے اسی وقت خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ شاہ پری کا ماتھا بھی ٹھنکا تھا لیکن بہرحال' ان میں سے کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

سعد اللہ انہیں دوسرے مکان میں لے آیا۔ ایک کمرے میں چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ سعد اللہ نے چٹائی پر ایک چادر بچھا دی اور دو پرانے سے کمبل انہیں اوڑھنے کے لئے دے دیئے۔ لالٹین اس نے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دی تھی۔

"اب تم لوگ سو جاؤ۔ مگر صبح جلدی اٹھ جانا۔ میں بستی تک چھوڑنے کے لئے تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گا۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔"

سعد اللہ چلا گیا۔ ثمینہ نے دروازے کے قریب آ کر باہر جھانکا۔ ان دونوں مکانوں کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ سرخ رنگ کا ایک کھٹارہ سا چھوٹا پک اپ ٹرک بھی ثمینہ نے باہر کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پہلے مکان میں بیٹھے ہوئے اس نے اسی گاڑی کی آواز سنی تھی۔

اس نے دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا اور کھڑکیاں دیکھنے لگی۔ ایک دروازہ اور کھڑکی اندر صحن کی طرف کھلتی تھی۔ صحن کا دروازہ مکان کے دوسری طرف تھا۔ ثمینہ نے کمرے کا دراوزہ اور کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک گتہ لگا ہوا تھا۔ دوسری کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے تمام شیشے سلامت تھے۔

دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود کمرے میں گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں چٹائی پر بچھی ہوئی چادر پر لیٹ گئیں اور کمبل اوڑھ کر باتیں کرنے لگیں۔ کونے میں پڑی ہوئی لالٹین جلتی چھوڑ دی گئی تھی۔ شاہ پری تو باتیں کرتے کرتے سو گئی تھی لیکن ثمینہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سعد اللہ کے چہرے پر جو تاثرات اور اس کی آنکھوں میں جو چمک دیکھی تھی اس نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ اس نے اگرچہ سعد اللہ اور اس کی ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ سعد اللہ انہیں الگ مکان میں کیوں سلانا چاہتا ہے۔ اس کی نیت میں فتور تھا اور ثمینہ کو یقین تھا کہ وہ آج رات کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ثمینہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

اس نے گردن گھما کر شاہ پری کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت نظر آ رہی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ ثمینہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اس کھڑکی کے قریب آ گئی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس نے آہستگی سے چٹخنی ہٹا کر کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

کھڑکی کھلتے ہی حشرات الارض کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی تھیں۔ وہ چند منٹ تک وہاں کھڑی تاریکی میں گھورتی رہی' پھر کھڑکی بند کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر لیٹ گئی اور کمبل سینے تک کھینچ لیا۔ بے حد تھکی ہوئی ہونے کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے برعکس اس کے دماغ میں ایک بے چینی سی بھری ہوئی تھی۔

لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ بالآخر ثمینہ کی بھی آنکھ لگ گئی۔

دفعتاً" گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ رات کا کونسا پہر تھا۔ اس پر نیند کا دباؤ تھا اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی اس نے شاہ پری کی طرف دیکھا۔ ثمینہ نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آنکھیں دوبارہ کھل گئیں۔ اس کی سماعت سے ہلکی سی آواز ٹکرا رہی تھی جیسے کوئی کسی چیز کو اس کی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چند سیکنڈ تک اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ اس نے بہت محتاط انداز میں ذرا سی گردن گھما کر باہر کی

ف کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر تاریکی ہونے کے باوجود اسے اندازہ ہو گیا کہ وہاں کوئی ں تھا۔ اس وقت آواز بھی رک گئی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ وہ آواز سننے کی کوشش کی پھر ھیں بند کر لیں۔

تقریباً دو منٹ گزر گئے۔ ثمینہ کا ذہن ایک بار پھر نیند میں ڈوب رہا تھا کہ ایک بار پھر اس کی نکھ کھل گئی۔ اس مرتبہ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دبے قدموں کمرے میں چلنے کی وشش کر رہا ہو۔ وہ آواز اس کے قریب آ کر رک گئی اور وہ سانس روکے بے حس و حرکت لیٹی ہی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ اس کا واہمہ نہیں تھا۔ کوئی اس کے قریب موجود ا۔ اس کی سانسوں کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر اسے یوں لگا جیسے شاہ پری کے اوپر سے کمبل ہٹا دیا گیا ہو۔ اس وقت شاہ پری کروٹ لے کر اس سے کچھ دور ہٹ گئی تھی۔ ثمینہ نے بھی یوں حرکت کی جیسے کروٹ لے رہی ہو۔ اس نے کمبل اپنے اوپر سے نہیں ہٹنے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھ میں ذرا سی جھری پیدا کر کے دیکھ لیا تھا۔ سعد اللہ' شاہ پری کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کے رے پر خباثت کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پستول تھا اور دایاں تھ وہ شاہ پری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا رہا تھا۔

ثمینہ نے بڑے محتاط انداز میں کمبل کے اندر ہی اندر پتلون کا پائنچہ اوپر سرکا کر پنڈلی پر بندھا وا خنجر نکال لیا اور اس کے دستے پر گرفت جما کر آنے والے لمحوں کا انتظار کرنے لگی۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاہ پری کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ سعداللہ کو دیکھ کر وفزدہ سی ہو گئی۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر سعد اللہ نے پھرتی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ یا۔ اور پستول اس کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

"خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ چل دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

شاہ پری کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ ثمینہ صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کمبل کے در ہی خنجر کے دستے پر گرفت درست کی۔ پھر بڑی آہستگی سے ہاتھ کمبل سے باہر نکالا اور بجلی کی ی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلٹ کر سعد اللہ پر حملہ کر دیا۔

سعد اللہ کے لئے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ثمینہ گہری نیند سو رہی ہے۔ وہ شاہ پری کو پستول کے زور پر دوسرے کمرے میں لے جا کر اپنی گندی خواہش پوری کرلے گا لیکن معاملہ اس کے برعکس ثابت ہو رہا تھا۔

خنجر کی نوک سعد اللہ کی کہنی سے ذرا اوپر بازو میں پیوست ہو گئی۔ سعداللہ کے منہ سے ہلکی

سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اس طرح اچھلا تھا کہ پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔

ثمینہ نے کمبل کو اپنے اوپر سے اتار کر دور پھینک دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر خنجر سے وار کیا۔ سعد اللہ اس مرتبہ بھی حملہ کے لئے تیار نہیں تھا۔ خنجر اس کے کندھے پر لگا۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

شاہ پری بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ چند لمحے خوفزدہ سی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس دوران ثمینہ ایک بار پھر سعد اللہ پر حملہ کر چکی تھی۔ لیکن اس مرتبہ سعد اللہ نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور گالیاں بکتے ہوئے اس کے ہاتھ سے خنجر چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ خنجر تو ثمینہ کی گرفت سے نکل کر ایک جھٹکے سے دور جا گرا لیکن وہ خود سعد اللہ کی گرفت میں آ گئی۔

سعد اللہ بہت طاقتور تھا۔ اس نے ایک زور دار گھونسہ ثمینہ کے منہ پر مارا اور ثمینہ کے منہ سی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ایک طرف کھڑی ہوئی شاہ پری، ثمینہ کی چیخ سن کر جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر سعد اللہ کے بال پکڑ لئے اور اسے زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے پیچھے کھینچنے لگی۔ سعد اللہ نے اس کی پسلی پر کہنی سے زور دار وار کیا۔ شاہ پری کراہ کر پیچھے الٹ گئی۔ اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر تک سینہ سہلاتی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی نظر خنجر پر پڑ گئی۔ جو اس سے تین چار فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ اس نے لپک کر خنجر اٹھا لیا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سعد اللہ پر حملہ کر دیا۔

خنجر سعد اللہ کی پشت پر ریڑھ کی ہڈی کے قریب پیوست ہو گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ ثمینہ کو چھوڑ کر پیچھے پلٹا لیکن شاہ پری نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے اس پر خنجر سے وار کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور جنون سا طاری ہو گیا تھا۔

سعد اللہ کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ شاہ پری پے در پے اس پر خنجر سے وار کرتی رہی۔ سعد اللہ چیختا اور فرش پر لوٹتا رہا۔ لیکن شاہ پری نے اس وقت تک ہاتھ نہیں روکا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہو گیا۔

شاہ پری پر اب بھی جنون طاری تھا۔ ثمینہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا۔ شاہ پری چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ثمینہ نے اس کا کندھا تھپتھپایا پھر اسے لے کر اس جگہ سے چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔

کمرے میں خون بکھرا ہوا تھا۔ شاہ پری کی قمیض پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ ثمینہ نے خنجر صاف کر کے اپنی پنڈلی پر باندھ لیا۔ اور شاہ پری کی چادر اٹھا کر اس کے کندھے پر ڈال دی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔" وہ شاہ پری کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرے کے دونوں دروازے بند تھے لیکن آنگن کی طرف والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اب یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ سعد اللہ کمرے میں کس طرح داخل ہوا تھا۔ اس کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی جگہ گتہ لگا ہوا تھا۔ اس نے گتہ نکال کر کھڑکی کھول لی تھی اور کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"چلو... اب دیر نہ کرو۔" ثمینہ نے شاہ پری کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شاہ پری نے چادر اپنے اوپر درست کی اور ثمینہ کے ساتھ باہر والے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ ثمینہ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر تاریکی تھی۔ ان کا گھوڑا وہاں سے کچھ دور کھڑا تھا۔ اس نے شاہ پری کو اشارہ کیا اور وہ دونوں مکان سے نکل کر دبے قدموں گھوڑے کی طرف چلنے لگیں۔ گھوڑا انہیں دیکھ کر ہنہنانے لگا۔

شاہ پری اور ثمینہ نے گھوڑے کو تھپتھپایا۔ درخت کی شاخوں سے بندھی ہوئی اس کی لگام کھولی اور اسے لے کر پیدل ایک طرف چلنے لگیں۔ مکان سے تقریباً سو گز دور نکل آنے کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو گئیں۔

باغ کے بیچوں بیچ کچھ راستہ کافی کشادہ تھا۔ وہ اس راستے پر گھوڑے کو دوڑاتی رہیں۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھیں۔ بڑھیا نے بتایا تھا کہ یہ کچا راستہ تقریباً بیس کوس آگے جا کر پکی سڑک سے مل جاتا تھا جہاں ایک چھوٹی سی بستی بھی تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ وہ اس کچے راستے پر گھوڑا دوڑاتی رہیں اور بالآخر جب رات کی تاریکی چھٹنے لگی تو وہ پکی سڑک پر پہنچ گئیں۔ بستی اس سڑک کے دوسری طرف تھی۔ لیکن ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ بستی کے لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ البتہ وہ جیسے ہی پکی سڑک پر پہنچیں آوارہ کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا تھا۔

بڑھیا نے بتایا تھا کہ اس بستی سے کرم آباد اور براکی کے لئے بسیں بھی مل سکتی تھیں لیکن ان دونوں کے خیال میں کسی بس کے انتظار میں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ باغ میں واقع وہ مکان بیس میل ہی کے فاصلے پر تو تھا۔ صبح ہوتے ہی اس بڑھیا کو اپنے بیٹے کے قتل کا پتہ چل جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس دوران کوئی اور بھی اس مکان تک پہنچ جائے اور پھر قتل کی اطلاع اس بستی تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس لئے اس بستی میں رکنا ان دونوں کے لئے خطرناک

ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ یہاں سے کس طرف جانا چاہئے۔

کتے بھونک بھونک کر ان کی طرف لپک رہے تھے۔ چند گز آگے بستی کی طرف جانے والی ایک کچی سڑک کے کنارے پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر فارسی میں کرم آباد اور براکی کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے فاصلہ اور تیروں کے نشان بھی تھے۔ براکی کے نیچے تیر کا نشان بائیں طرف تھا۔

"کرم آباد کی طرف جانا تو مناسب نہیں ہو گا۔ میرا خیال ہے اس طرف چلا جائے۔" ثمینہ نے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو۔" شاہ پری نے کہا۔

کتے کچھ دور تک ان کا پیچھا کرتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ وہ دونوں سڑک کے کنارے کچی زمین پر گھوڑا دوڑاتی رہیں۔ دن کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے گھوڑے کی رفتار کم نہیں کی تھی۔

سڑک کے دونوں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی ندیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دھوپ کی روپہلی کرنیں ہر طرف پھیل رہی تھیں۔ اب اکا دکا آدمی بھی کھیتوں میں نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ گھوڑا روک کر ندی سے پانی پیا اور پھر آگے روانہ ہو گئیں۔

دھوپ پھیل چکی تھی۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ سامنے سے ایک بس آتے دیکھ کر انہوں نے گھوڑا روک لیا۔ کچھ دیر بعد بس ان کے قریب سے گزر گئی تو انہوں نے دوبارہ گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں سڑک سے ذرا ہٹ کر چلنا چاہئے تاکہ دوسروں کی نظروں میں نہ آ سکیں۔" شاہ پری نے کہا۔

مناسب مشورہ تھا۔ ثمینہ نے فوراً ہی گھوڑا سڑک سے اتار دیا۔ وہ سڑک سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر چلتی رہیں۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ سڑک ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئیں۔ یہ بستی سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع تھی۔ اور چند گھروں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے رک کر مشورہ کیا اور بستی میں داخل ہو گئیں۔

بستی کے لوگ مہمان نواز تھے۔ ایک آدمی انہیں اپنے گھر لے گیا۔ گھر کی خواتین نے ان کی

بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے لئے ناشتہ تیار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ناشتے کے تھوڑی دیر بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گی۔ وہ ابھی قہوہ پی رہی تھیں کہ ایک نوجوان لڑکا اندر داخل ہوا۔ وہ مشتبہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اپنی ماں سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ اس کی ماں کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

چند منٹ بعد ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوا' اس کے پیچھے جو دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے تھے انہیں دیکھ کر ثمینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ پولیس والے تھے..... ثمینہ نے شاہ پری کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔

پولیس والے دروازے میں کھڑے چند لمحے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک پولیس والے نے شاہ پری سے چند سوالات کئے اور پھر ان دونوں کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

ثمینہ کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا..... ایک اجنبی ملک میں پولیس کے ہاتھ لگنے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتی تھی..... وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پولیس والوں کے ساتھ چلنے لگی۔

باہر ایک کھٹارہ سی جیپ کھڑی تھی۔ ان دونوں کو جیپ میں بٹھا لیا گیا اور جیپ بستی سے نکل کر سڑک پر اسی طرف دوڑنے لگی جس طرف سے وہ آئی تھیں۔

○

ثمینہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی غیر ملک خصوصاً افغانستان جیسے ملک میں پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ افغانستان کے بارے میں جہاں اور بھی بہت سی خوفناک باتیں سن رکھی تھیں' وہاں اس نے یہ بھی سنا تھا کہ دنیا کی بدترین جیلیں افغانستان میں ہیں۔ قیدیوں کو جیلوں میں ڈال کر اس طرح بھلا دیا جاتا ہے جیسے اس دنیا میں ان کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو اور پھر غیر ملکی قیدیوں کے ساتھ تو بہت ہی برا سلوک کیا جاتا ہے۔ قانون تو ہر ملک میں ہوتا ہے مگر افغانستان میں ان دنوں قانون نام کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ملک خانہ جنگی کا شکار تھا۔ روسیوں کے جانے کے بعد افغان حکمران اقتدار کے لیے جس طرح آپس میں لڑ رہے تھے' اس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ مارے جا رہے تھے۔ شہروں کے شہر کھنڈر بن رہے تھے مگر اقتدار کی ہوس نے حکمرانوں کو اندھا کر رکھا تھا۔ کئی دھڑے بن گئے تھے۔ ملک میں اسلحہ کی کمی نہیں تھی۔ روسی فوجی اپنے پیچھے ہر قسم کے اسلحہ کے انبار چھوڑ گئے تھے جنہیں افغان سیاسی لیڈر بڑی آزادی سے اپنے ہی لوگوں پر استعمال کر رہے تھے۔ اس طرح افغانستان کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔ جو سیاسی لیڈر جس علاقے پر قابض ہوتا' وہاں اس کا قانون چلتا تھا۔ سرکاری قانون عملی طور پر ختم ہو چکا تھا۔

ثمینہ کو یہی خوف تھا کہ ان کے ساتھ نجانے کیا سلوک کیا جائے۔ وہ دونوں لڑکیاں تھیں اور وہ جانتی تھی کہ دنیا کے ہر خطے میں عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے اور جب عورت کسی معاملے میں مجبور ہو تو اس کی مجبوری سے فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے۔ اس وقت وہ دونوں پولیس کے قبضے میں تھیں۔ وہ ایک آدمی کو قتل کر کے بھاگی تھیں۔ یہ قتل انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے کیا تھا لیکن پکڑی گئی تھیں اور ثمینہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اپنی صفائی پیش کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ شاہ پری افغانی تھی اور اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس کے باپ ملا نصیرالدین کے کچھ تعلقات بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے شاہ پری بچ جائے لیکن خود اس کا بچنا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ کرم آباد اور اس سے پہلے انہوں نے اپنے آپ کو پاکستانی اخبار نویس بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے پہلے ملنے والے لوگوں نے ان کی بات کا یقین کر لیا ہو لیکن اب وہ پولیس کے ہتھے لگ گئی تھی۔ اس

کے پاس نہ پاسپورٹ تھا' نہ کسی اور قسم کے کاغذات۔ پولیس یقیناً یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ درحقیقت کون ہے اور اس دوران اس کا جو حشر کیا جائے گا' اس کا بھی اسے کچھ اندازہ تھا۔

ثمینہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی اور جیپ متوسط رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اسی بستی میں پہنچ گئے جہاں سے انہوں نے پکی سڑک کا راستہ اختیار کیا تھا۔

جیپ جیسے ہی بستی میں داخل ہوئی' ادھر ادھر کھڑے ہوئے لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جیپ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ یہ مکان دوسرے مکانوں سے کچھ مختلف تھا۔ اس کی دیواریں اونچی اور درمیان میں ایک گیٹ بنا ہوا تھا۔ گیٹ کے سامنے ایک پولیس والا آٹومیٹک رائفل کندھے پر لٹکائے کھڑا تھا۔

جیپ پر سوار پولیس والے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے شاہ پری اور ثمینہ کو بھی پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ شاہ پری نے چیخ کر فارسی زبان میں کچھ کہا اور جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر پولیس والے نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ شاہ پری چیخ اٹھی ..... ثمینہ نے بھی دوسرے پولیس والے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر شاہ پری کا حشر دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی آہنی شکنجے میں کسا ہوا ہو۔

پولیس والے انہیں کھینچتے ہوئے گیٹ کے اندر لے گئے۔ ثمینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس مکان کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ گیٹ کے آگے مختصر سا صحن تھا اور اس سے آگے برآمدہ۔ وہ برآمدے میں پہنچ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔

یہ مکان بھی بستی کے دوسرے مکانوں کی طرح کچا ہی تھا۔ کمرے کا فرش بھی کچا تھا۔ سامنے ہی ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک کرسی تھی۔ دائیں طرف دیوار کے سامنے ایک بنچ پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر پولیس والوں نے ان کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ثمینہ اور شاہ پری نے بنچ پر بیٹھنا چاہا تو ایک پولیس والے نے انہیں ڈانٹ دیا اور دوسری طرف دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں انتہائی خوفزدہ تھیں۔ دیوار کے قریب کھڑی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہی پولیس والا اندر آ گیا جو انہیں پکڑ کر لایا تھا۔ وہ اس پولیس چوکی کا انچارج تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہوئے ایک پولیس والے سے کچھ کہا' وہ سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا آدمی بھی تھا۔ اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن کاٹھی اب بھی خاصی مضبوط نظر آ رہی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے

ہی خونخوار نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا تھا اور پھر وہ جیسے ہی ان کی طرف بڑھا' پولیس والے نے اس کا راستہ روک لیا اور بازو سے پکڑ کر بنچ پر بٹھا دیا۔ وہ اب بھی ثمینہ اور شاہ پری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور وہ غصے سے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

پولیس چوکی کا انچارج عمر خان نے پہلے اس ادھیڑ عمر آدمی کی طرف دیکھا' پھر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ آخر میں وہ شاہ پری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "اس شخص کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔" شاہ پری نے نفی میں سرہلا دیا۔

"یہ اس نوجوان سعد اللہ کا باپ ہے جسے تم دونوں نے قتل کیا ہے۔" عمر خان نے کہا۔

"ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" شاہ پری نے کہا۔

"کیا کل رات تم دونوں اخروٹوں والے باغ میں واقع مکان میں نہیں رکی تھیں؟" عمر خان اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "سعد اللہ کی ماں نے تم دونوں کو پناہ دی' تمہیں کھانا کھلایا' سونے کے لیے جگہ دی اور اس کا صلہ تم لوگوں نے یہ دیا کہ اس کے جوان بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" شاہ پری نے چیخ کر جواب دیا۔ "ہم رات کو اس مکان میں ٹھہری ضرور تھیں۔ اس بڑھیا نے ہمیں اپنے گھر میں سونے کو جگہ دی تھی مگر سعد اللہ نے ہمیں وہاں سے اٹھا کر دوسرے مکان میں پہنچا دیا۔ ہم وہاں سو رہی تھیں کہ رات کے پچھلے پہر شور کی آواز سن کر ہماری آنکھ کھل گئی۔ بڑھیا کا بیٹا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی دو آدمی اور بھی کمرے میں آگئے۔ وہ غالباً اس کے دوست تھے۔ وہ تینوں ہمیں مال غنیمت سمجھ کر ہماری عزت سے کھیلنا چاہتے تھے۔ بڑھیا کے بیٹے کا ایک دوست پہلے اس لڑکی کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا تھا جبکہ بڑھیا کا بیٹا اس لڑکی پر پہل کرنا چاہتا تھا۔ اسی بات پر ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ دونوں ایک طرف تھے اور بڑھیا کا بیٹا ایک طرف۔ ہم انتہائی خوفزدہ تھیں۔ ان کی لڑائی سے فائدہ اٹھا کر ہم وہاں سے بھاگ نکلیں۔ ہمارے بعد اگر بڑھیا کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا تو ہمیں معلوم نہیں کہ اس کا قاتل کون ہے' ہم تو ڈر کے مارے وہاں سے بھاگی تھیں۔"

عمر خان چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا' پھر سعد اللہ کے باپ سے باتیں کرنے لگا۔ شاہ پری اور عمر خان میں ساری گفتگو فارسی زبان میں ہوئی تھی اور ثمینہ کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑا تھا۔ عمر خان کو بوڑھے سے باتیں کرتے پا کر شاہ پری ثمینہ کی طرف جھک گئی اور سرگوشی کرتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں اسے بتانے لگی کہ اس نے پولیس کو کیا کہانی سنائی ہے۔ وہ بھی یہی کہانی

سنائے۔

ثمینہ اس کی ذہانت پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے پولیس آفیسر عمر خان اور اس بوڑھے کی طرف دیکھنے لگی۔ عمر خان کی باتیں سن کر بوڑھا بھڑک اٹھا تھا۔ وہ تیز تیز لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" ثمینہ نے سرگوشی میں شاہ پری سے پوچھا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ سعد اللہ رات کو اکیلا ہی بستی میں واپس گیا تھا اور اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور یہ کہ اس کا بیٹا اتنا بے غیرت نہیں تھا کہ گھر میں مہمان خواتین کی طرف بری نظروں سے دیکھتا۔" شاہ پری نے بھی سرگوشی میں بتایا۔

"اس کے بیٹے کے بے غیرت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔" ثمینہ بولی۔ "اگر غیرت والا ہوتا تو واقعی کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔"

"اب یہ پولیس آفیسر اس بوڑھے کو جانے کا کہہ رہا ہے۔ اس کے بعد وہ ہم سے تفتیش کرے گا۔ وہ بوڑھے سے کہہ رہا ہے کہ اگر یہ لڑکیاں واقعی قاتل ثابت ہوئیں تو چھوڑے گا نہیں۔" شاہ پری نے سرگوشی کی۔

چند منٹ بعد بوڑھا چلا گیا۔ پولیس آفیسر عمر خان ایک بار پھر ثمینہ اور شاہ پری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شاہ پری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"تم کون ہو اور اس باغ میں کیسے پہنچی تھیں؟"

"میں کرم آباد کے ملا نصیر الدین کی بیٹی ہوں۔" شاہ پری نے جواب دیا۔ ملا نصیر الدین کا نام سن کر عمر خان چونک گیا۔

"ملا نصیر الدین کی بیٹی!" اس نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کرم آباد سے اس باغ میں کیسے پہنچیں اور یہ لڑکی کون ہے؟"

"دو رات پہلے ہمارے گاؤں پر مجاہدین کے کسی گروہ نے حملہ کر دیا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ بھی جانیں بچانے کے لیے بھاگے تھے لیکن میں رات کی تاریکی میں راستہ بھٹک گئی۔ کل یہ بھی مجھے پہاڑوں میں مل گئی۔ یہ بھی رات کی تاریکی میں راستہ بھٹک کر پہاڑوں کی طرف نکل گئی تھی۔"

"یہ کون ہے؟" عمر خان ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ پاکستانی ہے۔ اخبار نویس۔" شاہ پری نے بتایا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ دو دن پہلے یہ بھی ہمارے ہاں مہمان بن کر آئے تھے۔ جب گاؤں پر حملہ ہوا تو یہ بھی ہمارے گھر میں

موجود تھے اور ہمارے ساتھ ہی وہاں سے بھاگے تھے۔ رات کی تاریکی میں یہ بھی میری طرح راستہ بھٹک گئی تھی۔ اتفاق سے یہ مجھے پہاڑوں میں مل گئی اور ہم راستہ ڈھونڈتے ہوئے اس باغ میں پہنچ گئے جہاں اس عورت نے ہمیں پناہ دی لیکن اس کے بیٹے کی نیت خراب ہو گئی اور اپنے دوستوں کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"یہ تو بعد میں پتہ چلے گا کہ وہ کس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔" عمر خان نے کہا۔ "ملا نصیر الدین کہاں ہے؟"

"ہم کرم آباد سے بھاگ کر براکی جا رہے تھے۔" شاہ پری نے بتایا۔ "ہماری گمشدگی پر وہ لوگ یقیناً پریشان ہوں گے اور ہو سکتا ہے ہمیں تلاش کر رہے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تم لوگوں سے بعد میں بات کروں گا۔" عمر خان نے کہا اور پولیس والوں کو اشارہ کیا۔

پولیس والے انہیں کلائیوں سے پکڑ کر دفتر سے باہر لے آئے۔ دفتر کے پچھلی طرف ایک چھوٹی سی جیل بنی ہوئی تھی۔ چار کمرے تھے جن پر سلاخوں والے دروازے لگے ہوئے تھے۔ ایک کوٹھری میں دو قیدی تھے۔ وہ دونوں دروازے کی سلاخوں سے لگے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر تھے۔ بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھیاں' بکھرے ہوئے بال اور میلے چیکٹ لباس۔ ان کے چہروں پر بھی میل جمی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے مہینوں سے منہ نہ دھویا ہو۔ ان دونوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک قہقہے لگانے لگا جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔

ثمینہ کو ان کے ساتھ والی کوٹھری میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ یہ جان کر ثمینہ کی روح فنا ہو گئی کہ اس کوٹھری میں اسے اکیلی ہی کو بند کیا جا رہا ہے جبکہ شاہ پری کو اس کے ساتھ والی کوٹھری میں بند کیا گیا تھا۔ غالباً شاہ پری نے بھی انہیں الگ الگ بند کیے جانے پر احتجاج کیا تھا لیکن پولیس والوں نے اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا تھا۔

پولیس والے جا چکے تھے۔ شاہ پری کی کوٹھری سے کچھ دیر تک فارسی میں چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں' پھر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ثمینہ خوف سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ کوٹھری کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کوٹھری تقریباً آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی تھی۔ ایک کونے میں غلاظت بکھری ہوئی تھی جس سے اٹھنے والے تعفن سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ پچھلی دیوار میں ایک روشندان تھا۔ یوں تو وہ روشندان خاصا کشادہ تھا لیکن اس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ثمینہ دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑی ہو گئی اور شاہ پری والی کوٹھری کی طرف گردن گھما کر بولی۔

"شاہ پری۔ میری آواز سن رہی ہو؟"

"ہاں۔ سن رہی ہوں۔" شاہ پری کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی غالباً دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ "خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔ کاش! بابا کو پتہ چل جائے تو وہ ہمیں چھڑا کر لے جائیں گے۔"

"خدا کرے تمہارے بابا کو پتہ چل جائے۔" ثمینہ نے کہا۔ "اگر انہیں پتہ نہ چلا تو شاید ہم اسی جیل میں پڑے پڑے سڑ جائیں گی اور کسی کو خبر تک نہیں ہوگی۔ سنا ہے افغانستان کی جیلیں بہت بری ہوتی ہیں۔ یہاں قیدیوں کو جیل میں ڈالنے کے بعد بھول جاتے ہیں۔"

"ایسا مت بولو۔ بابا کو ضرور پتہ چلے گا۔" شاہ پری نے جواب دیا۔

ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ساتھ والی کوٹھری کے ایک قیدی نے اونچی آواز میں دری زبان میں گیت گانا شروع کر دیا۔ وہ کیا گا رہا تھا؟ یہ تو ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آسکا لیکن اس کی آواز بڑی پرسوز تھی اور ثمینہ اس آواز کے سوز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دفعتاً" وہ گاتے گاتے رک گیا اور اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ثمینہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ وہی قیدی تھا جو انہیں اس طرف آتے دیکھ کر ہنسا تھا۔

"یہ آدمی کیا گا رہا تھا شاہ پری؟" ثمینہ نے چیخ کر پوچھا۔

"یہ جدائی کا گیت ہے ثمینہ۔" شاہ پری نے جواب دیا "اس کا مطلب ہے کہ وہ صدیوں سے اپنے محبوب سے بچھڑا ہوا ہے اور صیاد نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔"

"بڑا دکھی لگتا ہے۔ اس سے پوچھو یہ کب سے یہاں قید ہے؟" ثمینہ نے کہا۔

شاہ پری نے دری زبان میں چیخ کر قیدی سے پوچھا۔ قیدی نے بھی چیخ کر ہی جواب دیا تھا۔ پھر شاہ پری ثمینہ کو مخاطب کر کے بولی۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ چھ مہینے پہلے چوری کے شبے میں پکڑا گیا تھا۔ اس وقت سے اس کوٹھری میں قید ہے۔ ہفتے میں صرف ایک مرتبہ دو گھنٹے کے لیے اسے کوٹھری سے نکالا جاتا ہے۔"

"اوہ!" ثمینہ کانپ اٹھی۔ چوری کے الزام میں پکڑا جانے والا قیدی چھ مہینوں سے یہاں بند تھا اور انہیں تو قتل کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ پتہ نہیں ان کا کیا حشر ہو۔

وہ دونوں کبھی باتیں کرنے لگتیں اور کبھی خاموش ہو جاتیں۔ انہیں جب یہاں لایا گیا تھا تو دن کے گیارہ بجے تھے اور اب شام ہو رہی تھی۔ اس وقت سے اب تک کسی نے ان کی خبر نہیں لی تھی۔ کل رات کو انہوں نے باغ والے مکان میں کھانا کھایا تھا اور آج صبح بستی میں اس شخص کے گھر میں ابھی آرام سے بیٹھ بھی نہ پائی تھیں کہ پولیس نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ انہیں کچھ کھائے

ہوئے بیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے اور پولیس والوں نے انہیں پوچھا تک نہیں تھا۔ ثمینہ پیٹ میں اینٹھن سی محسوس کرنے لگی تھی۔

جیسے جیسے شام گہری ہو رہی تھی' خنکی بڑھ رہی تھی۔ ثمینہ سلاخوں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ کوٹھری کے اندرونی حصے کی طرف تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تعفن ناقابل برداشت تھا۔ دروازے کے قریب بیٹھی ہونے کے باوجود بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

اندھیرا گہرا ہونے کے ساتھ ہی مچھروں نے بھی یلغار شروع کر دی تھی۔ مچھر جگہ جگہ سے اس کا خون چوس رہے تھے۔ سردی بھی بڑھ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہیں تھی۔ شاہ پری سے ایک بار پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح سردی اور بھوک سے دھیان بٹ رہا تھا۔

اندھیرے میں ایک آدمی کو کوٹھریوں کی طرف آتے دیکھ کر ثمینہ کو یہ امید بندھی کہ شاید وہ کھانا لے کر آیا ہے۔ اس آدمی کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔ کوٹھریوں کے قریب پہنچ کر اس نے لالٹین زمین پر رکھ دی۔ اس کا دوسرا ہاتھ خالی دیکھ کر ثمینہ کو بڑی مایوسی ہوئی۔

وہ پولیس والا تھا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے شاہ پری کی کوٹھری کا دروازہ کھولنے لگا۔ وہ فارسی میں کوئی بات بھی کر رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی شاہ پری کوٹھری کے باہر آگئی۔ اس نے ثمینہ کو بتایا کہ اس کا بابا پہنچ گیا ہے۔ اب وہ آزاد ہو جائیں گی لیکن پولیس والا جب صرف شاہ پری کو لے کر چلا گیا تو ثمینہ کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھی تھی کہ اگر اسے رہائی نہ ملی تو کیا ہوگا؟ لیکن ایک امید اب بھی قائم تھی کہ ملا نصیر الدین کے ساتھ گل رحمان اور دوسرے بھی ہوں گے جو اسے بھی رہائی دلوا دیں گے۔

وقت گزرتا رہا۔ ثمینہ انتظار کرتی رہی لیکن اسے کوٹھری سے نکالنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ پہلے تو تھوڑی بہت آوازیں سنائی دیتی رہیں' پھر سناٹا چھا گیا۔ ساتھ والی کوٹھری کے قیدی بھی شاید سو گئے تھے۔ ان کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آج انہیں بھی کھانا نہیں دیا گیا تھا اور انہوں نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اس قسم کی صورتحال کے عادی ہو چکے تھے۔

سردی اور بھوک سے ثمینہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ مچھر الگ خون چوس رہے تھے لیکن وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔

شاہ پری کو کوٹھری سے گئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اب وہ اس جیل سے کبھی رہائی نہیں پا سکے گی۔ یہ پولیس والے دیکھنے ہی میں وحشی لگتے تھے۔ وہ ان کے رحم و کرم پر تھی اور وہ اس کے ساتھ جو کچھ کریں گے' وہ سوچ کر ہی کانپ اٹھی تھی۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی کہ سناٹے میں قدموں کی آواز سن کر کانپ اٹھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک پولیس والا لالٹین ہاتھ میں لیے اس طرف آرہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے لالٹین نیچے رکھ دی اور دروازے کا تالا کھولنے لگا۔ اس نے فارسی زبان میں کچھ کہا بھی تھا لیکن ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ پولیس والے نے دروازہ کھول کر اسے اشارہ کیا..... یہ اشارہ بہرحال اس کی سمجھ میں آگیا اور وہ کوٹھری سے باہر آگئی۔ آوازیں سن کر ساتھ والی کوٹھری کے دونوں قیدی بھی جاگ گئے تھے۔ ایک قیدی نے کچھ کہا اور پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کے قہقہوں نے ثمینہ کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ پولیس والا اسے دفتر میں لے آیا جہاں چوکی کا انچارج عمر خان بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔ عمر خان چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا' پھر بچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس نے یہ مختصر سا جملہ انگریزی میں کہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

"شاہ پری کہاں ہے؟" ثمینہ نے بھی انگریزی ہی میں پوچھا۔ اس نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہنے ہی کو ترجیح دی تھی۔

"شاہ پری۔" عمر خان نے رک کر جواب دیا۔ "وہ اپنے باپ کے ساتھ جا چکی ہے۔ ملا نصیر الدین علاقے کا معزز آدمی ہے۔ وہ اپنی ضمانت پر اپنی بیٹی کو لے گیا ہے۔ اگر وہ تمہیں جانتا ہوتا تو شاید تمہاری ضمانت بھی دے دیتا۔"

ثمینہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "اس کے ساتھ گل رحمان اور ملک فیروز خان بھی ہوں گے۔ وہ تو مجھے جانتے ہیں۔ وہ میری ضمانت دے سکتے تھے۔" وہ بولی۔

"ملا نصیر الدین کے ساتھ صرف اس کا بیٹا تھا۔" عمر خان نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "گل رحمان یا ملک فیروز خان کو ہم نہیں جانتے۔ اگر جانتے بھی ہوتے تو شاید تمہیں نہ چھوڑتے۔ تم سے ابھی تفتیش کرنی ہے۔"

"قتل میں نے یا شاہ پری نے نہیں کیا تھا۔" ثمینہ بولی "شاہ پری کا یہ بیان درست ہے کہ مقتول کا اپنے دوستوں سے جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم دونوں بے قصور ہیں۔"

"ہم نے شاہ پری کے بیان پر یقین کر لیا ہے اور اسی لیے اسے چھوڑ بھی دیا ہے۔" عمر خان نے کہا۔

"اور مجھے؟" ثمینہ نے کہا۔ "مجھے کیوں قید میں رکھا گیا ہے؟"

"تم سے ایک دوسرے معاملے میں تفتیش کرنی ہے۔" عمر خان بولا۔ "تم کہتی ہو کہ تم

پاکستانی اخبار نویس ہو لیکن تمہارے پاس نہ تو پاسپورٹ ہے اور نہ ہی دوسرے کاغذات اور تمہارے جسم پر یہ روسی فوج کی وردی۔ اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ روسی فوج یہاں سے جا چکی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے ایجنٹ اب بھی یہاں موجود ہیں۔ کوئی غیر ملکی کے روپ میں اور کچھ ہمارے ہی آدمی ان کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں۔ تم سے یہ معلوم کرنا ہے کہ افغانستان میں کب سے ہو اور کیا کیا اطلاعات اپنے آقاؤں کو بھیج چکی ہو؟"

ثمینہ کانپ اٹھی۔ اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک نیا شوشہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر روسی فوجی وردی اس کے لیے پھانسی کا پھندہ بھی بن سکتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پاکستانی اخبار نویس بتایا تھا۔ اگر یہ لوگ اس کے بارے میں تحقیقات کریں گے تو یہ پول بھی کھل جائے گا کہ اس کا پاکستانی پریس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ غیر قانونی طور پر افغانستان میں داخل ہوئی تھی اور پھر جاسوسی کے الزام سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ لوگ اس سے معلوم کرنا چاہیں گے کہ وہ کب سے یہاں ہے اور کیا کیا اطلاعات اپنے آقاؤں کو بھجوا چکی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے وہ لوگ کیا طریقے اختیار کریں گے' اس کا بھی اسے اندازہ تھا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں۔" بالآخر ثمینہ نے جواب دیا۔ "پاکستانی اخبار نویس ہوں۔ چند روز پہلے تمہارے ہی ملک کے چند لٹیروں نے ہمیں لوٹ لیا تھا۔ وہ میرا بیگ چھین کر لے گئے۔ اس میں پاسپورٹ بھی تھا اور دوسرے کاغذات بھی۔ اگر بعض نیک لوگ ہمیں نہ مل جاتے تو ہم پہاڑوں میں بھٹک کر ختم ہو جاتے۔"

"اور یہ روسی وردی؟" عمر خان نے اسے گھورا۔

"افغانستان میں نہ روسی اسلحہ کی کمی ہے' نہ وردیوں کی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ یہ روسی فوجی وردی میں نے ایک بستی میں ایک افغان باشندے سے خریدی تھی۔ یہاں بہت سے افغان باشندے روسی فوجی وردیاں پہنے پھر رہے ہیں۔ کیا وہ سب روس کے ایجنٹ ہیں؟"

"میں دوسروں کی نہیں' تمہاری بات کر رہا ہوں۔" عمر خان کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "اگر تم روس کی نہیں تو پاکستان کی ایجنٹ ضرور ہو کیونکہ پاکستان اپنی پسند کی پارٹی کو برسراقتدار لانے کے لیے افغانستان میں خانہ جنگی کرا رہا ہے۔"

"پاکستان پر یہ الزام غلط ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "پاکستان ایک امن پسند ملک ہے۔ وہ نہ تو اپنے اندرونی معاملات میں کسی کو مداخلت کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے ملک

کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ اقتدار کی رسہ کشی افغانستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ اگر مختلف پارٹیاں اقتدار حاصل کرنے کے لیے عوام کو ایک دوسرے سے لڑا رہی ہیں تو اس میں پاکستان یا کسی اور ملک کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"میں نے سیاست پر لیکچر سننے کے لیے تمہیں یہاں نہیں بلوایا۔" عمر خان نے کہا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس یہ روسی فوجی وردی کہاں سے آئی؟ اور تم کس کے لیے کام کر رہی ہو؟ پاکستان کے لیے یا روس کے لیے؟"

"میں کسی کے لیے کام نہیں کر رہی ہوں۔ میں اخبار نویس ہوں۔ تم چاہو تو اپنی متعلقہ وزارت سے میرے بارے میں تصدیق کر سکتے ہو۔" ثمینہ نے کہا۔

"تصدیق بھی کر لی جائے گی لیکن اس میں وقت لگے گا۔" عمر خان نے جواب دیا۔ "تم جانتی ہو اس چھوٹے سے گاؤں میں بجلی اور ٹیلی فون نہیں ہے۔ کابل یہاں سے بہت دور ہے۔ تصدیق کرنے کے لیے کسی آدمی کو کابل بھیجنا پڑے گا اور ہمارے پاس اتنے فنڈز نہیں ہیں۔ ہم ایک آدمی کے کابل آنے جانے کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اور پھر مجھے اتنی لمبی چوڑی تصدیق کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں خود ہی تم سے معلوم کر لوں گا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔"

"یہ ظلم ہے..... سراسر ناانصافی ہے۔" ثمینہ نے احتجاج کیا۔ "مجھے صبح سے یہاں بھوکا پیاسا رکھا گیا ہے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ یہ سلوک....."

"اوہ!" عمر خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا تمہیں کھانا نہیں دیا گیا؟"

"صبح کوٹھری میں بند کرنے کے بعد اب تک کسی نے پوچھا تک نہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔" عمر خان بولا۔ "بہرحال اس وقت تو تمہارے کھانے کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ یہ چھوٹی سی بستی ہے۔ یہاں کے لوگ جلد سو جانے کے عادی ہیں۔ اس وقت تو پوری بستی پر سناٹا طاری ہے۔ سب لوگ سو چکے ہیں۔ تمہیں صبح تک بھوک برداشت کرنی پڑے گی۔"

"مجھے جس کوٹھری میں رکھا گیا ہے۔ وہ بھی انتہائی غلیظ ہے۔ غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ میں اندر بیٹھ بھی نہیں سکتی۔ دروازے کے پاس بیٹھے رہنے سے سردی بھی لگ رہی ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"اس کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" عمر خان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں اپنے نائب سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں میرے کمرے میں پہنچا دے گا۔ آرام دہ بستر پر سکون سے سو سکو گی۔"

ثمینہ کانپ اٹھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رات کو اس وقت اسے کوٹھری سے نکال کر یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ مرد دنیا کے کسی بھی خطے کا ہو' فطرت ایک ہی ہوتی ہے۔

عورت کو دیکھ کر مرد کی رال ٹپکنے لگتی ہے اور جب عورت جوان اور حسین و جمیل بھی ہو تو اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔

"نہیں' میں اسی کوٹھری میں ٹھیک ہوں۔ جیسے تیسے رات گزار لوں گی۔" ثمینہ نے جلدی سے کہا۔

"ہم قیدیوں کی مرضی پر نہیں چلتے۔ قیدیوں کو ہماری مرضی پر چلنا پڑتا ہے۔" عمر خان نے کہا اور دروازے کی طرف رخ کرکے کسی کو پکارا۔ ایک پولیس والا فوراً ہی اندر آگیا۔ عمر خان نے فارسی میں اس سے کچھ کہا۔ وہ چند لمحے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا' پھر آگے بڑھ کر ثمینہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔ ثمینہ نے مزاحمت نہیں کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہاں مزاحمت کرنا بیکار ہوگا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ عمر خان کے کمرے میں پہنچ کر اس سے نمٹنے کی کوشش کرے گی۔

ثمینہ نے باتوں ہی باتوں میں عمر خان سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس پولیس چوکی کا عملہ صرف چار افراد پر مشتمل ہے۔ ایک عمر خان جو انچارج تھا اور تین اس کے ماتحت۔ اگر اسے عمر خان کو قابو میں کرنے کا موقع مل جائے تو وہ یہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ عمر خان نے اسے اپنے کمرے میں رات بسر کرنے کی پیشکش کیوں کی تھی۔ یہ پیشکش انسانی ہمدردی کی بنیاد پر نہیں کی گئی تھی۔ وہ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔

عمر خان کا کمرہ بھی اسی مکان کے آنگن میں بائیں طرف واقع تھا۔ ایک کمرہ اس کے مخالف سمت دفتر کے دوسری طرف تھا جو اس کے محافظوں کے لیے مخصوص تھا۔

عمر خان کا کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ فرش کچا ہی تھا۔ اس پر کھجور کی چٹائی اور اس کے اوپر دری بچھی ہوئی تھی۔ دو دیواروں کے ساتھ کھونٹیوں پر کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان ہی کپڑوں میں پولیس کی وردی بھی نظر آرہی تھی۔

ایک دیوار کے ساتھ دری پر بستر لگا ہوا تھا جس پر دو میلے سے کمبل پڑے ہوئے تھے۔ تکیہ اس قدر چکنا اور گندا تھا کہ دیکھ کر ہی گھن آرہی تھی۔

دروازے کے قریب ہی دائیں طرف دیوار کے ساتھ پانی کا ایک مٹکا رکھا ہوا تھا جس پر پلاسٹک کا ایک میلا سا گلاس بھی موجود تھا۔ پولیس والا اسے کمرے میں دھکیل کر واپس چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا لگا دیا تھا۔ ثمینہ چند لمحے دروازے کے قریب کھڑی رہی' پھر اس نے مٹکے کے پاس بیٹھ کر پانی کے دو گلاس پیے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

سامنے دیوار پر ایک گھڑی بھی ٹنگی ہوئی تھی جس کی سوئیاں گیارہ بجکر پانچ منٹ کا وقت بتا رہی تھی۔ وہ گھڑی کی سوئیوں پر نظریں جمائے ٹک ٹک کی آواز سنتی رہی۔

عمر خان تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کمرے میں آیا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کرکے کنڈا لگا دیا اور معنی خیز نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ثمینہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کچھ دیر پہلے وہ اونگھنے لگی تھی لیکن عمر خان کو دیکھ کر اس کی نیند غائب ہو گئی۔

عمر خان وردی میں تھا۔ وہ چند لمحے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا' پھر اس دیوار کے قریب آگیا جہاں کھونٹی پر کپڑے ٹنگے ہوئے تھے اور پھر وہ وہیں کھڑے کھڑے کپڑے بدلنے لگا۔ ثمینہ نے گردن جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

عمر خان کپڑے بدلنے کے بعد ثمینہ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ثمینہ کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے بہرحال یہ طے کر لیا تھا کہ عمر خان کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

عمر خان کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا' پھر ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"یہاں نہیں' وہاں بستر پر لیٹ جاؤ۔ نہیں.....میں یہیں ٹھیک ہوں۔" ثمینہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میری بات غور سے سنو لڑکی۔" عمر خان کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

"میں اگر چاہوں تو تمہیں گولی مار کر لاش باہر پھنکوا دوں' کوئی مجھے پوچھنے والا نہیں ہوگا لیکن اگر تم شرافت کا مظاہرہ کرو تو تمہارے لیے کچھ آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اگر مزاحمت کرو گی بھی تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ اس لیے....."

"تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔" ثمینہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ عمر خان بھی اٹھ گیا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا' پھر شکاری کتے کی طرح ثمینہ پر جھپٹا۔ ثمینہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ عمر خان سے بچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بالآخر عمر خان کی گرفت میں آہی گئی۔

ثمینہ نے اپنی جدوجہد جاری رکھی لیکن عمر خان اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔

عمر خان اسے مکمل طور پر زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دفعتاً" فائر کی ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ثمینہ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ثمینہ نے اس کی کلائی پر دانتوں سے کاٹ لیا۔ عمر خان بلبلا اٹھا۔ اسی لمحہ ایک اور فائر ہوا۔ عمر خان ثمینہ کو چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ وہ دروازہ کھول کر چیخ چیخ کر اپنے ماتحتوں سے پوچھ رہا تھا کہ گولیاں کون چلا رہا ہے۔

ثمینہ کی نظریں دیوار پر ٹنگی ہوئی عمر خان کی وردی پر جم گئیں- وردی کے ساتھ بیلٹ بھی تھا جس کے ہولسٹر سے ریوالور کا دستہ جھانک رہا تھا- وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے دیوار کے قریب پہنچ گئی اور بڑی پھرتی سے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا-

عمر خان کو اس کا پتہ نہیں چل سکا- وہ دروازے سے منہ باہر نکالے چیخ رہا تھا-

"دلبر جان! کیا ہوا- یہ گولیاں کون چلا رہا ہے؟"

لیکن جواب میں صرف فائرنگ کی آوازیں ہی سنائی دی تھیں- عمر خان تیزی سے اندر کی طرف مڑ گیا- "خانہ خراب لوگ کون ہے- پولیس چوکی پر حملہ کرتا....." وہ مڑتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا لیکن ثمینہ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کی آواز بند ہو گئی- پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا- "اوہ..... تم....." وہ کہتے ہوئے آگے بڑھا لیکن پھر اس کے قدم رک گئے- ثمینہ نے ریوالور اس کے سینے کی طرف تان لیا تھا-

"اگر تم نے ایک بھی قدم آگے بڑھایا تو گولی چلا دوں گی- کھوپڑی اڑا دوں گی تمہاری-" ثمینہ چیخی-

"میرا بات سنو لڑکی!" عمر خان اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا-

"پاگل لوگ پتہ نہیں کون ہے جنہوں نے پولیس چوکی پر حملہ کیا ہے- اگر وہ لوگ ادھر آگیا تو ہم دونوں مارا جائے گا- یہ ریوالور مجھے دو- ہم دونوں یہاں سے نکل چلتے ہیں- میں تمہاری حفاظت کروں گا-"

"تم جس طرح میری حفاظت کرو گے' میں جانتی ہوں-" ثمینہ نے جواب دیا- "تمہارا تو مر جانا ہی بہتر ہے- میں یہاں سے اکیلی نکلوں گی اور اپنی حفاظت بھی میں خود ہی کروں گی-"

اس سے پہلے کہ عمر خان کوئی جواب دیتا باہر سے فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئیں- لگتا تھا سات آٹھ رائفلیں بیک وقت گولیاں اگل رہی ہوں- فائرنگ کے اس شور میں ایک اور آواز سن کر ثمینہ اچھل پڑی- کوئی چیخ کر کہہ رہا تھا-

"وہ جیل میں نہیں ہے- میں نے دو قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے لیکن ثمینہ یہاں نہیں ہے-"

ثمینہ کو فائرنگ کے شور میں یہ آواز پہچاننے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی- وہ شارق کی آواز تھی جسے سن کر ثمینہ چونک گئی تھی- اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چوکی پر حملہ کرنے والے شارق اور اس کے ساتھی تھے-

"اس طرف-" ثمینہ دیوار سے اشارہ کرتے ہوئے غرائی- "اس طرف آجاؤ- جلدی کرو-"

عمر خان کے چہرے پر الجھن کے ساتھ اب خوف کے ہلکے سے تاثرات بھی ابھر آئے تھے-

وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا- ثمینہ نے ہاتھ کو ذرا سی حرکت دے کر ریوالور کا ٹریگر دبا دیا- گولی عمر خان کے سر کے اوپر سے گزر گئی-

"اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی اڑا دے گی-" ثمینہ غرائی..... "اس طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ- جلدی کرو-"

عمر خان کے چہرے پر خوف اب نمایاں ہو گیا تھا- حکم کی تعمیل کے سوا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا- وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دوسری دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا- ثمینہ تیز تیز قدم اٹھاتی دروازے کے قریب آگئی- چوکی کے دفتر والی سمت سے فائرنگ اور شور کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں- "شارق.....!" ثمینہ چیخی- "میں یہاں ہوں-"

ثمینہ نے اگرچہ عمر خان کو ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا لیکن اس وقت اس کا رخ دروازے کی طرف تھا- عمر خان کی طرف سے ایک لمحہ کو اس کی توجہ ہٹی تھی اور عمر خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی- ثمینہ کو بروقت پتہ چل گیا- اس نے بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹنے کے ساتھ ہی ریوالور کا ٹریگر دبا دیا تھا- کمرے میں دھماکہ سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی عمر خان کی چیخ بھی سنائی دی تھی- گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر گیا تھا-

"شارق.....میں یہاں ہوں-" ثمینہ دروازے کی طرف رخ کر کے چیخی اور پھر مڑ کر عمر خان کی طرف دیکھنے لگی-

عمر خان سیدھا ہو گیا تھا- اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا جہاں سے خون بہہ رہا تھا- اس کا ہاتھ بھی خون سے تر ہو گیا تھا- اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے اور آنکھیں جیسے شعلہ اگل رہی تھیں- وہ چند سیکنڈ خونخوار نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا' پھر لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا-

عمر خان کو آگے بڑھتے دیکھ کر ثمینہ کے چہرے پر خوف سا پھیل گیا- اس نے ریوالور والا ہاتھ آگے نکال کر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ٹریگر دبا دیا- دونوں گولیاں عمر خان کے سینے میں لگیں- اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا لیکن وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھتا رہا- ثمینہ کا چہرہ دھواں ہو گیا اور پھر وہ ریوالور کا ٹریگر دباتی چلی گئی- عمر خان کا جسم چھلنی ہو گیا تھا- کئی جگہوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں- وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑایا اور پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گیا-

"ثمینہ! کہاں ہو تم؟"

شارق کی آواز ثمینہ کی سماعت سے ٹکرائی- وہ سکتہ کی سی کیفیت میں کھڑی عمر خان کو دیکھ

رہی تھی۔ شارق کی آواز سن کر وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے چیخ کر شارق کو بتایا کہ وہ اس کمرے میں موجود ہے۔ پھر اس نے ریوالور عمر خان کی لاش کے قریب پھینک دیا جو خالی ہو چکا تھا اور دوڑ کر کھونٹی پر سے عمر خان کی پولیس یونیفارم کی قمیض پہننے لگی۔ وہ قمیض کے بٹن لگا رہی تھی کہ شارق دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔" شارق اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جلدی کرو' نکلو یہاں سے۔ اوہ....." وہ عمر خان کی لاش دیکھ کر رک گیا۔ "یہ کون ہے؟"

"اس چوکی کا انچارج عمر خان۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "یہ مجھے کھلونا سمجھ کر اپنے کمرے میں لے آیا تھا لیکن....."

"یہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔" شارق نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ "اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ اس چوکی کے دو آدمی تو ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور پتہ نہیں کتنے باقی ہیں۔ اگر بستی کے لوگ بھی آگئے تو مشکل ہو جائے گی۔"

"اس چوکی میں صرف چار آدمی تھے۔ دو تم نے مار دیئے' ایک میں نے۔ صرف ایک باقی رہ گیا ہے' اسے بھی ختم کر دو۔" ثمینہ نے کہا۔

"ان دونوں کو میں نے نہیں مارا۔ وہ ملا نصیر الدین کے بیٹے کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ جلدی نکلو یہاں سے۔" شارق نے کہا۔

وہ کمرے سے نکل کر دوڑتے ہوئے واپس آگئے۔ اب فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ تین چار آدمی دوڑتے ہوئے دفتر کے سامنے آگئے۔ شارق نے چیخ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"شارق!" گل رحمان کی آواز سنائی دی۔ "ثمینہ کا پتہ نہیں چل رہا' اس چوکی میں صرف تین آدمی تھے جو مارے جا چکے ہیں۔ ثمینہ اور چوکی کا انچارج غائب ہیں۔"

"ثمینہ میرے ساتھ ہے۔" شارق نے چیخ کر بتایا "چوکی کا انچارج بھی مارا جا چکا ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں بچا۔ نکل چلو یہاں سے۔"

"چلو.....بھاگو۔" گل رحمان چیخا۔ بستی کے لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ "اگر وہ لوگ آگئے تو ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

وہ لوگ پولیس چوکی سے نکل کر گلی میں آگئے۔ یہاں عمر خان کی جیپ کے پیچھے ایک اور جیپ بھی کھڑی تھی۔ وہ لوگ دوسری جیپ کی طرف دوڑے۔ ملا نصیر الدین کے بیٹے نے رک کر پولیس جیپ کے اگلے ٹائر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ٹائر کے پرخچے اڑ گئے۔

"چلو.....جلدی کرو۔" وہ چیختا ہوا جیپ پر چڑھ گیا۔ شارق اور ثمینہ بھی جیپ کے پچھلے حصہ پر سوار ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ سامنے والی سیٹ پر دو آدمی اور تھے۔ اسٹیئرنگ کے سامنے گل رحمان بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر ملا نصیر الدین کا بیٹا بیٹھا تھا۔

جیپ ایک جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ ثمینہ نے محسوس کیا تھا کہ بستی کے بعض لوگ اپنے مکانوں کے دروازے کے پیچھے کھڑے گلی میں جھانک رہے تھے۔

جیپ گلیوں میں دوڑتی ہوئی بستی سے نکل کر سڑک پر آگئی اور تیزی سے براکی کی طرف دوڑنے لگی۔

○

رات کا آخری پہر تھا۔ وہ لوگ براکی سے تقریباً دو میل دور واقع ایک چھوٹی سی بستی کے ایک مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ شاہ پری اور ملا نصیر الدین بھی تھا۔ ملا نصیر الدین کہہ رہا تھا۔

"تم دونوں لڑکیوں کی گمشدگی سے ہم بہت پریشان تھے۔ گمشدگی کا انکشاف دراصل یہاں پہنچ کر ہوا تھا۔ ہم صبح تک تو انتظار کرتے رہے۔ پھر پریشانی ہوئی تو تم لوگوں کی تلاش شروع کر دی گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ تم لوگ راستہ بھٹک گئی ہو۔ تمہاری تلاش میں کچھ آدمی پہاڑوں کی طرف چلے گئے تھے۔ کل شام ہمارا ایک آدمی اس بستی میں پہنچ گیا تھا جہاں سے پولیس نے تم دونوں کو گرفتار کیا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں شام کے بعد دو آدمیوں کو ساتھ لے کر پولیس چوکی پہنچ گیا۔ چوکی کے انچارج عمر خان کا کہنا تھا کہ تم دونوں کو قتل کے الزام میں پکڑا گیا تھا لیکن شاہ پری نے یہ بیان دیا تھا کہ قتل ان سے نہیں ہوا۔ بڑی بحث و تکرار کے بعد عمر خان شاہ پری کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا لیکن وہ تمہیں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تم جاسوس ہو سکتی ہو۔ وہ تم سے تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے بحث کرنا بیکار سمجھا اور شاہ پری کو لے کر آگیا لیکن میں تمہاری طرف سے غافل نہیں تھا۔ تم نے باغ والے مکان میں میری بیٹی کی عزت بچائی تھی۔ میں تمہیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ ہم لوگوں نے آدھی رات کے بعد تمہیں چھڑانے کے لیے پولیس چوکی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا' وہ تمہیں بھی معلوم ہے۔"

"اگر تم لوگ دو چار منٹ لیٹ ہو جاتے تو وہ درندہ میری عزت لوٹ چکا ہوتا۔" ثمینہ نے کہا۔ "بہرحال' میں آپ لوگوں کی شکرگزار ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے اس درندے سے بچا

لیا۔"

"اس میں شکر گزار ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔" ملا نصیر الدین نے جواب دیا۔ "یہ تو ہمارا فرض تھا۔ اگر ہم بروقت تمہاری مدد کو نہ پہنچتے تو ہمیں افسوس ہوتا۔"

ثمینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی شاہ پری اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آگئی اور ثمینہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ثمینہ دوسرے کمرے میں پہنچی تو قالین پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا لگا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

"مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے تمہیں کھانا نہیں دیا ہوگا۔ تم بھوکی ہو۔ میں نے جلدی میں تمہارے لیے یہ کھانا تیار کروا لیا ہے۔ تم آرام سے بیٹھ کر کھاؤ' میں ان لوگوں کو چائے دے آؤں۔" شاہ پری نے کہا۔

ثمینہ نے دوسرے دروازے میں کھڑی ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھا اور دسترخوان پر بیٹھ گئی۔ خشک تلا ہوا گوشت اور خمیری روٹیاں تھیں۔ وہ دو دن سے بھوکی تھی۔ وہ شاہ پری اور دوسری ادھیڑ عمر عورت کی موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ شاہ پری نے مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ادھیڑ عمر عورت کو اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

تین موٹی موٹی روٹیاں تھیں اور تلا ہوا گوشت بھی اچھی خاصی مقدار میں تھا۔ ثمینہ عام حالات میں اتنا کھانا تین وقت میں بھی نہیں کھا سکتی تھی لیکن اس وقت وہ سارا کھانا چٹ کر گئی۔ اس نے آخری لقمہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ شاہ پری قہوہ لے کر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کے دو گلاس تھے۔ ایک اس کے لیے اور دوسرا اپنے لیے۔ وہ بھی وہیں بیٹھ گئی اور دونوں قہوے کی چسکیاں لینے لگیں۔

"ایک بات بتاؤ ثمینہ بہن۔" شاہ پری قہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

"میں راستہ بھٹک کر ان پہاڑوں میں نکل گئی تھی اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر گر پڑی تھی۔ اگر تم وہاں نہ پہنچ جاتیں تو شاید بے ہوشی ہی میں مرجاتی اور اگر زندہ بچ بھی جاتی تو کوئی انسانی بھیڑیا مجھے چیر پھاڑ دیتا۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر سعد اللہ سے میری عزت اور جان بچائی تھی۔ اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتیں تو جانے میرا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔"

"میں تو ایک بہانہ بن گئی تھی۔ بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "میری صورتحال تو تم سے زیادہ خوفناک تھی۔ عمر خان نے میرے کپڑے تک پھاڑ ڈالے تھے۔

ہن وقت پر تمہارے والد اور دوسرے لوگ پہنچ گئے اور میں بچ گئی۔ بہرحال جو کچھ ہوا' اسے ول جاؤ۔" وہ خاموش ہو کر قہوہ کی چسکیاں لینے لگیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "بستی والوں کو پولیس والوں کے قتل کا پتہ چل گیا ہوگا۔ انہوں نے کسی اور جگہ اطلاع دیدی ہوگی اور اگر ہماری تلاش شروع کر دی گئی تو ہم پکڑے جائیں گے۔ بستی کے بہت سے لوگ گواہی دیں گے کہ تم ملا نصیر الدین کی بیٹی ہو اور وہ تمہیں چھڑا کر لے گیا تھا۔"

"پولیس کا بڑا دفتر براکی میں ہے۔" شاہ پری نے بتایا۔ "ملک فرید براکی پہنچ چکا ہے۔ میرے یا نے یہاں واپس آتے ہی ایک آدمی کو ملک فرید کے پاس بھیج دیا تھا۔ اسے صورتحال کا پتہ چل گیا ہوگا۔ ملک فرید بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ معاملہ کو سنبھال لے گا۔ میرا خیال ہے اب تم سو جاؤ' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" شاہ پری نے کہتے ہوئے اس کے سامنے سے خالی گلاس اٹھا یا اور اپنا گلاس بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور قالین پر لیٹ گئی۔

"یہ مکان کس کا ہے؟" ثمینہ نے اس کے قریب ہی لیٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مکان ملک فرید ہی کا ہے۔ گل رحمان ہم سب کو یہاں سے کر آیا تھا۔ اس نے بھی ملک فرید کو یہاں اپنی آمد کی اطلاع بھجوا دی ہے۔ بہرحال تم آرام سے سو جاؤ۔ یہاں ہمیں یا تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ ہم اپنی جان تو دیں گے لیکن اپنے مہمانوں پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اب سو جاؤ۔"

شاہ پری یہ کہتے ہوئے ثمینہ سے لپٹ گئی۔ ثمینہ نے قریب پڑا ہوا کمبل اٹھا کر اوپر ڈال لیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔

ثمینہ کی آنکھ صبح تقریباً دس بجے کھلی تھی۔ شاہ پری اس کے پہلو میں موجود نہیں تھی۔ وہ کمبل لپیٹے لیٹی رہی۔ کچھ دیر بعد شاہ پری کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"تم تو خوب سوئیں۔" شاہ پری نے کہا۔

"ہاں.... کل رات بھر جاگتی رہی ہوں۔" ثمینہ نے کمبل ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم منہ ہاتھ دھو لو تو میں تمہارے لیے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔ غسل خانہ اس طرف ہے۔" شاہ پری نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ثمینہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک لمحہ کو ٹھٹک سی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ باتھ روم کا دروازہ ہوگا لیکن دوسری طرف ایک وسیع صحن تھا اور ایک لمبا تڑنگا آدمی ایک طرف بنے ہوئے کنویں سے پانی نکال رہا تھا۔ اس نے بھی ثمینہ کو دیکھ لیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ نظریں جھکا لی

تھیں- وہ کنویں سے نکالا ہوا پانی بالٹی میں بھر کر مکان سے باہر چلا گیا-

ثمینہ کمرے سے باہر آگئی- صحن کے دائیں طرف باتھ روم تھا- تقریباً دس منٹ بعد وہ باتھ روم سے نکلی- جب وہ کمرے میں پہنچی تو شاہ پری دسترخوان پر ناشتہ لگا رہی تھی- تلا ہوا گوشت، خمیری روٹی اور چائے- شاہ پری بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی-

ناشتہ کے بعد ثمینہ اس کمرے میں آگئی جہاں شارق اور نولکھا وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے- گل رحمان کسی مسئلے پر شارق سے باتیں کر رہا تھا- نولکھا الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا- اس کے چہرے پر اکتاہٹ اور بیزاری ٹپک رہی تھی- کئی روز کی اس بھاگ دوڑ میں اس کی صحت بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی- پہلے وہ بات بات پر قہقہے لگایا کرتا تھا، ہنسا کرتا تھا لیکن اب زیادہ تر خاموش رہنے لگا تھا-

"آؤ ثمینہ بی بی-" نولکھا اسے دیکھتے ہی بولا- "آؤ میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ-"

"کیا بات ہے نولکھا بھائی- بہت اداس ہو رہے ہو؟" ثمینہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی-

"سمجھ میں نہیں آتا، یہ سب کیا ہو رہا ہے-" نولکھا گہرا سانس لیتے ہوئے بولا- "مجھے تو اس بھاگ دوڑ کا کوئی مقصد بھی سمجھ میں نہیں آتا-"

"بھاگ دوڑ تو ہو رہی ہے نا-" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا- "تمہیں تو لطف اندوز ہونا چاہیے-"

"اس بھاگ دوڑ کا کوئی مقصد ہوتا تو مزہ بھی آتا-" نولکھا نے منہ بنا کر جواب دیا- "بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہم بلامقصد ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگے پھر رہے ہیں- ہمارا اس میں کیا فائدہ- ہم تو الٹا دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں-"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو-" ثمینہ نے کہا- "میں تو ابھی سو کر اٹھی ہوں- یہاں کی صورتحال کیا ہے- کیا پروگرام بنایا ہے ان لوگوں نے؟"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں-" نولکھا نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا- "یہ دونوں گھنٹے بھر سے باتیں کر رہے ہیں- ان سے پوچھ لو کیا پروگرام ہے-" اس نے شارق اور گل رحمان کی طرف اشارہ کیا-

ثمینہ مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی- نجیب اللہ اور بازت خان ایک طرف بیٹھے پشتو میں آپس میں باتیں کر رہے تھے- ملا نصیر الدین کا بیٹا ایک طرف پڑا سو رہا تھا- خود ملا نصیر الدین موجود نہیں تھا- امان اللہ بھی کمرے میں نظر نہیں آرہا تھا- ثمینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر شارق اور گل رحمان کے قریب آگئی-

"کس بات پر بحث ہو رہی ہے؟ پروگرام کیا ہے اب؟" اس نے ان دونوں کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے پوچھا-

"ہم یہی بات کر رہے تھے ثمینہ بی بی-" گل رحمان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا-

"ملا نصیر الدین اور امان اللہ براکی گئے ہوئے ہیں- ملک فرید براکی میں موجود ہے- ان دونوں کے واپس آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ کیا پروگرام ہے-"

"میرا خیال ہے نولکھا ٹھیک ہی کہتا ہے-" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "ہم اپنے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور ہماری بھاگ دوڑ کا کوئی مقصد نہیں رہا-"

"تم غلط سوچ رہی ہو ثمینہ بی بی-" گل رحمان نے کہا- "ہم اپنے راستے پر ہیں اور مقصد سے بھی نہیں ہٹے- دراصل حالات ہی کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے ہیں کہ وقتی طور پر اصل کام سے ہماری توجہ ہٹ گئی ہے- حالات جیسے ہی ٹھیک ہوں گے، ہم اپنے کام پر توجہ دیں گے- بہرحال امان اللہ اور ملا نصیر الدین کے واپس آنے کے بعد ہی صحیح صورتحال کا علم ہو سکے گا-"

"یہ لوگ کب واپس آئیں گے؟" ثمینہ نے پوچھا-

"وہ لوگ صبح سات بجے یہاں سے گئے تھے- اب تک تو انہیں واپس آجانا چاہیے-" گل رحمان نے جواب دیا-

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ امان اللہ اور ملا نصیر الدین بھی آگئے-

"ہاں کیا صورتحال ہے؟ ملک فرید سے ملاقات ہوئی؟" گل رحمان نے ملا نصیر الدین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا-

"ہاں-" ملا نصیر الدین نے سر ہلایا- "ملک فرید نے کہا ہے کہ ہم شام سے پہلے براکی پہنچ جائیں- وہاں پہنچنے کے بعد ہی پروگرام کو حتمی شکل دی جائے گی-"

"چلو.....یہ مسئلہ تو حل ہوا-" گل رحمان بولا-

امان اللہ اور ملا نصیر الدین کو وہاں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس بستی کا ایک آدمی اندر داخل ہوا- اس نے امان اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے فارسی زبان میں کچھ کہا- امان اللہ، گل رحمان کی طرف دیکھنے لگا- گل رحمان کے چہرے کے تاثرات ایک لمحہ کو بدل گئے تھے-

"کیا ہوا.....کیا بات ہے؟" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا-

"براکی کا پولیس کمانڈر آیا ہے- تم لوگ بیٹھو، میں دیکھتا ہوں-" گل رحمان کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا-

پولیس کمانڈر کا نام سن کر ثمینہ کا چہرہ دھواں ہو گیا- اس علاقے کا پولیس ہیڈ کوارٹر براکی میں

تھا اور اس بستی کی چوکی میں پولیس والوں کے قتل کی خبر صبح ہونے سے پہلے ہی ہیڈ کوارٹر پہنچ چکی ہوگی اور ہیڈ کوارٹر کی پولیس نے انہیں تلاش کر لینے میں بڑی عجلت دکھائی تھی۔

"شارق!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "انہوں نے بڑی جلدی ہمیں تلاش کر لیا۔ پولیس کمانڈر خود یہاں آیا ہے۔ اس سے تم صورتحال کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" شارق نے کہا۔ "یہ ملک فرید کا علاقہ ہے اور مکان بھی اسی کی ملکیت ہے۔ گل رحمان نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں ملک فرید کا بڑا دبدبہ ہے۔ پولیس والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم ملک فرید کے مہمان ہیں۔ پولیس ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"لیکن یہ بھی تو سنا تھا کہ اس علاقے کے موجودہ حکمران ان دنوں ملک فرید سے کچھ ناراض ہیں۔ ہو سکتا ہے اب ملک فرید کی اتنی قدر نہ رہی ہو۔" ثمینہ بولی۔

"سیاست میں اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "پولیس والے یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک سیاست دان اگر آج زیرعتاب ہے تو کل ان پر مسلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں کہ کسی کو ان سے کوئی شکایت نہ ہونے پائے۔ اس بات کا اندازہ تم اس سے بھی لگا سکتی ہو کہ پولیس کمانڈر خود آیا ہے۔ اگر ہمیں گرفتار کرنا مقصود ہوتا تو کمانڈر کے بجائے عام پولیس والے آتے اور اپنی آمد کا پیغام بھیجنے کے بجائے مکان کو گھیرے میں لے لیتے اور پھر ہم اکیلے نہیں ہیں' اس معاملے میں یہ سب لوگ ملوث ہیں۔"

"تمہاری بات سمجھ میں تو آ رہی ہے۔ خدا کرے تمہارا خیال درست ہو۔" ثمینہ بولی۔

وہ ابھی باتیں کر رہی رہے تھے کہ گل رحمان دو آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ دونوں اونچے لمبے اور پولیس کی وردی میں تھے۔ ان میں ایک پولیس کمانڈر تھا اور دوسرا اس کا نائب۔ انہیں دیکھ کر وہ سب کھڑے ہو گئے۔ گل رحمان نے احمد شاہ کے نام سے کمانڈر کا تعارف کرایا اور پھر دوسروں کا بھی تعارف کرانے لگا۔ کمانڈر اور اس کا نائب ان کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئے۔

"کمانڈر احمد شاہ چوکی والے واقعے کی تحقیق کرنے آئے ہیں۔ یہ تم سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔" گل رحمان نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ بات انگریزی میں کہی تھی تاکہ ثمینہ کے ساتھ احمد شاہ بھی سمجھ سکے۔

"یہ کیا جاننا چاہتا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' اس کی تفصیل بتا دو۔" گل رحمان نے کہا۔

ثمینہ چند لمحے خاموش رہی' پھر اس نے باغ والے مکان سے بات شروع کی۔ اس نے یہی

کہانی سنائی تھی کہ بڑھیا کا بیٹا رات کو اپنے دو دوستوں کے ساتھ کمرہ میں گھس آیا تھا اور "پہلے میں" کی بات پر ان میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلیں۔ بعد میں پولیس نے انہیں پکڑ لیا۔ اس شام ملا نصیرالدین تو اپنی بیٹی کو پولیس چوکی سے لے آیا لیکن چوکی کے انچارج عمر خان نے اسے دیگر الزامات کے تحت روک لیا اور پھر رات کو وہ اسے جیل کی کوٹھری سے نکال کر اپنے کمرے میں لے آیا اور اس کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی۔ اسی دوران کچھ لوگوں نے چوکی پر حملہ کر دیا۔ وہ غالباً ان دو قیدیوں کے ساتھی تھے جو پہلے ہی جیل میں بند تھے۔ وہ لوگ قتل و غارت کر کے اپنے آدمیوں کو چھڑا کر لے گئے۔ وہ خوفزدہ ہو کر پولیس چوکی سے بھاگ نکلی۔ سڑک پر پہنچی ہی تھی کہ گل رحمان وغیرہ مل گئے۔ وہ اس کی رہائی کے سلسلے میں پولیس چوکی کے انچارج سے بات کرنے آ رہے تھے۔ صورتحال معلوم ہونے کے بعد وہ لوگ اسے ساتھ لے کر واپس آ گئے.....

گل رحمان اور ملا نصیرالدین تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ثمینہ نے ایک بڑی خوبصورت کہانی گھڑ ڈالی تھی۔ انہوں نے بھی پولیس کمانڈر کو غالباً کوئی ایسی ہی کہانی سنائی تھی اور اس لیے ان کے چہروں پر قدرے اطمینان تھا۔

پولیس کمانڈر ثمینہ سے مختلف سوالات کرتا رہا اور ثمینہ بڑے پراعتماد لہجے میں جواب دیتی رہی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پولیس کمانڈر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اگر چاہوں تو تفتیش کے لیے تمہیں حراست میں لے سکتا ہوں لیکن ملک فرید کی مہمان ہو۔ اس لیے میں تمہیں حراست میں نہیں لے رہا لیکن تم میری اجازت کے بغیر براکی سے واپس نہیں جاؤ گی۔ شہر کی حدود سے باہر نہیں نکلو گی۔ تفتیش کے لیے ہمیں کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔" کمانڈر احمد شاہ نے کہا۔

"میں اپنے میزبان کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جا سکتی' اس لیے مطمئن رہو۔ جب چاہو مجھے اپنی تحویل میں لے سکتے ہو۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

پولیس کمانڈر واپس چلا گیا اور وہ لوگ اس تازہ ترین صورتحال پر بحث کرنے لگے۔ صورتحال بڑی پیچیدہ تھی۔ انہوں نے طے کر لیا کہ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی وہ لوگ براکی کے لیے روانہ ہو جائیں گے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر یہاں رہے تو مزید کوئی پریشانی پیدا ہو سکتی تھی۔

دوپہر دو بجے انہوں نے کھانا کھایا اور تین بجے جیپ پر سوار ہو کر براکی کے لیے روانہ ہو گئے۔ فاصلہ ہی کتنا تھا' صرف دو میل۔ انہیں شہر پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ملک فرید کا حویلی نما مکان شہر کے دوسری طرف نواح میں واقع تھا۔ وہاں پہنچنے میں چند منٹ اور

لگ گئے لیکن وہاں پہنچ کر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ملک فرید تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کابل جا چکا تھا۔ اس کی واپسی تین دن بعد ہوگی اور وہ اپنے آدمیوں کو یہ پیغام دے گیا تھا کہ شارق اس کی واپسی کا انتظار کرے۔

ثمینہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اگر ملک فرید کا یہ پیغام نہ بھی ملتا تو ان کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

حویلی بہت بڑی تھی۔ دیواریں کسی قلعے کی فصیل کی طرح تھیں۔ درمیان میں بہت وسیع و عریض میدان تھا جہاں کوئی بڑا کارواں پڑاؤ ڈال سکتا تھا۔ لمبے چوڑے لان تھے۔ پھلدار درختوں کی بھی بہتات تھی۔ حویلی کے ایک طرف گھوڑوں کا اصطبل تھا جس میں تقریباً ایک درجن گھوڑے موجود تھے۔ حویلی کی دیکھ بھال کے لیے کئی نوکر چاکر تھے جن میں دو تین خواتین بھی تھیں۔

انہیں مختلف کمرے دے دیئے گئے۔ ثمینہ اور شاہ پری کو ایک الگ کمرہ ملا تھا جس کے فرش پر بہت دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ یہاں انہیں کئی روز بعد نہانے کا موقع ملا۔ ثمینہ باتھ روم دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وسیع باتھ روم میں پانچ فٹ کی بلندی تک ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ شاور تھے' نہانے کا ایک خوبصورت ٹب تھا اور ایک دیوار پر آویزاں شیشے والی ایک کیبنٹ میں طرح طرح کے لوشن' کریم اور سینٹ رکھے ہوئے تھے۔

ثمینہ نہانے کے بعد وہی کپڑے پہن کر باتھ روم سے نکل آئی۔ شاہ پری نہانے کے لیے گئی تو ثمینہ نے ایک خوبصورت الماری کھول لی اور اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس الماری میں زنانہ ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔ ان میں یورپی تراش کے بھی تھے اور قبائلی بھی۔ ثمینہ نے بڑی بے تکلفی سے ایک قبائلی جوڑا نکال کر پہن لیا۔

کچھ دیر بعد شاہ پری باتھ روم سے نکلی تو اسے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"اوہ! معلوم ہوتا ہے کہ چند منٹ میں ہی تم نے اس کمرے کی تلاشی لے لی ہے۔" وہ بولی۔

"تلاشی تو نہیں لی' بس یونہی غیر ارادی طور پر یہ الماری کھول لی تھی۔" ثمینہ نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں زنانہ کپڑے دیکھ کر سوچا ایک جوڑا میں استعمال کر لوں۔ ویسے یہ بات طے ہے کہ یہ کمرہ کسی خاتون کا ہے۔"

"ملک فرید کی بیٹی کا ہوگا۔" شاہ پری نے جواب دیا۔ "اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک بیٹا ہے جو امریکہ میں زیر تعلیم ہے۔ دو بیٹیاں ہیں۔ ایک شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ

پیرس میں رہ رہی ہے۔ دوسری بیٹی سنا ہے کابل یونیورسٹی میں پڑھاتی ہے۔ آج کل تو کابل شہر کا بہت برا حال ہے۔ تمام اسکول کالج بند پڑے ہیں۔ ملک فرید کی بیٹی پتہ نہیں کابل میں ہے یا کہیں اور گئی ہوئی ہے۔ یہ کمرہ اس کا ہوگا۔ وہ اکثر یہاں آتی رہتی ہے۔"

"اگر اس نے یہاں آکر مجھے اپنا لباس پہنے ہوئے دیکھ لیا تو ناراض تو نہ ہوگی؟" ثمینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" شاہ پری نے کندھے اچکا دیئے۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ اس کا ایک جوڑا میں بھی پہن لوں۔ میرے کپڑے بھی بہت گندے ہو رہے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ ان کپڑوں کے استعمال سے ہمیں کون روک سکتا ہے۔" ثمینہ نے کہا اور جھٹ سے الماری کھول لی۔ وہ کتنی دیر تک الماری میں ہینگروں پر ٹنگے ہوئے کپڑوں کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک جوڑا اتارتے ہوئے بولی "لو یہ پہن لو۔ یہ رنگ تم پر خوب جچے گا۔"

"بہت خوب۔" شاہ پری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم تو کپڑوں کا انتخاب اس طرح کر رہی ہو جیسے یہ اپنے ہی باپ کا مال ہو۔"

"اپنے باپ کا مال نہ سہی لیکن یہ کپڑے یہاں بیکار پڑے ہیں۔ ہم انہیں استعمال تو کر سکتے ہیں۔ لو..... پہن لو۔ کوئی تم سے نہیں پوچھے گا۔" ثمینہ نے یہ کہتے ہوئے کپڑے اس کی طرف بڑھا دیئے۔

شاہ پری ایک بار پھر باتھ روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آگئی۔ ثمینہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ جوڑا شاہ پری پر واقعی بہت جچ رہا تھا۔ چند منٹ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سن کر ثمینہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ملک فرید کی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی۔ پہلے تو وہ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"تمہاری مالک ہمیں ان کپڑوں میں دیکھ کر ناراض تو نہیں ہوگی؟" ثمینہ نے ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لالہ رخ آج کل کابل میں ہے' اگر وہ یہاں ہوتی بھی تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا بلکہ وہ خود تم لوگوں کی بہت خدمت کرتی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" ملازمہ نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "سب لوگ باہر لان میں بیٹھے ہیں اور چائے کے لیے آپ دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ دونوں ملازمہ کے ساتھ باہر آگئیں۔ لان میں گارڈن چیئرز بچھی ہوئی تھیں اور ان کے تمام ساتھی وہاں موجود تھے۔ چھوٹی میزوں پر چائے کے برتن آراستہ تھے اور ملک فرید کا ایک ملازم

کپوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ ثمینہ اور شاہ پری کو دیکھ کر شارق چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ثمینہ اس قبائلی لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ دونوں بھی خالی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ ملازم نے ایک ایک کپ ان کے ہاتھوں میں بھی تھما دیا۔ ثمینہ بڑی دلچسپ نظروں سے کپ کو دیکھ رہی تھی۔ بڑا خوبصورت اور قیمتی کپ تھا۔ چائے بھی بڑی خوش ذائقہ تھی۔

چائے کے ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ موضوع گفتگو ملک فرید ہی تھا جو اچانک کابل چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی تین دن بعد ہونے والی تھی اور ظاہر ہے انہیں تین دن انتظار کرنا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے تک وہ لوگ لان ہی میں بیٹھے رہے۔ پھر اپنے اپنے کمروں میں آگئے۔ ثمینہ بھی شارق اور نولکھا کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی تھی۔

"اب یہ تین دن ہمارے لیے قیامت بن کر گزریں گے۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ حاجی نے ہمیں مال لینے کے لیے افغانستان بھیجا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مال سرحد کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوگا لیکن ہم تو افغانستان کے وسط تک آگئے ہیں اور ابھی تک ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ جانا کہاں ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ملک فرید مال ہمارے حوالے کرے گا مگر ملک فرید ہم سے ملاقات کرنے کے بجائے کابل چلا گیا۔"

"ہم تین دن تک اس کی واپسی کا انتظار کریں گے۔" شارق نے کہا۔ "اگر وہ نہ آیا تو تین دن بعد ہم واپس چلے جائیں گے اور اگر وہ آگیا تو اس کے ساتھ یہ طے کیا جائے گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم واپس کیسے جائیں گے۔" نولکھا نے کہا۔

"کوئی بندوبست کیا جائے گا۔" شارق نے جواب دیا۔

ثمینہ رات گیارہ بجے کے قریب اپنے کمرے میں آئی تھی۔ شاہ پری موجود نہیں تھی۔ وہ تقریباً گیارہ بجکر بیس منٹ پر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"میں بابا کے کمرے میں تھی۔" شاہ پری نے آتے ہی کہا۔ بابا نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم لوگ کل صبح سویرے گردیز چلے جائیں گے۔ وہاں میرا ماموں رہتا ہے۔"

"تم لوگ ملک فرید خان کی واپسی کا انتظار نہیں کرو گے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"فرید خان سے ہمارا کوئی کام نہیں ہے۔ اپنی بستی پر حملہ ہونے کے بعد ہم تو گل رحمان کے ساتھ یہاں آگئے تھے۔" شاہ پری نے جواب دیا۔

"تو تم لوگ اپنی بستی میں واپس نہیں جاؤ گے؟" ثمینہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ بستی تباہ ہو چکی ہے۔ بیشتر مکان جلا دیئے گئے ہیں۔ اب وہاں ہمارے لیے کچھ نہیں رہا۔ کچھ عرصہ گردیز میں رہیں گے' اس کے بعد واپسی کا سوچیں گے۔" شاہ پری نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"اوہ۔" ثمینہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "شاہ پری! کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ اپنے ہی اپنوں کو مار رہے ہیں۔ جب غیر لوگ اس ملک پر مسلط تھے تو یہاں کے سب لوگ متحد ہو گئے تھے۔ روس دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت تھی جسے افغانوں نے متحد ہو کر یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اب آپس ہی میں لڑ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے روسی فوجوں نے اس ملک میں اتنی تباہ کاری نہیں پھیلائی ہوگی جتنی یہ خود پھیلا رہے ہیں۔"

"یہ ہماری بدقسمتی ہے۔" شاہ پری نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اقتدار بہت بری چیز ہے۔ افغانستان کی تاریخ خون سے رنگین ہے۔ زیادہ دور جانے کی بات نہیں ہے۔ چند ہی سال پہلے کی بات ہے سردار داؤد نے ظاہر شاہ کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا لیکن وہ بھی زیادہ دنوں تک برسراقتدار نہیں رہ سکا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد حفیظ اللہ امین برسراقتدار آیا۔ پھر ترہ کی' ببرک کارمل اور کئی لوگ آئے اور اپنی گردنیں کٹواتے گئے۔ اس طرح روس کو مداخلت کا موقع ملا۔ افغانوں نے روس کو تو نکال دیا لیکن اب خود آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ ان پہاڑوں کا ہر پتھر بے گناہوں کے لہو سے سرخ ہو چکا ہے لیکن اقتدار کی ہوس نہیں مٹتی۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا۔"

"مجھے تو یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔" ثمینہ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" شاہ پری نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "محفوظ تو کوئی بھی جگہ نہیں ہے لیکن بہرحال ہم گردیز جا رہے ہیں۔ اگر تم لوگوں کا اس طرف آنے کا اتفاق ہو تو ہمارے پاس ضرور آنا۔ گردیز شہر سے چند میل آگے اوماڑئی نام کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ گردیز شہر ہی میں ملک طوطی خان کا پوچھو گے تو لوگ بتا دیں گے۔ یہ میرے ماموں کا نام ہے۔ بہت بڑا ملک ہے وہ..... اگر تم لوگ وہاں آؤ گے تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"ہم لوگ تو پھنسے ہوئے ہیں شاہ پری۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "ملک فرید سے ملاقات کے بعد ہی ہمارا کوئی پروگرام بنے گا۔ بہرحال' اگر گردیز کی طرف آنے کا موقع ملا تو تم لوگوں سے ملاقات ضرور ہوگی۔"

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں' پھر سو گئیں۔

صبح چھ بجے شاہ پری نے ثمینہ کو جگا دیا۔ وہ لوگ جانے کے لیے تیار تھے۔ ثمینہ نے گلے لگا

کر شاہ پری کو رخصت کیا۔ شارق اور گل رحمان وغیرہ بھی ملا نصیرالدین کو رخصت کرنے کے لیے باہر آئے تھے۔ وہ لوگ ایک جیپ پر روانہ ہو گئے تو ثمینہ' شارق کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔

تین دن بڑی بیزاری میں گزرے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ملک فرید تیسرے دن شام تک آجائے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ البتہ رات دس بجے کے قریب انہیں یہ سنسنی خیز اطلاع ملی کہ ملک فرید کو کابل میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اس خبر سے ان میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ثمینہ' شارق اور نولکھا سب سے زیادہ پریشان تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک فرید کی گرفتاری کے بعد وہ لوگ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ پولیس کمانڈر پہلے ہی ان کی تاک میں تھا۔ ملک فرید کی وجہ سے ثمینہ بھی اب تک محفوظ تھی لیکن اب شارق کو یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی یا ممکن ہے رات ہی کو کسی وقت چھاپہ مار کر انہیں بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔

شارق گل رحمان کے کمرے میں آگیا اور دیر تک اسی موضوع پر ان سے باتیں کرتا رہا۔ گل رحمان بھی بے حد پریشان تھا۔ اسے بھی یہ اندیشہ تھا کہ ملک فرید کی گرفتاری کے بعد صرف ثمینہ ہی کو نہیں' انہیں بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔

"شارق بھائی۔" گل رحمان اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "اب ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ خاموشی سے یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" شارق نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرا مطلب ہے کیا ہم پولیس سے بچ کر نکل سکیں گے؟"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔" گل رحمان بولا۔ "میری تجویز یہ ہے کہ میں اور تم تینوں خاموشی سے یہاں سے نکل چلیں۔ کرم آباد یا کابل کا راستہ اختیار کرنا خطرناک ہوگا۔ ہم یہاں سے چرخ کی طرف جائیں گے اور وہاں سے گردیز کی طرف نکل چلیں گے۔ اگر حالات نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم شمالی یا جنوبی وزیرستان پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"کب چلنا ہوگا؟" شارق نے پوچھا۔

"ابھی اور اسی وقت۔" گل رحمان نے جواب دیا۔ "ملک فرید کی ایک لینڈ کروزر موجود ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر حویلی کے پچھلے گیٹ پر پہنچ جاؤ۔ میں گاڑی لے کر اس طرف پہنچ جاؤں گا۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میرے ساتھیوں کو بھی پتہ نہ چلے' اب تم جاؤ۔"

شارق نے اٹھتے ہوئے کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا اور اس کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔ نولکھا دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر حسب معمول بیزاری ہی نظر آرہی تھی۔ ثمینہ بھی گاؤ تکیے پر سر ٹکائے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے شارق کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"کیا ہوا شارق! خیریت؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"گڑبڑ ہو گئی ہے۔" شارق نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "گل رحمان کا کہنا ہے کہ ملک فرید کی گرفتاری کے بعد ہم لوگ بھی محفوظ نہیں رہے۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں چھاپہ مار سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے گردیز کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"گردیز!" ثمینہ چونک سی گئی۔

"ہاں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سے آگے کسی جگہ سرحد عبور کر کے ہم پاکستان کے علاقے شمالی یا جنوبی وزیرستان میں داخل ہو سکتے ہیں۔" شارق نے کہا۔

"کب چلنا ہوگا؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ابھی اور اسی وقت۔" شارق نے جواب دیا۔ "تم اور نولکھا کمرے سے نکل کر حویلی کے پچھلے گیٹ پر پہنچ جاؤ۔ کسی کو پتہ نہ چلے۔ میں بھی آرہا ہوں۔"

نولکھا بھی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اب ایک نیا جھگڑا۔" وہ بڑبڑایا۔ "لگتا ہے ہم زندہ پاکستان نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"پہنچ جائیں گے۔" شارق بولا۔ "اب تم لوگ یہاں سے نکل چلو۔"

ثمینہ اور نولکھا اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور پھر راہداریوں میں گھومتے ہوئے مکان کے پچھلی طرف آگئے۔ اس طرف درختوں کی بہتات تھی اور ایک پختہ سڑک درختوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی حویلی کے پچھلے گیٹ تک چلی گئی تھی۔ وہ دونوں درختوں کے درمیان تاریکی کا سہارا لیتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس گیٹ کے قریب دو گیراج تھے۔ ایک گیراج کے سامنے سفید رنگ کی ایک لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ وہ دونوں گیٹ کے قریب ایک تاریک گوشے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔

اس گیٹ پر کوئی محافظ نہیں تھا۔ صرف اگلے گیٹ پر ایک محافظ کھڑا تھا اور ظاہر ہے وہ اپنا گیٹ چھوڑ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتا تھا۔

وہ دونوں بے حس و حرکت کھڑے تاریکی میں گھورتے رہے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد درختوں میں ایک سایہ سا متحرک دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر وہ لینڈ کروزر کی طرف مڑ گیا۔ ثمینہ نے اس کی چال سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ شارق نہیں تھا۔ وہ شخص لینڈ کروزر کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا' پھر بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

اس کے تقریباً دو منٹ بعد ایک اور سایہ درختوں میں حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ شارق تھا۔ وہ چند گز دور ہی ایک درخت کی اوٹ میں رک گیا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ ثمینہ کو پکار رہا تھا۔

"میں یہاں ہوں شارق۔" ثمینہ نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

شارق درخت کی اوٹ سے نکل کر ان کے قریب پہنچ گیا۔

"گل رحمان نہیں آیا؟" شارق نے سرگوشی میں پوچھا۔

"تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی اس گاڑی میں بیٹھا ہے۔" ثمینہ نے سفید لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔

شارق اس طرف دیکھنے لگا۔ ٹھیک اسی لمحہ گاڑی کی طرف سے گل رحمان کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ گل رحمان دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

"تم لوگ گاڑی میں بیٹھو' میں گیٹ کھول کر آتا ہوں۔" گل رحمان نے سرگوشی میں کہا اور دبے قدموں حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

شارق آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ثمینہ اور نولکھا پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ سیٹوں کے درمیان لکڑی کی ایک پیٹی اور چار پانچ کلاشنکوف رائفلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کٹھڑی میں کچھ اور بھی بندھا ہوا تھا۔

تقریباً دو منٹ بعد گل رحمان گیٹ کھول کر واپس آگیا۔ وہ گاڑی کے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ حویلی کے سامنے والے حصے کی طرف سے پہلے شور اور پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"اوہ!" گل رحمان اچھل پڑا۔ "میرا خیال ہے پولیس نے حویلی پر ریڈ کر دیا ہے۔ ملک فرید کے آدمیوں نے مزاحمت کی ہوگی جس پر فائرنگ شروع ہوگئی۔"

اس نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا اور گیئر میں ڈال کر گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ حویلی کو پچھلی طرف سے بھی گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ پیچھے رکھی ہوئی رائفلیں لوڈ ہیں۔ ایک ایک اٹھا لو اور کسی بھی ہنگامی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو۔" گل رحمان نے کہا۔

ثمینہ کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے ایک رائفل آگے بیٹھے ہوئے شارق کو دیدی اور ایک خود اٹھا لی۔ نولکھا نے بھی ایک رائفل لے لی تھی۔ وہ دونوں سیٹوں سے اتر کر فرش پر بیٹھ گئے اور کسی بھی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

لینڈ کروزر جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلی' دائیں طرف سے پولیس کی ایک جیپ آتی ہوئی نظر آئی۔ شارق نے رائفل کی نال کھڑکی سے نکال کر ٹریگر دبا دیا۔

فضا میں تڑتڑاہٹ کی آواز سی گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ جیپ کا ایک ہیڈ لیمپ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ جیپ کی طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی لیکن لینڈ کروزر اس دوران سامنے والی گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ لوگ پولیس کی گولیوں سے محفوظ ہی رہے۔

گل رحمان نے گاڑی بائیں طرف ایک اور گلی میں موڑ لی۔ ٹھیک اسی وقت پولیس کی جیپ پچھلی گلی میں گھومی تھی۔ ثمینہ اور نولکھا نے بیک وقت فائر کھول دیا لیکن ان کی گولیاں بھی ضائع گئیں۔

گل رحمان بڑی تیزی سے لینڈ کروزر کو مختلف گلیوں میں گھماتا رہا۔ پولیس کی جیپ ان کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔

"گل رحمان۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پولیس جیپ میں وائرلیس ضرور ہوگا۔ اگر انہوں نے دوسری پولیس پارٹیوں کو ہمارے بارے میں اطلاع دیدی تو ہم بڑی آسانی سے گھیرے میں آجائیں گے۔"

"ہاں۔ یہ خطرہ تو ہے۔" گل رحمان نے جواب دیا۔

"اگلا موڑ گھومتے ہی گاڑی کی رفتار کم کرکے مجھے اتار دو۔ پولیس کی جیپ جیسے ہی اس موڑ پر پہنچے گی' میں ان سے نمٹ لوں گا۔ تم کچھ آگے جا کر گاڑی روک لینا۔" شارق نے کہا۔

"خودکشی کا ارادہ کیا ہے؟" گل رحمان نے اسے گھورا۔

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" شارق نے جواب دیا۔ "بہرحال اگلا موڑ گھومتے ہی گاڑی کی رفتار کم کر دینا۔"

دو تین منٹ بعد گل رحمان نے اگلا موڑ گھومتے ہی گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ شارق نے بڑی

پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ گاڑی کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔

شارق نے سنبھل کر ایک لمحہ کو ادھر ادھر دیکھا اور بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور جھانک کر پچھلی گلی میں دیکھنے لگا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد پولیس کی جیپ تیز رفتاری سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کا صرف ایک ہیڈ لیمپ روشن تھا اور یہی اس جیپ کی نشانی تھی۔ دوسرا ہیڈ لیمپ ان کی گولیوں سے ٹوٹ گیا تھا۔

شارق رائفل سنبھال کر تیار ہو گیا۔ اس کی نظریں جیپ کے انجن کی آواز پر لگی ہوئی تھیں اور چند سیکنڈ بعد پولیس کی جیپ موڑ گھوم کر سامنے آئی۔

جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ تین آدمی اور تھے۔ ان میں دو کھڑے تھے جو رائفلیں سنبھالے فائرنگ کر رہے تھے۔ تیسرا پچھلی طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ وہ بھی فائرنگ کے لیے تیار تھا۔

شارق نے رائفل سیدھی کر لی اور پولیس جیپ جیسے ہی اس کے سامنے آئی' اس نے فائر کھول دیا۔ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کھڑے ہوئے پولیس والوں میں سے ایک چیختا ہوا گر گیا۔ دوسری گولی ڈرائیور کی کھوپڑی میں لگی تھی۔ جیپ بے قابو ہو کر تیز رفتاری سے لڑکھڑاتی ہوئی سڑک کے دائیں طرف دیوار سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی چیخوں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

شارق جیپ اور پولیس والوں کا حشر دیکھنے کے لیے وہاں نہیں رکا تھا۔ وہ تیزی سے آگے دوڑتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے کسی گاڑی کی سرخ عقبی بتیاں دکھائی دیں جو تیزی سے اس کی طرف آرہی تھی۔ وہ کوئی گاڑی تھی جو ریورس میں آرہی تھی۔

وہ گاڑی بریکوں کی تیز چڑچڑاہٹ کے ساتھ شارق کے قریب رک گئی۔ وہ لینڈ کروزر تھی۔ شارق نے دوڑ کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اچھل کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ لینڈ کروزر ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی اور بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی۔

"تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔" گل رحمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"لیکن خدانخواستہ اگر وہ تمہیں دیکھ لیتے اور فائر کھول دیتے تو....."

"انہیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جیپ جیسے ہی موڑ گھومی تھی' میں نے فائر کھول دیا تھا۔ ایک گولی ڈرائیور کے سر میں لگی تھی۔ جیپ بے قابو ہو کر دیوار سے ٹکرا گئی۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔ اگر کوئی بچ بھی گیا ہوگا تو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا ہوگا۔"

"لیکن ہم خطرے سے اب بھی باہر نہیں نکلے۔" گل رحمان نے گاڑی کو ایک اور سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ "کچھ ہی دیر میں شہر کو سیل کر دیا جائے گا۔ ہمیں جلد سے جلد شہر کی حدود سے نکل جانا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں بڑی سڑکوں پر آنے کے بجائے چھوٹے راستوں پر رہنا چاہیے تاکہ پولیس کی کسی اور پارٹی کے تصادم سے بچے رہیں۔" شارق بولا۔

"وہی کوشش کر رہا ہوں۔" گل رحمان نے کہتے ہوئے گاڑی ایک اور گلی میں گھما دی۔

اس طرح وہ گلیوں ہی گلیوں میں ہوتے ہوئے شہر کے نواحی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ کچا راستہ تھا۔ اس طرف عام طور پر دن میں بھی ٹریفک کم ہی رہتا تھا اور آدھی رات کے وقت تو کسی قسم کے ٹریفک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے اس راستے پر تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے کافی دور سڑک کے عین وسط میں ایک سرخ روشنی دکھائی دی۔ وہ غالباً سرخ ٹارچ تھی جس سے انہیں رکنے کا اشارہ کیا جا رہا تھا۔

"وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔" گل رحمان بولا۔ "اس راستے کی بھی ناکہ بندی کی گئی ہے۔"

شارق چونک گیا۔ گاڑی کے ہیڈ لیمپ کی روشنی میں اب دو پولیس والے بھی نظر آرہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ انہی میں سے ایک کے ہاتھ میں سرخ روشنی والی ٹارچ بھی تھی جسے حرکت دیتے ہوئے وہ رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک پولیس والا جیپ میں اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"ثمینہ' نولکھا ہوشیار۔" شارق نے پیچھے مڑ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر گل رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جیپ کی رفتار اس طرح آہستہ کر لینا جیسے روک رہے ہو لیکن جیسے ہی فائرنگ شروع ہو' رفتار ایک دم تیز کر دینا۔"

گل رحمان نے گاڑی کی رفتار ہلکی کر دی۔ شارق رائفل سنبھالے گہری نظروں سے آگے دیکھنے لگا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سڑک کے دائیں بائیں کوئی اور پولیس والے تو نہیں تھے لیکن جہاں تک ہیڈ لیمپ کی روشنی کام کر رہی تھی' وہاں تک اور کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف وہی تین تھے جو روشنی کی زد میں تھے۔

قریب پہنچ کر گاڑی کی رفتار مزید کم ہو گئی۔ ایک پولیس والا اب ٹارچ والا ہاتھ اوپر اٹھا کر رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ دوسرا رائفل تانے تیار کھڑا تھا۔ شارق نے رائفل کی نال کھڑکی سے باہر نکال لی اور ٹریگر دبا دیا۔

ویرانہ فائرنگ سے گونج اٹھا۔ سب سے پہلے وہ پولیس والا نشانہ بنا تھا جو رائفل تانے ہوئے تھا۔ ٹارچ والے نے ٹارچ پھینک کر رائفل سنبھالنے کی کوشش کی تو دوسری گولی نے اسے بھی ہلاک کر لیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر جیپ میں بیٹھے ہوئے پولیس والے نے چھلانگ لگا دی اور کھیتوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا اس طرح بھاگنا ہی اس کی موت کا باعث بن گیا۔ اگر وہ جیپ میں بیٹھا رہتا تو شاید بچ جاتا لیکن اس طرح بھاگنے سے وہ نشانے کی زد میں آگیا اور گولیوں نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔

گل رحمان پہلے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ کچے راستے پر گاڑی بری طرح اچھل رہی تھی۔ اس کے الٹ جانے کا اندیشہ بھی تھا لیکن گل رحمان نے اس کی رفتار کم نہیں کی اور اسے تیزی سے دوڑاتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ شہر سے بہت دور نکل گئے۔

کچی سڑک سے وہ پھر پختہ سڑک پر آگئے۔ یہ سڑک چرخ کی طرف چلی گئی تھی۔ اس طرف آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پولیس ان کو چرخ کی طرف تلاش کرتی رہے۔

رات کے پچھلے پہر وہ چرخ کے نواح میں پہنچ گئے۔ دریا کا پل پار کرنے کے بعد گل رحمان نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ وہاں سے ایک اور پتھریلا راستہ تھا جو پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ چند سیکنڈ رکنے کے بعد گل رحمان نے گاڑی اسی سڑک پر ڈال دی۔ پہاڑیوں میں بل کھاتا ہوا یہ پتھریلا راستہ خاصا دشوار گزار تھا لیکن گل رحمان بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔

گاڑی اس پتھریلے راستے پر دوڑتی رہی۔ اب دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ راستہ مسلسل بلندی کی طرف جا رہا تھا۔

"کہیں ہم غلط راستے پر تو نہیں آگئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں؟" شارق نے گل رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ راستہ گردیز کے نواح میں نکلتا ہے لیکن ہم دن کی روشنی میں گردیز میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں کہیں رکنا پڑے گا۔" گل رحمان نے جواب دیا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ سامنے نشیب تھا۔ بنجر اور ویران وادی تھی۔ ایک طرف بہت دور درختوں کا ایک جھنڈ سا نظر آرہا تھا۔ نشیب میں آکر گل رحمان نے گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اس طرف کوئی راستہ نہیں تھا۔ گاڑی پتھروں پر اچھلتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئی۔ گل رحمان نے گاڑی درختوں کے جھنڈ میں ایسی جگہ روکی تھی کہ اسے اوپر سے نہ دیکھا جا سکے۔ درختوں کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا چشمہ بھی تھا۔

"یہ جگہ ہمارے لیے مناسب ہے۔ دن ہم یہیں گزاریں گے اور شام اندھیرا پھیلنے کے بعد گے روانہ ہوں گے۔" گل رحمان انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ "ثمینہ بی بی۔" وہ ثمینہ کی طرف کہتے ہوئے بولا جو گاڑی سے اتر رہی تھی۔ "پوٹلی میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لو۔ ہم سارا دن یہاں رہیں گے۔ کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں موجود ہیں۔"

ثمینہ جواب دینے کے بجائے چشمے پر چلی گئی اور ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھونے لگی۔ دوسرے لوگ بھی چشمے پر آگئے تھے۔ شارق منہ ہاتھ دھو کر اٹھ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ جگہ ان کے لیے واقعی محفوظ تھی۔ درخت بہت گنجان تھے۔ گاڑی بھی چھپ گئی تھی اور انہیں بھی سڑک پر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ثمینہ بھی منہ ہاتھ دھو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے گاڑی کے پچھلے حصے سے وہ پوٹلی نکال لی۔ ایک جگہ چادر بچھا دی اور پوٹلی اس پر رکھ کر کھول دی۔ ایک تیلے میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ اتنا کہ وہ سب لوگ کم سے کم تین وقت کھا سکتے تھے۔ بیس نان تھے جو تندور میں تیار کیے گئے تھے۔ پانچ چھ کیک نما میٹھی روٹیاں بھی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ثمینہ کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ گل رحمان کو صورتحال کا اندازہ ہوگیا تھا اور اس نے پہلے ہی سے تیاری مکمل کر رکھی تھی۔

سالن ٹھنڈا تھا۔ اسے گرم کرنے کے لیے آگ جلانے کی ضرورت تھی اور وہ آگ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اٹھنے والا دھواں یہاں ان کی موجودگی کا راز کھول سکتا تھا۔ اس لیے انہیں ٹھنڈے سالن پر ہی گزارہ کرنا پڑا۔

کھانا کھانے کے بعد ثمینہ نے روٹی سالن سنبھال کر گاڑی میں رکھ دیا۔ وہ لوگ رات بھر جاگتے رہے تھے اور اب نیند پریشان کرنے لگی تھی۔ نوکھا تو ایک درخت کے تنے کے قریب زمین صاف کر کے لیٹ گیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ سو چکا تھا۔ ثمینہ گاڑی میں آکر سیٹ پر لیٹ گئی اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔

○

بقیہ واقعات جاننے کے لئے "دولت کے پجاری" کے پانچویں حصے کا مطالعہ کریں۔